(جلد اوّل)

منتخب عالمی کہانیاں

انتخاب و ترجمہ

محمود احمد قاضی

اکادمی ادبیات پاکستان

منتخب عالمی کہانیاں

منتخب عالمی کہانیاں

انتخاب و ترجمہ

محمود احمد قاضی

دارالترجمہ

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد

جملہ حقوق بحق اکادمی ادبیات پاکستان محفوظ ہیں

اس کتاب کے متن کا کوئی بھی حصہ نقل یا استعمال نہیں کیا جا سکتا، سوائے حوالے کے۔
خلاف ورزی پر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا استحقاق رکھتا ہے۔

نگران اعلیٰ	:	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
منتظم	:	ڈاکٹر راشد حمید
انتخاب و ترجمہ	:	محمود احمد قاضی
تدوین و طباعت	:	اختر رضا سلیمی
ٹائٹل	:	سجاد احمد
تعداد کتب	:	1000
سن اشاعت	:	2017
مطبع	:	NUST پریس، اسلام آباد
قیمت	:	-/350 روپے

ISBN: 978-969-472-319-8

Selected International Stories

Selected/Translated by

Mehmood Ahmed Qazi

Publisher

Translation Bureau

Pakistan Academy of Letters

Pitras Bukhari Road,
Sector H-8/1, Islamabad
Email: ar.saleempal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk
Ph: +92-51-9269714, Fax: +92-51-9269719

فہرست

حرفِ آغاز	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو	7
اپنی بات	محمود احمد قاضی	9
ارجنٹائن		
لوئیسا ویلین زیولا	رات کا گھوڑا	15
امریکہ		
ریمنڈ کارور	موتا	20
گائی ڈیون پورٹ	ہیل سلاسی کی جنازہ گاڑی	26
انڈونیشیا		
آشدائت کارتا مہاراجا	وان بیورن اور دیہاتی لڑکی	33
برطانیہ		
ملاچی واجکر	میوزک باکس	40
پورٹوریکو		
پیڈرو جوآن سیتو	کبوتر لوگ	52
پیراگوئے		
آکسٹوروا بستوس	خاکی پن	58
ترکمانستان		
مراد صر خانوف	مخطوطہ	61

تھائی لینڈ

تھیب مہاپوریا	چپون	73

جاپان

یاسوناری کاوابا تا	ایک بازو	89
یوکیو مشی ما	حب الوطنی	110

جرمنی

وولف گانگ بروشر	رک جاؤ، زرافہ	136

چیکوسلواکیہ

میلان کنڈیرا	پرانے مُردوں کو نئے مُردوں کے لیے جگہ بنانی چاہیے	139

چین

لاؤ سیانگ	آپوان نے سکول جانا چھوڑ دیا	159

روس

لیونا لسنائی	بچے بڑوں سے زیادہ سیانے ہوتے ہیں	167

عراق

فواد تکرلی	تنور	170

فلپائن

این وی ایم گونزیلز	نمک کی روٹی	176

فلسطین

زین العابدین الحسینی	خمیس پہلے مر جاتا ہے	187

کرغزستان

چنگیز آتماتوف	سپاہی کا بیٹا	197

کولمبیا

گیبریل گارشیا مارکیز	پنجر ہا اور آدمی	206
گیبریل گارشیا مارکیز	خواب بھولنے والا	215

مراکش

مبارک ربابی	جامو گنجے کا قصہ	222
محمد مرابط	ڈاکٹر صفی	230

مصر

نجیب محفوظ	پیلس واک	242
نجیب محفوظ	ہاتھ کی صفائی	250

نائیجیریا

عادا ابوریا	دروازہ	259
چنوا اچیبے	فوق مافوق	265

ویت نام

پھان دو	پھول اور انسان	271

☆☆☆☆

حرفِ آغاز

اکادمی ادبیات پاکستان کے قیام کا مقصد جہاں ایک طرف پاکستانی زبانوں کے ادب کی ترویج و اشاعت ہے وہیں یہ بات بھی اس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ بین الاقوامی ادب کو پاکستانی زبانوں خاص طور پر اردو میں ترجمہ کرائے تا کہ ہماری زبانوں کے علمی و ادبی سرمائے میں اضافے کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادبی قارئین دنیا بھر میں تخلیق ہونے والے ادب سے روشناس ہونے کے ساتھ ساتھ استفادہ بھی کر سکیں۔

انھی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے گذشتہ سال ہم نے پاکستانی زبانوں سے بین الاقوامی زبانوں اور بین الاقوامی زبانوں سے پاکستانی زبانوں میں تراجم کا جو ایک وقیع منصوبہ تیار کیا تھا اس پر تیزی سے کام جاری ہے۔

منتخب عالمی کہانیاں (جلد اول) اس سلسلے کی نویں کتاب ہے۔ اس سے قبل ہم اس سلسلے کے تحت **نوبل انعام یافتہ ادیبوں کی منتخب کہانیاں: ۲۰۰۱ تا ۲۰۱۵ء** (انتخاب و ترجمہ: نجم الدین احمد) **Through the Wall Crack** (عطاء الحق قاسمی کے منتخب کالم، مترجم: عامر رضوی)، **سندھی وائی رکافی** (مرتب: امیر بخاری)، **ناول کافن** (میلان کنڈیرا، مترجم: ارشد وحید)، **معاصر چینی کہانیاں** (انتخاب و ترجمہ: منیر فیاض) **وبا کے دنوں میں محبت** (گیبریل گارشیا مارکیز مترجم: ارشد وحید) **ای سی او کے رکن ممالک کی منتخب کہانیاں** (انتخاب و ترتیب: اختر رضا سلیمی) اور **فتوائے مرگ** (خوزے ساراماگو، مترجم: بشر احمد میر) شائع کر چکے ہیں جنھیں آپ کی جانب سے بے حد پذیرائی ملی اور انتہائی قلیل عرصے میں ان میں سے بعض کتابوں کے دوسرے ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ممتاز فکشن نگار اور مترجم محمود احمد قاضی صاحب کی ترجمہ کردہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے کچھ کہانیاں اکادمی کے سہ ماہی تدریسِ ادبیات میں بھی شائع ہو چکی ہیں جب کہ زیادہ تر انھوں نے اس کتاب کے لیے خصوصی طور پر ترجمہ کی ہیں۔ چوں کہ مترجم خود اردو کے ایک اہم کہانی کار ہیں اس لیے ان کہانیوں کے ترجمے میں بھی ایک تخلیقی شان دکھائی دیتی ہے۔ بعض کہانیوں پر تو مکمل طور پر طبع زاد ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

منتخب عالمی کہانیوں کے سلسلے کی یہ پہلی جلد ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس عنوان کے تحت ہم عالمی ادب سے انتخاب کا سلسلہ جاری رکھیں تاکہ پاکستانی قارئین عالمی ادب سے زیادہ سے زیادہ روشناس ہو سکیں۔

امید ہے کہ آپ کو حسبِ سابق ہماری یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

اپنی بات

مجھے شروع سے نفاست، سادگی اور پرکاری سے حد درجہ دلچسپی رہی ہے۔ میں نے بچپن، لڑکپن، جوانی اور بعد میں بھی روگردانی کی ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسی چیزوں سے ہمیشہ نخوت کی بو آتی ہے۔ میرے اس گریز کی وجہ شاید چیزوں سے اپنی قریب کی اشیا سے مقدور بھر یہ خاص رابطہ استوار کرنا ہوتا ہے کہ جس کے ذریعے مجھے زمین کا وہ ٹکڑا درکار ہوتا ہے جس کا میں ہمیشہ سے طلبگار رہا ہوں۔

میں نے آراستہ پیراستہ تحریروں سے اکتا کر (ان سے قطعی طور پر بے زار نہ ہوتے ہوئے) نہایت آسان (مگر اتنی ہی مشکل) اور سادہ چیزوں سے انسیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ویسے یہی چیزیں آپ سے خود ہی الفت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں)۔ تحریر میں اختصار اور خاکساری کا عنصر بجائے خود ایک خوبی اور حسن بن جاتا ہے۔ ایسے میں بھی، البتہ منظر کی تہہ داری، سلیقہ مندی اور ہماری ہنرمندی ضروری ہوتی ہے۔ اگر اپنی تحریر کی خوبصورتی کو جھندا دینا ہے۔ لکھاری صرف سامنے ہی نہ دیکھتا ہو، پرے جو کچھ ہے، اس پر بھی اس کی نظر ہونی چاہیے۔ یوں اس بیان میں جو تھوڑی سی خشکی، ترشی اور کرختگی اپنی بھی نمایاں ہو اٹھتی ہے، تو اس سے کہیں بدکنا نہیں چاہیے۔ زندگی کو خود اپنی آنکھ سے ایک دوسری طرح پر دیکھنا (یعنی زندگی جیسی ہے، ویسے ہی اسے دیکھنا، دکھانا نہیں بل کہ اسے کیسا ہونا چاہیے، اس کا بھی تذکرہ ضروری ہوتا ہے) ہی تو ایک لکھنے والے کا اصل منصب ہوتا ہے۔ وہ ہے کہ پیچھے نہیں اور نہیں کے آگے سے بیچ میں سے گزرتا ہوا راستہ بناتا ہے۔ وہ لفظوں کی ذات پات اور چھوت چھات سے اپنا پیچھا چھڑاتا ہوا آشرمکھت کے ایک ایسے منطقہ بہاریہ میں داخل ہو جاتا ہے جدھر کے پھول بھی اس کی راہ

میں آسکتے ہیں۔ شاید اس سے بھی اس کا ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ زندگی ایسے ہی مجموعہ اضداد کا نام ہے۔ یہ سیدھی لکیر ہرگز نہیں۔ اس میں خاصی کجی ہے۔ ٹیڑھ ہے۔ بزدلی اور انوکھا پن ہے۔ خوبی ہے۔ حسن ہے۔ سیرت ہے۔ صورت ہے۔ چونکا دینے والی جنگ ہے۔ حمایت ہے۔ علاحدگی ہے۔ نفرت اور محبت ہے۔ دیوانگی ہے۔ فتور ہے۔ جنون ہے۔ حقیقت کو مجاز کی جنس میں سے ہی ہو کر گزرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں ہمیں چیزوں کے کھوکھلے پن سے خود کو بچانا ہوتا ہے۔ یہ پرہیزی ہنر ہمارے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ چناؤ کا ہی تو مسئلہ ہمیں درپیش رہتا ہے اور یہیں سے ہم اپنی راہ اختیار کرنے پر خود کو تیار پاتے ہیں۔ اسٹائل بھی یہیں سے جنم لیتا ہے مگر لفظی دہشت گردی اور علم کی دھاک بٹھانے کے نقطہ نظر سے نہیں۔ ایسے ہی اپنے اردگرد کے لکھنے والوں سے میری دوستی رہی ہے اور ایسے ہی وہ باہر کے لوگ میرے ساتھی بنے جنھوں نے کہ اخلاص کو اپنے سامنے رکھا۔

گارشیا۔ یعنی مرکز کے ایک چھوٹے سے ملک کا باشندہ تھا اور اس سے بڑھ کر وہ وہاں کے چھوٹے سے منظر نامے سے ابھر کر سامنے آیا تھا۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ صحافتی اقدار سے سرشار ہوتا ہوا قلم کا مزدور رہا۔ اس نے ساری زندگی اپنے اسی آدرش، لوکیل اور ایسے ہی مواد کو استعمال کیا۔ اس نے اپنے پڑوسیوں کا ذکر کیا، جن کا کہ وہ نمائندہ تھا کیوں کہ جو چیز آپ کے برتاؤ اور برتنے میں شامل رہی ہو آپ کو اس سے کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ اس کے ساتھ اور وہ چیز آپ کے ساتھ ہمیشہ انصاف کرتی ہوئی محسوس ہوگی۔ اس کا برتاؤ آپ کے ساتھ مربیانہ نہیں، مشفقانہ، دوستانہ اور محبت والا ہوگا۔ نجیب محفوظ نے خود کو ہمیشہ قاہرہ اور اس کے قرب و جوار (یہاں میں نے مضافات کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا کہ ادب میں مضافات نہیں ہوتے) تک محدود رکھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اپنے ان گلی کوچوں سے باہر آ کر انھیں نظر انداز کر کے، دوسری اجنبی سرزمینوں کی تفاصیل میں اپنے آپ کو کھپا دے گا، انھیں بیان کرے گا تو ان سے انصاف نہ کر پائے گا اور پھر اس طرح ایک جعلی پن سا اس کی تحریروں میں نمودار ہوگا جیسے کہ پیشہ ور نامہ نگار و سفرنامہ لکھنے والوں کی تحریروں میں در آتا ہے۔ وہ ساری زندگی میں ہی کرتے رہ جاتے ہیں (خیال رہے کہ یہاں تخلیقی فنکاروں جینوئن لکھاریوں کی بات نہیں ہو رہی) نجیب

کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے مجھے اب بھی اٹھ قاہرہ کے بازار میں یوسف کے خریداروں کا ہجوم نظر آجاتا ہے۔ ناموری یوں ہی نہیں ملتی، اس کے لیے آپ کو پاپڑ بیلنا پڑتا ہے۔ کچھ اچھا حاصل کرنے کے لیے بہت سارا نفع بخش تو شہ تج دینا پڑتا ہے۔

تیئس امریکی کہانیوں کے بعد اس بار اپنے دیس سے باہر، جن لکھاریوں سے میرا واسطہ پڑا ہے تو یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جن تحریروں سے میری جان کاری ہوئی ہے وہ زیادہ تر زندہ رہنے والی لکھتیں ہیں۔ مختلف منطقہ ہائے زمین سے متعلقہ ذائقے آپ کے سامنے ہیں۔ جو لوگ محض لفظ گری کو ہی اپنا ادبی ایمان سمجھ بیٹھے ہیں، یہ تحریریں ان کے لیے آنکھ کھولنے والی ہو سکتی ہیں۔ وہ دیکھیں کہ یہ مخلص تحریریں کیسے کیسے گلاب کھلاتی نظر آتی ہیں۔ ملاچی ملاچی واٹھور (جسے کیتھرین منسفیلڈ کے پائے کی لکھاری کہا گیا اور جس نے 1939 میں از خود لکھنے سے باقاعدہ ریٹائرمنٹ لے لی تھی) کا میوزک باکس ایک سنک، ایک چھلکا بن کر آپ کو تنگ کرے گا۔ (بالکل ایسے ہی جب آپ کوتھ میزر کی کہانی "سنک کی روٹی" سے گزریں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ جھوک کیسے مثبت آداب زندگی اور خاص طور پر محبت کو بھی نکلتے ہوئے نہیں ہچکچاتی) جو افسانہ یا کہانی تنگ نہ کرے۔ ایک بار پھر نہ پڑھنے پر اکسائے بھلا کوئی لکھت ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کتاب میں چند ایسی چیزیں ضرور پڑھنے کو مل جائیں گی، جو آپ کے اندر ایک عجیب طرح کی سماہٹ کو جنم دیں گی۔ جھنجھوڑنے جیسی کیفیت اگر نہ بھی پیدا ہو تو بھی یہ تحریریں آپ سے چند نئی سوچ ضرور کرتی نظر آئیں گی اور یہی ان کی تہذیبی خوبی ہوگی۔ ترجمہ میرے نزدیک ایک زمین کے خارج سے دوسری اجنبی زمین کے دل میں اترنے کے مترادف ہے۔

محمود احمد قاضی

لوئیس ویلین زیولا

رات کا گھوڑا

دروازے کی گھنٹی بجی۔ پہلے تین چھوٹی گھنٹیاں اور پھر ایک ریلوے کی گھنٹی۔ یہ اشارہ تھا اور میں تھوڑا سا ڈرتی ڈرتی ہوئی دروازہ کھولنے پہنچی۔ یہ وہ لوگ بھی ہو سکتے تھے اور تب وہ روایتی نہیں ہو سکتا تھا۔ رات کے ان بے کرم لمحات میں یہ ایک پھندا بھی ہو سکتا تھا۔

وہ تیزی سے اندر آیا اور اس نے مجھے گلے لگانے سے پہلے اپنے پیچھے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ اپنے رویے میں اتنا محتاط تھا کہ اس نے سب سے پہلے اپنے اور میرے آخری درجے کے حائل حفاظتی نظام کو چیک کیا۔ پھر اس نے مجھے بھینچنے کے انداز میں نہیں، بس ایسے ہی بھیگی ہوئی انگلیاں لیے ہوئے، اپنے بازوؤں میں لے کر ہماری اس کی ملاقات کے تمام تر جذبات وابستہ جانے دیے۔ اس نے اسی انداز میں مجھے اپنے بازوؤں میں لیے ہوئے آہستہ آہستہ سے چومنے کے انداز میں سب کچھ کہہ دیا۔ میں سوچتی ہوں کہ اسے کسی لفظ میں تلقین نہیں رہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح خاموش تھا اور چہرہ چاٹنے کی شکل میں تمام پیغامات مجھ تک پہنچا رہا تھا۔

آخر کار ہم دونوں نے کسی بھی فوکس کے بغیر ایک دوسرے سے آنکھیں ملاتے ہوئے سر سے پاؤں تک، ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے پیچھے کی طرف قدم بڑھائے اور میں ان تمام مہینوں کی کسی تیزی کے باوجود مکمل طور پر کچھ کہے بغیر یہ مشکل اسے سہو نہ پائی، جب کہ مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہ اب کہاں پر ہو سکتا ہے اور میں اسے یہ کہنے کے قابل ہوئی کہ

میں سوچتی تھی کہ تم شمال کی جانب لڑنے میں مصروف تھے

میرا خیال تھا شاید تم پکڑے گئے ہو

میرے خیال میں تم کہیں چھپے ہوئے تھے

میری سوچ یہ بھی تھی کہ تمھیں اذیت دینے کے بعد مار دیا گیا ہے

کئی طریقوں سے اسے بتاتے ہوئے، میں اس کے متعلق سوچ رہی تھی، میں نے اس کے

متعلق محسوس کرنے اور سوچنے کو تحریک دیتا جیسے یہ کہ مجھے نظر انداز کیا گیا تھا اور ادھر وہ تھی ویسی ہی اچھی، ویسی محتاط، ویسی ہی اپنے عمل کا ہے

"خاموش، شیتی، تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم نہ جان پاؤ کہ میں کہاں تھی"

تب اس نے پناہ گزینوں، طاقتور اشارے (سراغ) وغیرہ کی شکل میں مجھ پر عیاں کیا جو بعض اوقات وہ مجھ سے چھپا جاتا تھا۔ کچا کی ایک بوتل اور کان کا کاریگارڈ۔ وہ راز میں یہ سمجھتا پھر رہا تھا؟ وہ آگے کیا کرنے جا رہا تھا؟ اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے ہوئے کیا چیز اسے واپس لے آئی تھی؟ جب کہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ پھر میں نے اپنے آپ سے سوال کرنے بند کر دیے۔ (خاموش، شیتی۔ اس نے کہا) وہ کہہ رہا تھا، شیتی ادھر آؤ اور میں نے فکرمند نہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اس کو دوبارہ پا لینے کی خوشی میں سما جانے کو ترجیح دی۔ آنے والے کل کو ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور وہ دن جو اس کے بعد آنے والے تھے۔

کچا کا ایک تیکھی شراب ہے۔ یہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے تمام صحیح راستوں پر حرکت کرتی ہے اور جب اس کو وہاں تک جا کر رک جاتی ہے جہاں گرم ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کان کو شا کی آواز میں تپش ہے۔ وہ ہمیں اپنی آواز کے حصار میں لے لیتی ہے اور ہم سی قدر رقص کرتے ہوئے اور قدرے تیرتے ہوئے بستر پر آ جاتے ہیں۔ ہم لیٹے ہوئے ایک دوسرے کی آنکھوں کی گہرائی میں تکتے ایک دوسرے کو دیکھے جاتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے فی الحال خالص احساسات کو اپنے اندر سرایت کرنے کی جارحیت نہ دیتے ہوئے چھوا چھی کو جاری رکھتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے دوبارہ سے دریافت کرنے اور پہچاننے کی کوشش جاری رکھتے ہیں۔

میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ہوں "بیو" مجھے معلوم ہے کہ یہ اس کا اصل نام نہیں ہے۔ لیکن بس یہی ایک نام ہے، جس کے حوالے سے، میں اسے اونچی آواز میں پکارتی ہوں۔ وہ جواب دیتا ہے "ہم کسی اور موقع پر یہ کریں گے صبیحا لیکن اس وقت ہمیں باتیں نہیں کرنا چاہئیں" "چلو ایسے ہی ٹھیک ہے یہی بہتر ہے کہ وہ اس بات چیت کا آغاز نہیں کرتا کہ ایک دن شاید ہم ایسا کر سکیں گے تاکہ ہم دونوں اس وقت بالکل ایسے جو پچھتاوے کی نجات پانے والے تھے، ان جیسا نہ ہوتے ویں

اچانک گال شارپکارڈ پلیئر کے اندر گانے لگتی ہے "A noite eu so teu cavalo" میں آہستگی سے اس کا ترجمہ کرتی ہوں "آج کی رات میں تمہارا گھوڑا ہوں" تاکہ اسے اپنے کر

میں گفتگو کرتے ہوئے دوسری چیزوں کے متعلق، سوچنے سے روک دوں۔ میکبا کی طرح یہ ایک صوفی نظریہ ہے۔ وہ کوئی جو بے خودی کی اس حالت میں ہے۔ اس کا کہنا ہے یہ اس روح کا گھوڑا ہے، جو اس پر سواری کر رہی ہے۔ یہ اس کی زینت ہے۔

"شیلا! تم ہمیشہ ہی تحفی عقیدے اور جادو کے حامل خیالات کی رو میں بہہ جاتی ہو۔ تم صحیح طور پر جانتی ہو کہ وہ روح کے بارے میں بات نہیں کر رہی ہے۔ اور آج کی رات تم میرا گھوڑا ہو تو اس لیے کیوں کہ میں تم پر سوار ہوں۔ اس طرح۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔ ایسے۔ اور بس۔"

یہ سب کچھ بے حد سے زیادہ گہرا، بے آہنگ اور اتنی پیاری بے ربطی پر مبنی تھا کہ ہم دونوں آخر میں تھک گئے تھے۔ میں اس کے اوپر پڑے ہوئے سو گئی۔

آج کی رات میں تمھارا گھوڑا ہوں۔

میں ایک گہرے کنویں میں ہلکورے لے رہی تھی کہ اس شیطانی فون نے مجھے باہر کھینچ لیا۔ جاگنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے، میں سوتی ہوئی فون تک آئی کہ یہ میو ہوگا، یقیناً، کیوں کہ وہ اس وقت سفر میں میرے ساتھ نہیں تھا، یقیناً، اپنی اسی عادت کو اپناتے ہوئے کہ وہ مجھ سے ایک لفظ بھی کہے بغیر کہ وہ کہاں جا رہا ہے مجھے نیند کی حالت میں چھوڑ جاتا تھا۔ میرے تحفظ کے لیے۔ وہ کہتا ہے۔

اس کی دوسری طرف، ایک آواز تھی، میرے حواس میں آندرے جیسی، وہی ایک وہ جسے ہم آندرے کہہ کر بلاتے تھے۔ اس نے مجھے بتانا شروع کیا۔ "انھوں نے دریا کے دوسرے کنارے کے قریب میو کو مردہ حالت میں بہتا ہوا پایا۔ لگتا ہے کہ انھوں نے چھرے سے وار کر کے اسے زندہ حالت میں ہی وہاں پھینک دیا۔ وہ پانی میں چھ دن رہنے کی وجہ سے پھولا ہوا اور مسخ شدہ حالت میں تھا لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ یہ وہی تھا۔"

"نہیں، یہ میو نہیں ہو سکتا۔" میں بے احتیاطی کے ساتھ چلائی۔

اچانک آواز آندرے جیسی بدلی۔ میں نے اسے غیر شخصی اور اجنبی محسوس کیا۔

"کیا تمھارا یہ خیال ہے؟"

"کون بول رہا ہے۔ میں نے تب ہی یہ پوچھنے کا سوچا تھا لیکن عین اسی لمحے فون بند ہو گیا۔

دس یا شاید پندرہ منٹ؟ پتا نہیں کتنی دیر تک میں احمقوں کی طرح فون کو گھورتی رہی تھی کہ یہ بند ہو گیا۔ مجھے اس کے آنے کی توقع نہیں تھی۔ لیکن پھر دوبارہ، میں ایسا کیوں نہیں سوچ سکتی تھی؟ ان

کے ہاتھ مجھے ٹال رہے تھے۔ ان کی آوازیں مجھے زاری تھیں اور میری بے عزتی کر رہی تھیں۔ گھر کی تلاشی لی گئی۔ انھوں نے سب چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ لیکن میں پہلے ہی سے جانتی تھی سو مجھے اس سے یہ لینا دینا تھا کہ انھوں نے سونے جانے والی چیز کو تو زمین پر رکھ دیا تھا اور میرے ذریعے کو بھی توڑ پھوڑ دیا تھا۔

انھیں کچھ بھی نہ ملا۔ میری واحد ملکیت میرا ایک خواب تھا اور وہ اس طرح مجھے میرے خوابوں سے محروم نہیں کر سکتے تھے۔ اس رات والا میرا خواب جب میرا دولہا میرے پاس تھا اور ہم ایک دوسرے کی محبت میں مدغم تھے۔ میں نے خواب دیکھا، اس کا ایک ایک جزو دیکھا۔ مجھے پکا یقین تھا کہ میں نے اس کو، اس کی ساری تفصیلات حتیٰ کہ اس کے تمام تر خدوخال کے ساتھ دیکھا تھا۔ اور خواب پولیس کا مسئلہ نہیں ہوتے۔

انھیں حقیقت چاہیے ہوتی ہے یعنی انھیں ٹھوس حقائق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی کوئی چیز میں انھیں بالکل بھی فراہم نہیں کر سکتی تھی۔

وہ کہاں ہے، تم نے اسے دیکھا ہے؟ وہ یہاں تھا تمھارے ساتھ۔ وہ کہاں چلا گیا؟ بولو نہیں تو بعد میں تمھیں افسوس ہوگا۔ ہم نے سنا تم کاری تھیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے وہ تمھیں ملنے آیا تھا، وہ کہاں ہے اور کہاں چھپا ہے؟ وہ شہر میں ہی ہے۔ شاباش، اگل دو۔ ہم جانتے ہیں وہ تمھارے حصول کے لیے آیا تھا۔

میں نے بہتیروں سے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ میں نے اس کی طرف سے کچھ نہیں سنا۔ وہ بھاگ گیا اور انڈر گراؤنڈ ہو گیا۔ مجھے یہ پتہ کہ وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ گیا یا کسی اور ملک میں ہے۔ میں کیسے جان سکتی ہوں۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

(چلو شروع کرو، اپنے سگریٹوں سے مجھے جلاؤ، مجھے اپنی خواہش کے مطابق تم سب ٹھوکریں مارو، مجھے احمقانہ کے بر عکس، مجھ پر چیخ سے چھوڑ دو، جو مجھے اندر اور باہر سے کھائے جا رہی ہے۔ میرے ساتھ تم جیسا سلوک کرو جیسے تم چاہتے ہو۔ کیا میں اس کے لیے صلح کر لوں؟ کیا میں تمھیں بتا دوں کہ وہ یہاں میرے ساتھ تھا جب ایک ہزار سال پہلے اس نے مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا؟)

میں انھیں اپنے خوابوں کے متعلق بتانے والی نہیں ہوں۔ وہ کیوں پروا کریں؟ میں نے اس ماہ نہ دیکھا کو چودہ سے زیادہ عرصے سے نہیں دیکھا اور مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ شخص بس غائب ہو گیا

میں اسے صرف اپنے خوابوں میں دیکھتی ہوں اور یہ برے خواب ہوتے ہیں جو کہ اکثر ڈراؤنے خواب بن جاتے ہیں۔

بیٹو تم اب جانتے ہو، اگر یہ سچ ہے کہ انھوں نے تمھیں مار دیا ہے اور تم جہاں کہیں پہ بھی ہو۔ بیٹو میں تمھاری رہتے ہوئے گھور رہوں اور جہاں کہیں بھی تم چلے گئے، میرے ساتھ رہ سکتے ہو حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ میں جیل میں ہوں، بیٹو، اب جب کہ میں جیل میں ہوں، میں جانتی ہوں کہ اس رات میں نے تمھارا خواب دیکھا تھا یہ محض ایک خواب تھا اور اگر کسی خود رو توقع کی وجہ سے وہاں میرے گھر میں کال کی شہزادی کا رہا اور کچا ہانی آدمی ہوتی موجود تھی تو میں امید کرتی ہوں کہ وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ میں اپنی ناموجودگی میں اُن کے لیے وصیت کروں گی۔

☆☆☆☆

ریمنڈ کارور

موٹا

میں اپنی دوست ریٹا کے ساتھ بیٹھا کافی اور سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہا ہوں اور میں اسے اس کے متعلق بتا رہا ہوں۔

جو کچھ میں نے اسے بتایا ہے وہ حسب ذیل ہے

یہ ایک سست روی کی شام ہے جب ہرب نے اس موٹے شخص کو میرے کیبن میں لا بٹھایا۔ یہ ان تمام موٹوں سے زیادہ موٹا ہے جنھیں میں نے آج تک دیکھا ہے۔ اسے یہ دیکھنے میں اچھا لگتا ہے اور اس نے اپنا سر بھی گنجا رکھا ہے۔ اس سے متعلق صرف یہ بری ہے لیکن یہ اس کی انگلیاں ہیں جنھیں میں نے اپنی یاد میں اچھی طرح محفوظ کر رکھا ہے۔ جب میں اس عمر رسیدہ جوڑے کو دیکھتے ہوئے اس کی میز کے پاس رکتا ہوں، تو میں اس کی انگلیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ وہ بھی موٹی اور پھکی انگلیاں ہیں اور ان کا سائز ایک نارمل شخص سے تین گنا زیادہ ہے۔

میں دوسری میزوں کی طرف جاتا ہوں۔ ان میں چار لوگوں کی ایک تاجر پیشہ لوگوں کی ایک ٹکڑی ہے جو اپنی مطلوبہ چیزوں کی شدت سے طالب ہے۔ چار لوگ اور بھی ہیں، ان میں تین مرد اور ایک عورت شامل ہے۔ وہ دو بوڑھا جوڑا ہیں رنگے ہوئے آدھی کوپنی کٹ سے پیا ہے اور میں اس تک پہنچنے سے پہلے اسے وافر وقت دینا چاہتا ہوں تاکہ وہ اپنا ذہن بنا لے۔

شامپئن، کیا میں آپ کے لیے کچھ لاؤں؟ میں کہتا ہوں۔

ریٹا، وہ بولی تھا میرا مطلب بہت بڑا

شامپئن، اس نے کہا ہاں میرا خیال ہے ہم چونکانے کے لیے اب تیار ہیں

تم نے چاہا کہ اس کے کہنے کا یہ کیسا عجیب انداز ہے بات کرتے ہوئے وہ زیادہ تر پھنکارنے جیسی آواز نکالتا ہے۔

میرا خیال ہے ہمیں میز سلاد سے آغاز کرنا چاہیے۔ اور اس کے بعد سوپ کا ایک پیالہ اور

اس کے ساتھ روٹی اور مکھن بھی۔ اگر مکھن موتو میکنے کا قیمہ بھی ہونا چاہیے اور کریم کے ساتھ شور کے پکے آلو بھی۔ میٹھی چیز کے بارے میں ہم بعد میں سوچیں گے۔ وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے مینو پکڑا دیتا ہے۔

اوخدایا، ریٹا۔ کیا انگلیاں تھیں۔

میں کچن کی طرف جاتا ہوں اور روڈی کو آرڈر کے بارے میں بتاتا ہوں۔ وہ منہ بناتا ہے۔ تم روڈی کو جانتی ہو۔ کام کرتے وقت وہ ایسا ہی دکھتا ہے۔

جب میں کچن سے برآمد ہوتا ہوں تو مارگو میں نے تمھیں مارگو کے بارے میں بتا رکھا ہے۔ وہی جو روڈی کے تھ قب میں رہتا ہے مارگو مجھ سے کہتا ہے تمھارا یہ موٹا دوست کون ہے؟ وہ حقیقتاً موٹا ہے۔

اب یہ اسی کے متعلق ہے۔ میں سوچتا ہوں یہ یقیناً اسی کے متعلق ہے۔

جب میں میز پر سلاد اس کی میز پر لاتا ہوں تو وہ مجھے روٹی پر مکھن لگا کر ایک طرف رکھتے ہوئے میری حرکت ملاحظہ کرتا ہے۔ اس سارے وقت میں وہ چہکارے جیسی آواز نکالتا رہتا ہے۔

میں خود کسی اور طرف مکھن پاتا ہوں۔ میں اس کا پانی والا گلاس بھرا رہتا ہوں۔

مجھے افسوس ہے۔ میں کہتا ہوں۔ جب آپ کسی کام میں جلدی کر رہے ہوں تو تب ایسا ہو جاتا ہے۔ بہر حال مجھے افسوس ہے۔ سب ٹھیک ہے ناں؟ میں اس کے وضاحت کے لیے کہہ دیتا ہوں۔

ارے کوئی بات نہیں۔ وہ کہتا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ وہ چہکارتا ہے۔ فکر نہ کرو۔ ہم نے برا نہیں مانا۔ وہ مسکراتا ہے اور جب میں بیندر کی طرف جا رہا ہوتا ہوں تو وہ ہوا میں ہاتھ ہلاتا ہے اور جب میں اس کی میز پر سلاد لاتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ اس آدمی نے تب تک ساری روٹیاں اور مکھن کھا لیا ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد، جب میں اس کے لیے اور روٹی لاتا ہوں تب تک وہ سلاد ختم کر چکا ہوتا ہے۔ تم میز پر سلاد کے سائز سے متعلق تو جانتی ہی ہو؟

تم بہت اچھے ہو۔ وہ کہتا ہے۔ روٹی بہت مزے دار ہے۔

شکریہ۔ میں کہتا ہوں۔

یہ بہت اچھی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اور ہم ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس روٹی جیسا مزہ کبھی نہیں آیا۔

آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟ میں اس سے پوچھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے، اس سے پہلے میں نے آپ کو نہیں دیکھا وہ ایسا شخص نہیں ہے، جسے آپ بھول جائیں۔ ریٹا آہستگی سے ہنستی ہے۔

ڈیوڈ کہتا ہے

میں اس موضوع سے متعلق اور کچھ نہیں کہتا۔ حالاں کہ میں متجسس ہوں۔

جناب، آپ کا سوپ چند منٹوں میں آپ تک پہنچ جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے، میں ان چار نامور پیشہ لوگوں کی جانب بڑھ جاتا ہوں، جو اپنے آرڈر کے سلسلے میں نہایت پر جوش ہیں۔

جب میں اس کا سوپ سرو کرتا ہوں تو روٹی غائب ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ روٹی کا آخری ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال رہا ہوتا ہے۔

یقین کرو ہم سے وقت پر کچھ نہیں کھاتے۔ وہ کہتے ہوئے پھنکارتا ہے۔ مجھے توقع ہے آپ اس بات کو نظر انداز کر دیں گے۔

معذرت کر کے آپ کسی چیز کا خیال نہ کریں۔ میں خوش خوراک آدمی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔

میں نہیں جانتا کہ آپ اس سب کو کیا کہیں گے۔ وہ چنگھاڑتا ہے۔ وہ اپنے ہیلمٹ کو اتارتا ہے۔ پھر وہ اپنا چمچ اٹھاتا ہے۔

او میرے خدایا۔ وہ بہت موٹا ہے۔ لینڈر کہتا ہے۔

اسے اس پر اختیار نہیں۔ سو اپنا منہ بند رکھو۔ میں کہتا ہوں۔

میں مزید مکھن اور روٹی ایک ٹوکری میں رکھ کر لاتا ہوں۔ سوپ کیسا تھا؟ میں پوچھتا ہوں۔

شکریہ..... چہ، بہت اچھا۔ وہ اپنے ہونٹ پونچھتا ہے اور اپنی ٹھوڑی کو تھپتھپاتا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں وہ تھوڑی سی محسوس ہو رہی ہے یا مجھے ہی لگ رہی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

نہیں۔ یہاں گرمی ہو رہی ہے۔ میں کہتا ہوں۔

ہو سکتا ہے ہم اپنا کوٹ اتار دیں۔ وہ کہتا ہے

ٹھیک ہے آپ ایسا ہی کریں۔ آدمی کو سہولت میں ہونا چاہیے۔ میں کہتا ہوں

یہ صحیح ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ وہ کہتا ہے

کچن میں تھوڑی دیر بعد، میں دیکھتا ہوں تو ابھی اس نے اپنا کوٹ پہن رکھا ہوتا ہے

میری بڑی پوتیاں اس وقت فارغ ہو چکی ہیں اور وہ بوڑھا جو زا بھی جا چکا ہوتا ہے۔ جگہ

خالی ہو رہی ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت میں اس موٹے شخص کو قیمہ اور شوربے میں پکے آلو دے رہا ہوتا ہوں مزید روٹی اور مکھن کے ساتھ۔ اب وہی ایک ہے، جو ادھر رہ گیا ہے۔

میں آلوؤں پر مزید کھٹی کریم انڈیلتا ہوں۔ میں اس کے لیے مزید روٹی اور مکھن لاتا ہوں۔

سب کچھ ٹھیک ہے ناں؟ میں کہتا ہوں۔

بہت عمدہ، وہ کہتا ہے اور پھنکارتا ہے۔ شان دار، شکریہ، وہ کہتے ہوئے پھر پھنکارتا ہے۔

آپ اپنے ڈنر سے لطف اندوز ہوئے۔ میں کہتا ہوں۔ میں اس کے چینی دان کا ڈھکن اٹھاتا ہوں اور اس میں جھانکتا ہوں۔ میں جب تک وہاں سے ہٹ نہیں جاتا وہ سر ہلاتے ہوئے مجھے دیکھتا رہتا ہے۔

میں جانتا ہوں، میں کسی چیز کا متلاشی تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ کس چیز کا۔

وہ کھانے کا ڈرم کیا کر رہا ہے؟ وہ قسم سے تمھاری ناکیں علاحدہ کر دینے پر تلا ہے، ہیریٹ نے کہا۔ تم ہیریٹ کو جانتی ہی ہو۔

بیٹھے ہیں۔ میں موٹے آدمی سے کہتا ہوں، ہمارے پاس گرین لیزن اسپیشل ہے جو کہ چینی دانا چوٹک کیک ہے۔ یہ چھ ہمارے پاس تازہ کیک ہے اور یہ چھ ویلا آئس کریم یا اناس کا شربت ہے۔

کیا ہم آپ کا زیادہ وقت تو نہیں لے رہے؟ وہ پھنکارتے ہوئے کسی قدر فکرمندی کے ساتھ کہتا ہے۔

بالکل نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ بے شک نہیں۔ آپ اپنا وقت لیں۔ جب تک آپ کسی فیصلے پر پہنچتے ہیں تب تک میں آپ کے لیے کافی لے کر آتا ہوں۔

ہم آپ کے ساتھ یہاں داری برتیں گے۔ وہ کہتا ہے اور کرسی پر پہلو بدلتا ہے۔ ہم اسپیشل کو ہی پسند کریں گے لیکن ساتھ ہی ہمیں ویلا آئس کریم ڈش بھی چاہیے ہوگی۔ جس میں قطرہ بھر چاکلیٹ سیرپ بھی ہو۔ اگر آپ کی عنایت ہو۔ ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہ کہتا ہے۔

میں چینی کی طرف جاتا ہوں تاکہ اس کے چینی کی فرمائش کو خود سے پورا ہوتے دیکھ سکوں

روڈی اور ہیریٹ کہتے ہیں۔ تم اس موٹے آدمی کو یہاں کسی سرکس سے لے آئے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟

روڈی نے پتا پیرس ورہیٹ تا رہا ہے اگر تم سمجھ سکو کہ یہ کہنے کا کیا مطلب ہے۔ روڈی وہ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں لیکن یہ مکمل کہانی نہیں ہے

روڈی قہقہہ لگاتا ہے

مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ میٹھی چیز سے رغبت رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے

بہتر ہے روڈی کہ تم دیکھتے رہو۔ جون، جو اس لمحے کچن میں داخل ہوتا ہے، کہتا ہے۔

روڈی، جون سے کہتا ہے۔ میں حسد میں مبتلا ہو رہا ہوں۔

میں چاکلیٹ کو موٹے آدمی کے سامنے رکھتا ہوں اور وہ یا آئس کریم کا پیالہ بھی کہ جس کے ایک طرف چاکلیٹ سیرپ ہے۔

شکریہ، وہ کہتا ہے

ہم آپ کو ویلکم کرتے ہیں، میں ایک خاص قسم کے تاثر کے ساتھ کہتا ہوں۔

آپ یقین کریں یا نہ کریں ہم نے آج تک ایسا کھانا نہیں کھایا۔ وہ کہتا ہے۔

میں کھاتا ہوں، کھاتا ہوں اور کھائے چلا جاتا ہوں۔ میں کہتا ہوں۔ میں مزید لینا چاہوں گا۔ نہیں، وہ کہتا ہے۔ اگر ہمارا کوئی چانس ہو۔ نہیں یہاں تو مرضی کی تو بات ہی نہیں ہے۔ تب وہ اپنا چمچ اٹھاتا ہے اور کھانے لگتا ہے۔

اس کے علاوہ کیا؟ ریٹا میرا سگریٹ سلگاتے ہوئے اور کرسی کو میز کے قریب لاتے ہوئے کہتی ہے۔

کہانی بہت دلچسپ ہوتی جا رہی ہے اب۔ ریٹا کہتی ہے۔

بس یہی سب کچھ ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ وہ اپنا جتنا کھانا ہے۔ پھر وہ چلا جاتا ہے۔ اور تب ہم گھر کی طرف لوٹتے ہیں۔ میں اور روڈی۔

ایک موٹا، روڈی اپنے جسم کو پھیلاتے ہوئے کہتا ہے اور ایسا وہ اس وقت کرتا ہے، جب وہ تھکا ہوا ہو۔ تب وہ ہنستا ہے اور پھر ٹی وی دیکھنے لگتا ہے۔

میں چائے کے لیے پانی ابلنے کو رکھتا ہوں اور نہاتا ہوں۔ میں اپنے سر پر ہاتھ رکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اس وقت کیا ہوگا، جب میرے بچے ہوں گے اور ان میں سے ایک ایسا ہی ہوگا، بہت موٹا۔

میں چائے دانی میں پانی ڈالتا ہوں، پیالیوں کو ترتیب دیتا ہوں، چینی دان رکھتا ہوں۔ ڈبی سفید کیا اور ٹرے روڈی کی جانب لے جاتا ہوں جیسے کہ وہ اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔ روڈی کہتا ہے۔ میں ایک موٹے شخص کو جانتا ہوں موٹے لوگوں کے ایک جوڑے کو، اصلی موٹے لوگ، جب کہ

میں ایک بچہ تھا۔ وہ گول مٹول تھے، بعد، مجھے ان کا نام یاد نہیں ہوتا، بس یہی ایک نام تھا جو اس بچے کا تھا۔ ہم سے ہوتا کہ کہا کرتے تھے ہوتا لڑکا، جو میرے ہمسائے میں رہتا تھا۔ وہ ہمسایہ تھا۔ دوسرا ہوتا کچھ عرصے بعد آیا۔ اس کا نام مہاجی تھا۔ سب اسے واجی کہتے تھے سوائے استادوں کے۔ واجی اور ہوتا کاش میرے پاس ان کی تصاویر ہوتیں۔ روڈی کہتا ہے۔

میں کہنے کے لیے کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ اس لیے ہم نے چائے پی اور جلدی میں بستر کی طرف بڑھ گئے۔ روڈی کہتا ہے بتی بند کر دیتا ہے۔ سامنے والا دروازہ بند کر دیتا ہے اور اپنے بٹنوں کو کھولنا شروع کرتا ہے۔

میں بیڈ پر جاتا ہوں اور خود کو بالکل اس کے کنارے کے قریب کر لیتا ہوں اور الٹا ہو جاتا ہوں۔ لیکن فوراً ہی جب وہ لائٹ بند کر کے بستر پر آتا ہے تو روڈی شروع ہو جاتا ہے۔ میں کمر کے بل ہو جاتا ہوں اور توقف کرتا ہوں حالاں کہ یہ میری مرضی کے خلاف تھا۔ لیکن یہی دھوکا ہے۔ جب وہ مجھ پر آتا ہے تو اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں موٹا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بے تحاشا موٹا ہوں اتنا موٹا کہ روڈی میرے سامنے ایک نہایت ننھا سا ہو جاتا ہے، جیسے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہو۔

یہ ایک مرحلہ ہوتا ہے، رہتا ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ نہیں جانتی کہ اس سے کیا مطلب اخذ کرے۔

میں غم زدہ ہو جاتا ہوں۔ لیکن میں اسے مزید کچھ نہیں بتاتا۔ میں پہلے ہی اسے بہت کچھ بتا چکا ہوں۔

وہ وہاں بیٹھی ہے انتظار میں۔ اس کی نازک انگلیاں اپنے بالوں سے کھیلتی ہیں۔ انتظار کس چیز کا؟ میں جاننا چاہوں گا۔

یہ گست ہے۔

میری زندگی بدلنے کو ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں۔

☆☆☆☆

گائی ڈیون پورٹ

ہیل سلاسی کی جنازہ گاڑی

ہمیں تیس برس ہیل سلاسی کی جنازہ گاڑی ایڈیل سے روانہ ہوئی آہستہ روی کے ساتھ کہ پرانی الہٹ میں اپنی چھتریوں کے ساتھ شاہ جس پلیٹ فارم سے پرے کھڑے تھے، وہاں سے ہم خاموشی کے ساتھ گزرتے رہے۔ بیدیہ جنھوں نے بچے بیت بیکس رکھے تھے، انھوں نے منہ پر رومال رکھے ہوئے تھے اور پورٹر رنگین وگری پہنے ہوئے مستعد کھڑے تھے۔ ایک بڑا سا بینڈ نے "ہیل" میں نیں لورا بجایا۔

ہم نے ورکنڈ سے تیس ورکس پر رفتار پکڑی اور گاڑی نے ڈبے کے قریب پہنچ کر لوگوں کو دیکھتے ہوئے ورکس کو چیک کرتے ہوئے پنا ہا شروع کر دیا۔ ہم میں سے بیشتر نے اپنے ہاتھ موڑ کر اپنی جھولیوں میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ویلیس بابا کے ٹھنڈے آراستہ درختوں، سپاہیوں کے ننگے پاؤں پر پیٹ کیے گئے سفید پاپوشوں اور کشتیوں والے اونٹوں کے بارے میں سوچا جو جھلسے ہوئے حاشیوں والی پگڑیاں دامانکل کے پار سے لائے تھے۔

ہم صاف ستھرے فارموں، سٹوروں، زیتون کے جھنڈوں اور انگور کے باغوں کے پاس سے گزرے۔ جب گارڈز اور کنڈکٹر زا گلے ڈبے میں چلے گئے تو ہم نے خود کو آسودگی میں پایا اور ہم باتیں کرنے لگے۔

وہ بھی آنکھوں کے ساتھ چالیس سال تک سویا رہا" میرے پیچھے موجود ایک عورت نے اپنے ساتھی سے کہا، جس نے جواب دیا کہ ایسا ان کی فیملی میں ہے۔

یہ یہودی ایک موٹے آدمی نے گاڑی میں اعلانیہ انداز میں کہا

سالوں بعد، جب میں تھوڑا جاس کو ہیل سلاسی کی جنازہ گاڑی کے بھیدوں کے بارے میں بتا رہا تھا تو وہ حیران رہ گیا کہ میں کسی دوسرے ملک میں بھی رہا تھا۔

میرے خدا، کیا گاڑی تھی۔ کیا وقت تھا۔ اس نے کہا۔ میں وہاں تھا۔ مجھے وہ لوگ یاد ہیں جو اس گاڑی میں تھے۔ تھوڑا جاس وہاں تھا۔ میں وہاں تھا۔ سفید تھے، سارہون اور آکسفورڈ کے پروفیسر

تھے، کم از کم ایک چینی فیلڈ مارشل بھی تھا اور پرسیا کا تاج دار شاہ بھی وہاں پر موجود تھا۔

ہم جو کچھ اس وقت میں نے اسے نہیں دیکھا تھا 1936 کی دنیا آج کی دنیا سے بہت مختلف تھی۔ میں جانتا تھا کہ ہٹلر بھی گاڑی پر سوار ہے۔ میں نے اسے لیفٹیننٹ کی مسلی ہوئی یونی فارم میں دیکھا، اس کا سر ایک ریشمی پٹی سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی چھوٹی سی مونچھ ناک کے نیچے موجود تھی۔ وہ بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا، اس کے چوڑے ہاتھ اس کے گھٹنوں پر تھے۔ اس کی ٹھوڑی فخریہ انداز میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔

پیس ہال میں ایک چھوٹے سے قد کے داڑھی والے شخص نے ضرور دیکھا ہوگا کہ میں کس خوف سے ہٹلر کو دیکھ رہا تھا کیوں کہ اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور اس نے آ کر اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا تھا۔ اس آدمی کے قریب مت جاؤ۔ اس نے نرمی سے میرے کان میں کہا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک قیدی ہے۔ اس رنجی شام کے لیے جو ہمدردی میں نے محسوس کی وہ چھوٹے فارموں کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی قسمت سے بھی جھلک رہی تھی۔ ہم نے گایوں کو دیکھا جو چراگاہ سے گھر کی طرف ہانکی جا رہی تھیں۔ خانہ بدوش اپنے شام کے الاؤ کے گرد دوزانو بیٹھے تھے، سپاہی ایک جھنڈے کے پیچھے مارچ کر رہے تھے اور وہاں وہ ڈرم بجانے والا بھی تھا جس کا منہ کھلا ہوا تھا۔

ایک بار ہم نے بارہ نیم کے خوش کن سروں کو سنا لیکن ہم صرف کوئلے کی کان سے نکلتے ایک بڑے سے کوئی دیکھ سکے۔

ہٹلر وقتاً فوقتاً بالکل ایک جرمن جیسا دکھائی دیتا تھا کہ اس کے سر پر، جس پر پٹی بندھی تھی، اچار کے مرکب کے دھبے تھے۔ اس کی چھوٹی سی مونچھوں اور اس کی بھلی آنکھوں میں جنونی نظم و ضبط کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ گلابی، ہلکا تھا، شکلوں کا بگڑنا اور بدلنا ہمیشہ بڑھتا نہیں ہوتا، سایوں میں ایک قیدی روشنی چھپی ہوتی ہے جیسے کہ سنسان کمرے میں ایک بیولہ نما سایہ، انگوروں کے سبزے میں سرخی، سرخ ترین شراب میں سبزہ۔

ہم ایک ایسے شہر کے قریب سے گزرے جہاں لکڑی کے بنے ہوئے گھروں کے چھجوں پر بیلیں لٹک رہی تھیں اور وہاں جھنڈی طرح چاندی کے درخت تھے اور وہاں عورتیں اپنے ہاتھوں میں قینچیاں اور ہٹیاں لیے کھڑی تھیں۔ میں نے ایک چھوٹی لڑکی کو ہیپ ہاتھ میں لیے کھڑے ہوئے دیکھا، ہیپ کی موسیقی کی ایک پرانی تیز شکل، تنگوں کا ہیٹ پہنے ہوئے ایک خچر گاڑی کے انجن اور محاذ

والے کمرے سے چوتھے نمبر کے سونے والے کمرے میں داخل ہوا جائے تو دائیں طرف والے کالے نیلے پیلے کیپارٹمنٹ کی چوبی ٹیبل پر جائس بیٹھا دکھتا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کے عینک کے شیشوں کی وجہ سے اس کوئش کی طرح خوب پھیلی ہوئی لگ رہی تھیں، جو پوری دنیا میں آگے پیچھے ہوتی ہوئی تیر رہی ہو۔ اس کے پیچھے ایک سناٹا تھا اور ایک چیخ، روشنی کے پاس پر، تھوڑا سا صابن اور ایک کھڑکی تھی جس پر لیس سے مزین آدھے پردے تھے، جو پرانے ہونے کی وجہ سے پیلے ہو رہے تھے۔ دیوار پر ایک ارغوانی رنگ کا مقدس دل تھا، ایک کلاب جیسا تاج، اسی کی دیانی کی پوسٹ کارڈ پیچھے کے ذریعے دکھائی جانے والی مریم خوب صورت عورت، جس کا ایک ہاتھ کلیجی کی شکل والے بادلوں کے پیچھے پر تھا، اس کا دوسرا ہاتھ انگلیوں سمیت اس کے بڑھے ہوئے کندھے پر پوری طرح سے پھیلا ہوا تھا اور وہاں صاف ستھرے دھاگے میں ایک خبار کی شہرت کو کلپ کیا گیا تھا۔ "چین کے میزکرلی کا کہنا ہے کہ ایک متحدہ آئرلینڈ اور Trieste کی کی ملیت ہیں۔"

وہ جانوروں کو تبلیغ کرتے ہوئے آرلیوس کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔۔۔ ایک اداس سے ستار کے تار بجے، میں نے سے تنتے ہوئے سناٹا اور شاں شاں کرتے ہوئے ان چاپ کے ساتھ ایک بوڑھا سنگھا آیا، وہ اپنے سینگوں کی شاخوں والے درخت کے ساتھ، شان دار لگ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں ایک کاہن جیسی تمکنت تھی۔

اس نے شانتی کی سرخ گائے کے اوپر آرفیوس کو ظاہر کیا، جس کے نیچے پوری دنیا زمین کے اندر درختوں کی جڑوں میں سے ہو کر آ رہی تھی۔ شیطانی صفت والی مٹی کا بنا ہوا ایک تمباکو سے بھرا چھوٹا پائپ، سرخ ٹیوا والی ایک نالین، جس کی تیلی سے سلگایا گیا اس پر ایک بیضوی بنی ہوئی تھی اور اس پر ریچھوں اور گندم سے بنی بادشاہ ابرتوں کی تصویر چسپاں تھی۔ پائپ پیتے ہوئے اس نے اپنے گھٹنے کو تھپتھپایا۔ اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ کٹ ابرتو میں کو بیٹھ کر ہلکے کی طرف دیکھا دیا۔

جاس کہتا ہے میری بیوی جیرس میں مسلسل کالوسے کی تلاش میں لگی رہتی ہے۔ وہاں آرفیوس کے پاس ایک چوہیا تھی، جس کے بچوں کی جھلی اس کے منہ میں تھی، تھا روڈیکس کے پتے کو چباتے ہوئے، جھاڑی پیتا ہوا ایک چیتا، اپنے بچوں کے ٹی چیتے ہوئے گھنے یوں کا ایک جوڑا۔ جاس کی انگلیاں انگشتریوں سے بھری پڑی تھیں، سر میں کافی بڑے قطروں کے چھینٹے اس کی آنکھوں کے حلقے میں نظر آئے۔ اس نے زمین پر رہتے ہوئے، بید جیسے درخت کے مڑے ہوئے پتوں کے بارے

میں بات کی، اس وقت تک جب تک کہ ان کا رخ نیچے چیس کی طرف نہیں ہو گیا۔ تخلیق کے بارے میں اس نے کہا کہ ہمیں شعری فضاحت (عمدگی) کی وجہ سے اس کے بارے میں کوئی خاص پتا نہیں۔ لیبو کا کاں پتھے کے پر پر پھیلا ہوا ہے جیسے سمندری خرگوش کی گوں رتیں۔ حد اعظیم ہے۔ اس کے علاوہ ایک نئے کی ہاتوی کا مشہور ایک قسم کا نہ پانی ہے اور ان کے سارے فریموں میں چھی میں جوشاں دار تصویریں ہیں وہ کسی مرغی کے نقش پا کی طرح ہیں۔

ہماری ٹرین بلیو اور ڈھونٹ پا سے جا رہی تھی جو بارسلونا میں تھا۔

جیسے ایک عورت ایک بنانے کے لیے اس کے ہوا کو کھینچتی ہے۔ جاس کو رہا تھا بادشاہ کے کاموں کے سفید گھوڑے جھاگ سے آلودہ دانتوں کو کھینچتے ہوئے اور جنوری کے موسم والے خراقیوں میں چٹان سے بجلی کے کڑکے کی طرح ٹکراتے ہوئے ہوئے۔ وقت اس وال کی طرح رہیں پر مارتے ہوئے، دھول، آسمان اور بوٹ پیسب کیسے تھے۔ تو ہانی ایک ایسی آواز ہے جو غار اور عوامی گھر تک ہر جگہ یکے بعد دیگرے ہو رہی ہے۔ اور اس پانی یوں میں گنگی کرنے کے لیے اپنے ہیت میں ایک آمیز رکھتا تھا۔ سکندر نے نیو یا کارل شیشے میں سے اپنے نیلے دانت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے فری آ کو بار ٹینی شان و شوکت کے لیے چالیس گلہریوں کا کچلا ہوا دیا تھا۔

ابلیس گارا کو پنا پاسپورٹ دکھا رہا تھا جو کہ کنڈلہ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ کنڈلہ اور کارڈے ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشی کی۔ ابلیس نے ریک سے اپنا ہیٹ اٹھایا اور پہن لیا۔ وہ سامان کے ڈھیر کے اوپر بیٹھ گیا۔

اس نے کہا: "Je ne suis pas Balzac"

ہم برطانیہ کی پیلی چھتوں سے اور گوداموں کے پاس سے گزرے

Ni Michel Larionoff

جاس کہہ رہا تھا وہاں پچھلی نیلی ٹن، دوارسوں، بکری جیوانوں اور بیپ کی چھیوں کو ایک کیمیائی عمل سے گزرتے ہوئے سمندر میں پھوری تھی۔ انگوزیوں کے جھنڈ سے اور قمری بیسوں میں سے دیکھ رہی ہے اور سب کے لیے وہ کہتا ہے "Il'ny a que lhomme qurest mmowde" ٹرین میں کتنی پیپو کا شیر، راس میکوش کا بیچا راس تھا ری بھی پیدا ہوا تھا۔ اس کے کتنے دیوداروں نے اماین کارپوڈی رماتا کے سطح ڈبوں پر اچھل کر ان کے دانتوں کو بچاتے ہوئے حملہ کر دیا تھا۔

اس کے چیتوں کا خود اپنا ڈیزائن تھا۔

جب ہم ایک لمبا موڑ مڑے تو میں دیکھ سکتا تھا کہ ہمارا انجن ایتھوپیا کے شاہی معیار کی نمائندگی کر رہا تھا۔

وہاں سرخ، پیلی اور سبز تین دھاریوں پر مبنی پانچ رنگوں والے ستارہ داؤدی کے سینے پر سرخ والا تاج پہنے ہوئے ایک شیر بنا ہوا تھا۔ وہاں پر قطعی زبان میں لکھا ہوا تھا: ہمدا مائی ساحل سمندر کی ویران اور کٹی پھٹی پہاڑیوں کے قریب سے گزرتے یہ جملہ ایسے لگ رہی تھی جیسے ایک پرانی دیوار پر بدروحوں کی تصویروں کے نقش ہوں۔ وہاں ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو چیٹی نامی کالی ریت کے کھنکتے سرخ پتھروں والی پہاڑیوں کے بارے میں سوچے بغیر، وادی کل کی پہاڑیوں کی ویرانی کو دیکھ رہا ہو۔

وقتاً فوقتاً ہم بور کر دینے والے تیل سلائی کے ڈبے سے چند قدیم بارٹوں کے لمبے مرد اور تکنیکی کی سنگ دل قبائلی آواز کو سن سکتے تھے۔

پتھلے گرد آلود شیشوں، پیکلیشوں اور رنگین جھنڈوں پر رہے تھے اور ان بازوں اور دیواروں سے پرے جو باغات ہم دیکھ رہے تھے وہاں پر بھی۔ ایک خواب کی طرح بارسوتا سے باہر ہم نے ایسے جانوروں کو خود چھوٹوں کے درمیان اپنے اصل نشانات کے نظارے اور اپنی جھروں اور رکاوٹوں کے ساتھ دیکھا۔ اس کی تیلی بھی ہاتھوں پر بنی ہوئی تھی۔ اس کا تکیوں والا تاج، سرخ سنگ شب کا بکسوا اور اس کے خوبصورت بال تھے۔ وہ تھو (درخت) کے قریب سوت سے پانی نکالنے میں مشغول تھی۔

روویگن، جس نے صاف طور پر کہا، جیسے اس نے ڈبے کو مخاطب کیا ہو اور تھکی ہوئی زمین اپنے ہیٹ پر ایک پرندہ اٹھائے اور گندم والا ہاں اپنے دانتوں میں لیے چیں کے لیے روانہ ہوئی۔ گیٹ ہاؤس کے باہر، جب اس کی نزین نے اسے اور ابو ہاں آ کر دیوال پر بورین کے ساحلوں سے نیچے کر دیا تھا، جب ہم سب پر اوسٹ کی چھتری کے قریب تھے تو جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ انھوں نے لوویں کی لائبریری کو جلا دیا۔ گراسیاں حدانی کی ایک مثال ہے تو پھر خدا کے نام پر یہ سب کیا تھا؟ مشاقی اور مہارت کے ساتھ اس نے ٹرشل واٹر ہوائیج سے نکالا۔ اس کے مددگار نے، جو شاید اس کا بیٹا تھا، بچوں کا طرز پہن رکھا تھا اور پیدائشی بھی پہن رکھا تھا، جس نے اس کے سر کو Thoh کا بنا دیا تھا، جس کی چونچ تھی اور جس پر پیوست شدہ آنکھیں تھیں۔ ہم Genoa

میں ایسے نقش و نگار تھے جو پتھروں کی بنا پر بنے تھے۔ قلعے جیسی لمبی دیواریں جیسے کہ پینٹنگ کی تھیں، اپنی صدیوں تک ایسے پوشیدہ رہے بھری پڑی تھیں، جن پر کانٹی دار انگلیاں، بن رائو، مسولینی، شو دیکس، فاشسٹ طاقت اور Giovanezza کی طرف مارچ کرتی ہوئی جھلکیاں اور بلند کے دکھائے گئے تھے وہاں پر سلیٹی رنگ کی دیواروں کے اوپر، درختوں کی شاخوں کے سب سے اوپر والے حصے دکھائے گئے تھے اور ہم میں سے بہت سوں نے اپنے تصور میں ایسے باغوں کو، جن میں گئے اور ایسی کھلی چھتیں تھیں، جن میں وہ گرے ہوئے تھے، دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

زمین میں کسی جگہ پر فاتح شیر کی طرح، تلوار پر اپنے ہاتھ رکھے، وہ دیوتا تھا۔ چوڑے، بردار سرخ رنگ کے بے آستین لبادوں میں ننگے پاؤں، جن کے گرد کھڑے تھے۔ جن کے قریب ایک پادری، جس نے سفید ہیٹ پہن رکھا تھا، مسلسل ایک کتاب سے پڑھے جا رہا تھا۔ اگر کوئی شخص ان الفاظ کو سننے کی کوشش کرتا ہے تو اسے ان میں صدائیں ملتا، جو باقی تھی، اس سے بنی کرسی پر بیٹھی تھی اور جس کے گرد عسل والے دیوتا تھے۔ وہ ایک ایسی عورت تھی، جس کا ذہن روشن اور خون سرخ تھا۔ ان میں صوروں والے گھر میں موجود سیمان کاپیاں تھا، جو ایسے پتھروں سے بھرے صحرا سے آگے واقع تھا، جس میں سے گزرتے میں چالیس سال لگ سکتے ہیں۔ پادری کے الفاظ کسی میووں کے باغ میں موجود شہد کی مکھیوں اور کسی مقدس شہر میں گھنٹی گھنٹیوں جیسے تھے۔ وہ پرانے سانپوں، زیر زمین دیوتاؤں، ہر پتے پر جمی ہوئی ظلم والے جنگلوں، اسی دوران ناگیں جہازوں اور درویشوں جیسی جھنجھناہٹ والی اونچی آواز میں پڑھ رہا تھا۔ جاسن سن رہا تھا۔ یہ سارا کچھ ایسا ہے جیسے ایک اہل جیسے شاعر دریائی کنارے کی اونچی بیچ سے بیچ کر ہم سے ملاقات کرنے آ رہا ہو۔ باغ میں موجود لیڈی ایسی ہے کہ جیسے اس کے چراغ کی بتی ساری کی ساری کانوں کی طرح ہو۔ اس کی کنوارپنے کی آنکھ میں ایک سانپ ہے، پلکوں پر شبنم اور شبنم کے نیچے میں ایک میوہ ہے۔ کیا کوئی اس لوٹی زمین پر ایسا شخص موجود ہے جو انجیلہ کا نام جانتا ہو؟ بادشاہ کا کونسل جوڑ چلایا "نگر جانسن سوئی۔"

اس نے کوئین نینگ سے منطقہ ختم ہو کے گارڈ یا سوں کے وحشی پیدل فوج کے سارنگوں کے بیچ میں سے اپنا راستہ بنایا، جنھوں نے موٹا لباس اور اندر سے گودے کی طرح نرم ہلکوں کے ساتھ چوغے پہنے ہوئے تھے

میں نے انجیلہ ہیرا نینگ جل کے بارے میں سوچا، جو ہلیورج میں سٹیپ ہاؤس ماؤ تنین کا

ایک ٹیل میا موڑ مڑ کر نیچے آتے ہوئے سیٹی پر ہیرنگ گریس کی دھن بجایا کرتا تھا۔ میں نے موسم بہار کے آغاز میں کھلتے ہوئے چائنا ویلی کی تیز میٹھی خوشبو کو یاد کیا۔

جانس نے باتوں میں ہو کر ڈانس کرتے ہوئے، ایک پیلے لباس والے آرلیوس کا ذکر کیا، جس کے پیچھے چیتے، میدان، رنگ کی کانے والی چڑیا اور شیر آ رہے تھے۔ اور اس نے ایک آرلیوس کو سمندر میں موجود گہری وادی میں بیٹھے ہالے میں آبی سانپوں کے گلے ہوئے، سوا سٹیکا شارٹس، چھ آنکھوں والی فاختہ، مچھلیوں، پرندوں، سمندری ملے کو سب جیلی سا بیڈی چند اس، سرخ کیکڑوں اور چاند کی طرح کی پرانی انگریزوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

"بالکل نہیں!" ایلیس نے بے خیالی سے کہا۔

جانس نے کہا کل مجھے، ارچو بیا، سفید ناخنوں والی رنگی چاں چلتی دھند میں Prests Prests edelicatamente، کڑکڑ کرتی مرغیاں، تجید ہوئی ریشیاں بجاتے تا پھر۔

La Belle Jardiniere ہم نے اسے دیکھا وہ میڈرڈ میں پھول، کارن میری گوندھ، سورج در تنگے، عظیم پہاڑی گھاس چوس اور سفید جنگلی Campions بیچ رہی تھی۔ اور یہ میں وہ چڑیوں کی طرح چہک رہی تھی۔ جب ہم اس کی گلابیوں سے آگ چھڑاتے ہوئے اطالوی سے گزر رہے تھے وہ (سوتھے) چوبیہ میں تھی۔ جانس نے کہا دیا یہ castellum ہو گا جہاں ایک اندھیرے kerker میں بالی نامو پر تبصرہ کرتے ہوئے گرف، اپنے دو جوان بچوں کے ساتھ موجود تھی جیسے جونس اور آنکھ کے زخم کے ساتھ ایک مکمل خاتون کی طرح اس سرس کی مانند اندھیری رات کو روشن کرتے ہوئے اپنا راستہ بنایا۔ جس نے مکمل ہنگر کے اوپر کھاری میں موتی کو رکھ دیا تھا اور انھیں اغوا کر لیا جیسے کہ وہ سوا تھن اور ستاروں کے بے پہ قد جھار تند Dawidh کو بیٹھا رہے تھے۔ لیکن قصبے کے دھندلے اور ڈور پوسٹ پر پنی بڑھی میں موتی آ جانے سے پہلے نہیں۔ مگر یہ ایلیس ہمیں چونکاتے ہوئے چیخا۔ Ypres میں کوئی گلہ بان نہیں تھا۔ اس وقت ہمارے پاس کوئی چرواہا نہیں

ہم دیوار کی طرف واپس آتے ہوئے نارمنڈی کے باغوں کے قریب سے گزر رہے تھے۔

ہمارے آگے، ہمارے پیچھے ٹرین میں کئی ہیل سلائی اپنے تابوت میں لیٹا ہوا اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ، اپنے شاہی ڈبے کی چھت میں سے ٹرانس گلم میں ڈبی سنہرگا اور جوان سورجوں کو دیکھ رہا تھا، جن میں سے ایک اورنج ہے اور دوسرا امبر۔

آشدانت کارتا مہاراجا

وان بیورن اور دیہاتی لڑکی

یہ واقعہ میسر ہامر کی ایک تند ہواؤں سے لدی خزاں زدہ شام کو پیش آیا۔ میں راستہ بھول گیا تھا اور مجھے وایس سٹریٹ کا پتہ پوچھنا پڑا۔ میں اس شخص کے جواب پر تنہا ان روئیوں کو اس نے میرے سوال کا جواب انڈونیشی زبان ہی میں دیا تھا۔

"اس طرف جناب۔" وہ اتنا مہذب شخص ثابت ہوا کہ اس گلی کا راستہ بتاتے ہوئے وہ دفعتاً میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ وہ جگہ اس جگہ سے، جہاں ہماری ملاقات ہوئی تھی قریب ہی تھی۔

وہ تھا تو ناتواں مگر اس کا قد قدرے چھوٹا تھا۔ تند ہوا کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے بار بار اس کے ہاتھ اپنے پیٹ کی طرف بڑھتے تھے۔ اس کے پیٹ کی طرح اس کا اوورکوٹ بھی خاصا گندا اور پرانا تھا۔ اگرچہ میں اس کا چہرہ واضح طور پر دیکھ نہیں پا رہا تھا لیکن اس کے میٹھے لہجے اور گفتار کی نرمی نے میرے دل کے گوشے میں اس کے لیے پسندیدگی کا تاثر پیدا کر دیا تھا۔

میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے بتایا کہ انقلاب کے زمانے میں وہ انڈونیشیا ہی میں تھا۔ اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے ڈالی اور یوں ہم نے آئندہ ملاقات کا وقت طے کر لیا۔

تین دن بعد ایک سہ پہر کو یہی ہماری ملاقات کا طے شدہ وقت تھا۔ میں نے اس کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اس نے خود آ کر دروازہ کھولا اور پھر ہم فوراً ہی تیسرے فلور پر جانے کے لیے بوسیدہ سی سیڑھیاں طے کرنے لگے، جہاں وہ ایک ایسے کمرے میں رہتا تھا، جو ایک تنہا شخص کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کافی تھا۔ درحقیقت یہ ایک نہایت سادہ سا کمرہ تھا، مفلسی کی بہترین تصویر جس میں صرف تین کرسیاں، ایک میز، ایک ڈریسر اور ایک دیوان تھا، جو شاید بیٹھنے اور سونے کے مقاصد بیک وقت پورے کرتا تھا۔ یہ سب چیزیں نہایت خستہ حالت میں تھیں۔ کمرے کا سارا حسن بے ترتیبی کا مظہر تھا۔ کتابیں یہاں وہاں بکھری پڑی تھیں۔ شطرنج کے مہرے اسی حالت میں میز پر پڑے تھے، جس حالت میں پچھلی بار ختم ہونے والی بازی کے وقت چھوڑا گیا تھا۔ کھڑکی کے قریب ایزل پر ایک

نامکمل تصویر موجود تھی اور نیچے فرش پر پینٹ کی ٹیوبیں اور برش وغیرہ بکھرے پڑے تھے۔

"اچھا تو آپ مصوری کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس وقت گزارنے کا ایک مشغلہ ہے۔" اس نے کونے میں پڑی کرسی کو کھینچتے ہوئے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

اب اس کمرے کی روشنی میں، میں نے اسے دیکھا تو اس کے متعلق پہلی ہی ملاقات پر قائم ہونے والا میرا تاثر بالکل صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ بے شک وہ عام لوگوں سے سست مگر دوستانہ اور بہت غیر روایتی رویے کا حامل ایک شخص تھا۔ وہ میرے کے ایک طرف پڑی اپنی حل کی گئی پینٹنگز کے بھیر میں سے ایک ایک کر کے مجھے تصویریں دکھاتا رہا۔ اس کی تصویروں کا سٹائل جدا سا متنوع تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ تصویروں کے ذریعے اپنی شخصیت کے اظہار کو پانے کے لیے، وہ ابھی تک مختلف قسم کے تجربات میں لگا ہوا تھا۔ ایزل پر موجود تصویر میں ایک پہاڑ کے دامن میں وہاں کے کھیتوں کا ہینڈ سیلپ نظر آ رہا تھا۔

"ایک خوب صورت ملک ----" اس نے تقریباً بچی ہوئی ایک پینٹ ٹیوب اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد میں، اس نے بتایا کہ وہ ابھی تک مغربی جاوا کے خوب صورت پہاڑی ماحول کو نہیں بھولا۔

"اے کاش میں پھر ایک بار وہاں جا سکوں ---- کیا میں پھر کبھی ان اونچے خوب صورت پہاڑوں کی ڈھلانوں پر موجود چائے کے باغات میں گھوم پھر سکوں گا؟ کیا میں وہاں کا مخصوص رنگین لباس پہنے ہوئے، وہاں کے دیہاتی گیتوں کے گیت اور قہقہے سن سکوں گا؟ کیا میں انھیں چائے کی پتیاں چنتے ہوئے دیکھ سکوں گا اور پہاڑوں کے دامنوں کی فرحت بخش ٹھنڈی ہوا میں ایک بار پھر سانس لے سکوں گا؟"

وہ پرانی یادوں کی شدت سے مغلوب ہو کر جذبات کے سمندر میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

"کیوں نہیں ---- ایسا ہو سکتا ہے۔"

وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھا کسی قدر اداس لگ رہا تھا۔

"میں اس خوب صورت دیہی علاقے کو اس طرح پسند کرتا ہوں، جیسے وہ میری جنم بھومی ہو۔ یہ بات بہتر طریقے سے میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"اچھا ---- وہ کیسے؟" میں نے پوچھا

"یہ سب کچھ محض اس لیے نہیں کہ وہاں کے پہاڑی سلسلے بہت شان دار ہیں کیوں کہ آپ

جانتے ہی ہیں کہ سوئٹزرلینڈ کے پہاڑی مناظر بھی غیر معمولی طور پر خوب صورت ہیں مگر پھر بھی ان میں وہ خاص بات کہاں جو انڈونیشیا کے پہاڑی علاقے میں ہے۔"

میں مسکرایا کہ شاید وہ مجھے بنانے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔

"سچی بات یہ ہے" وہ کہتا چلا گیا "اصل میں مجھے وہاں کے سادہ اور مخلص لوگوں سے محبت ہے یہ وہ احساس ہے جو وہاں کی ہر چیز کو خوب صورت بنا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک صحرائی علاقے میں یہ بلند اور فضول سی جگہ محبت میں بھیگے ہوئے شخص کے لیے ایک نخلستان کی طرح کیسی ہو سکتی؟"

اس نے اپنے مشغلے کا اعادہ کرتے ہوئے اپنی کہانی جاری رکھی اور مجھے بتایا کہ "انقلاب کے وقت وہ ایک میچ کھیل رہی تھی اور اسے ایک خاص عرصے کی قید کی سزا ہوئی تھی اور پھر بعد میں وہ اپنے ملک واپس آ گئی تھی اور اس لیے کہ اس نے ان معصوم لوگوں پر خواہ مخواہ کوئی چارہ سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا جرم محض یہ تھا کہ وہ آزادی سے جینے کی خواہش رکھتے تھے۔"

"سگریٹ میں" اس نے پتیاں منقطع کرتے ہوئے کہا "میں خود سگریٹ نہیں پیتا میں تو اس کی عادی ہوں۔" اس نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب سے ایک پیپر نکالتے ہوئے کہا۔ وہ ایش ٹرے اٹھانے کے لیے ذرا سے کے پاس گیا اور پھر گویا ہوا "میں اس ایک واقعہ کو بالکل ہی برداشت نہ کر سکا وہ بے حد تکلیف دہ تھا۔ بنڈونگ کی دو گھنٹے میں ایک شام کو میں نے سپاہیوں کو سائیکل پر وہاں سے گزرتے ہوئے ایک لڑکے کو روکتے دیکھا۔ بغیر کسی وجہ کے انھوں نے اس بے چارے کو پکڑ کر سڑک کے کنارے کر دیا اور پھر اسے بجلی کے کھمبے کے ساتھ سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دیا اور پھر اچانک سپاہیوں میں سے ایک نے اپنی تلوار نکالی اور اس لڑکے کے جسم کو اس بے دردی اور شدت سے چیر کر رکھ دیا کہ تلوار کے کھمبے کے ساتھ ٹکرانے سے چنگاریاں سی برآمد ہوئیں۔ ذرا سوچو بغیر کسی وجہ سے اس بے چارے لڑکے کو صرف اس لیے مار دیا گیا کہ اس کا تعلق اس قوم کے ساتھ تھا، جو آزادی کے ساتھ جینا چاہتی تھی۔ صرف چند لمحوں میں وہ لڑکا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور کسی نے اس کا نوٹس نہ لیا۔"

اس بیرے (جس کا نام تھا) نے یہ کہانی خاصی بے مزگی مگر نہایت سکون سے سنائی تھی وقفے وقفے سے وہ پائپ کے تمباکو کی راکھ ٹرے پر گراتا رہا۔ پھر گھنٹی بج اٹھی۔ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا اور ایک لمحے بعد ایک اجنبی اندر آ گیا۔ وہ گہرے نیلے رنگ کے نہایت عمدہ سوٹ میں ملبوس ایک انڈونیشین تھا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا چھوٹی سی ناک اور ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں والا شخص تھا، جو بڑی

بے چینی سے مسلسل حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کا سر آدھا گنجا تھا، جس سے اس کی پیشانی کی اونچائی غیر معمولی دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنی حرکات و سکنات سے روسی اور جعلی سا دکھائی دیتا تھا، جیسے وہ اپنے آپ کو کسی شک و شبہ سے بالاتر رکھنے کی کوشش میں نہایت بھونڈی اداکاری کر رہا ہو۔ اس نے وان بیورن کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا اور مجھ سے ملیے بغیر جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے واپس چلا گیا۔

"ایک پرانا ملاقاتی"۔۔۔۔ وان بیورن نے مجھے دوبارہ بیٹھنے کے لیے کہتے ہوئے بتایا "وہ صرف دو دن پہلے مڈغاسکر سے آیا ہے۔ اصل میں، میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتا۔"

اس وقت سے لے کر میں نے اس شخص کو وان بیورن کے گھر پر کئی موقعوں پر دیکھا۔ میں حیران ہوتا تھا کہ اس شخص کا رویہ اتنا عجیب اور پراسرار کیوں تھا۔ اس کا اندازِ گفتگو دوستانہ نہیں تھا۔

ایک سہ پہر کو وان بیورن نے یہ کہہ کر ایک بار پھر مجھے اپنے گھر بلایا کہ اس کے پاس میٹھی شیری کی ایک بوتل بھی ہے جو مجھے بہت پسند تھی۔ اس نے بتائی ہوئی تصویر بہت اچھی تھی حالانکہ یہ وان گاگ کی محض نقل تھی۔

اس نے شیری کے گلاس بھرتے ہوئے کہا "آپ اس علاقے کو جانتے ہیں؟"

"بے شک"، میں نے جواب دیا "یہ جی پاماس" ضلع ہے بہت بڑے گیدھی آتش فشاں کے پیچھے۔"

"ہاں میں بھی اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میرے عزیز آپ کی صحت کے لیے۔" اس نے اپنا شیری کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بالکل یہی الفاظ آپ کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔ ہم پینے لگے۔

"آپ یقیناً یہاں کے رہنے والوں کے بارے میں جانتے ہوں گے؟"

"نہیں۔۔۔۔ میں نے تو بس یا کار کے ذریعے بنڈونگ جاتے ہوئے ایک نظر اس علاقے کو دیکھا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں۔"

"آزادی کے بعد اب ان لوگوں کی زندگی کیسی ہے؟"

"بہت اچھی۔" میں نے جواب دیا

"اگر ایسا ہے تو خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔۔۔۔" ایک لمحے اس نے کچھ سوچا اور پھر پوچھا

"آپ کی سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

میں نے فوراً جواب نہ دیا تو اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں وہاں کے کچھ لوگوں کو جانتا ہوں۔۔۔۔ مثلاً کسان، مزدور اور چائے پینے والے۔ یہ آپ کے خیال میں وہاں کے درخت کاٹنے والے کارکنوں کی تنخواہیں ان کی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ ان میں سے بہت سے غذا کی کمی کا شکار ہیں۔ اس طرح کی غذا تو آدمی کو خاموش نہیں رہنے دیتی۔۔۔۔ ہے نا؟"

میں ابھی جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔

"ارے یہ اس وقت کون آن مرا۔" وان بیورن نے کسی قدر ناراضگی سے کہا۔

اس نے دروازہ کھولا اور کسی کو اندر آنے کے لیے نہ کہا حتیٰ کہ خود دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے اس کے قدموں کی آواز بتدریج کم ہوتی گئی اور تھوڑی دیر بعد خاموشی سی چھا گئی اور پھر سیڑھیوں کے نیچے سے تند و تیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میں تجسس سے زرد ہو گیا۔۔۔۔ کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟

"وہ بہت بے شرم ہے۔" وان بیورن کمرے میں داخل ہوتے وقت بڑبڑا رہا تھا۔ "ایک شخص جس کا اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ جو بے کردار اور بے اصول ہے۔"

میں نے اسے بھرا سا کاٹ دیا۔ یہ واضح تھا کہ جس شخص کے متعلق وہ ایسے کلمات ادا کر رہا تھا، وہ اس کا وہی عمدہ لباس پہننے والا مشکوک اجنبی ملاقاتی تھا۔

"یہ میں آپ ایسے شخص کے بارے میں کیا کہیں گے۔" ۔۔۔۔ میں 1974 میں انڈونیشیا میں پہلے مارشل لا پیس کیشن کے تھوڑی دیر بعد اسے جنوبی جیل خانے میں ملا تھا۔ ابھی دنوں ایک ہفتے پہلے میں اسے بھولا نہیں۔ ہاں ایک ہفتے پیشتر جب مجھے جیل میں ڈالا گیا تھا وہ مجھے کسی "خدمت" کے بارے میں بتانے آیا تھا جو کہ اس نے اپنے لوگوں کے لیے سرانجام دی تھی۔"

جب اس نے اپنی بات ختم کی تو صرف اسی وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ لفظ "خدمت" کس طور پر ادا کر رہا تھا۔

"ایک پورا گاؤں راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا۔ اور وہ تمام پندرہ گوریلا سپاہی جو کہ ایک لمبے مارچ کے بعد کسی تانگے میں جتے ہوئے گھوڑے کی طرح تھک کر چور ہو چکے تھے، ذہن آرمی کا تر نوالہ بن

گئے تھے۔ وہ بہت صحیح تھا اور حملہ بالکل اچانک ہوا تھا۔ ہوٹل بھی نیچے سے تمام کے تمام مارے گئے۔ یہ تھی اس آدمی کی "خدمت" جو اس نے اپنے ہم وطنوں کے لیے سرانجام دی۔"

یہ سب کچھ کہتے ہوئے وان بیورن کمرے میں بیٹھے رہا وہ کھڑکی کی طرف گیا پھر اس کھڑکی کی سل پر خالی کر کے وہ شیری کے گلاس بھرنے کے لیے ڈریسر کی طرف بڑھا اور پھر اپنی کرسی کی طرف واپس آ کر، وہ اس کی سیٹ پر اپنا دایاں پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اور کیا آپ کو معلوم ہے" اس نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا، "ایک اور موقع پر وہ مجھے یہ بتانے آیا کہ اس کی "خدمت" کے عوض اسے انعام کے طور پر ایک اچھی پوزیشن دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ میں بہ مشکل ہی اس کی باتوں کا یقین کرتا تھا مگر اس کی کہانیوں مجھے بری لگتی تھیں" اور ان الفاظ کے ساتھ ہی وان بیورن نے نہایت شدت سے پائپ پینا شروع کر دیا حالانکہ اپنی باتوں کے دوران میں اس نے بہت کم پائپ اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا۔

میں نے اس سے آج کے تازہ واقعے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا

"کل اتفاق سے لیڈز چیلین کے نزدیک ایک چھوٹے سے کیفے میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ معمول کے مطابق وہ اپنے ہمراہ ہوں خصوصاً عورتوں کے بارے میں اپنے تعلقات کے افسانے سنا سنا کر بور کرتا رہا۔ میں اس حد تک اس سے نالاں ہو گیا کہ میں نے برملا اس سے کہہ دیا کہ میرے لیے اس کی وقعت ایک پیسے جتنی بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ناراض ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج وہ مجھے یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ اگرچہ میں اسے بہت معمولی اور گھٹیا آدمی سمجھتا ہوں لیکن دوسرے لوگوں کے نزدیک وہ ایک معزز اور قابل فخر شخصیت ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے مجھے ایک نیلی گرام دکھایا جو اس نے ابھی ابھی جکارتہ سے وصول کیا تھا۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے!"

"وہ کس بات پر فخر کر رہا تھا؟" میں نے کسی قدر محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اسے اس نیلی گرام کا فخر تھا جو اسے ملا تھا۔"

"لیکن کیوں؟"

"آپ یقین نہیں کریں گے۔۔۔۔ یہ نیلی گرام اس کی سیاسی پارٹی کی طرف سے بھیجا گیا تھا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ آئندہ ہونے والے الیکشن میں اسے پارلیمنٹ کی سیٹ کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا ہے۔"

"کیا؟"

"کیا آپ یقین کر سکتے ہیں؟"

میں نے تیزی سے سر دوہرا ہوتے ہوئے سر ہلایا۔ کچھ دیر اپنے خیالات میں گم رہ کر وان بیورن پھر بولا

"ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ہمارا ملک ان جیسے لوگوں کی وجہ سے آنے والی تباہی سے محفوظ رہے گا۔ آپ کے ہم وطنوں کی مسرتوں کی خاطر" اور اس نے اپنے خیالات میں ایک بار پھر کھونے کے بعد کہا "خاص طور پر میرے ننھے بچے کے لیے"

میں یہ سن کر ششدر رہ گیا۔

"آپ کا لڑکا؟ کیا مطلب ہے آپ کا۔"

"ہاں میرا لڑکا۔۔۔۔میرا بچہ"

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ ایک بچے کے باپ ہیں؟"

"ہاں میں ننھے جوزف کا باپ ہوں۔ وہاں اسے یوسف کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ میری دعا ہے کہ وہ زندہ ہو۔۔۔۔" اور جب وہ پھر ڈریسر کی جانب گلاس بھرنے کے لیے گیا تو میں ابھی تک حیران تھا۔

وہ کہنے لگا "اس کی ماں کا نام ستی تھا۔۔۔۔نہایت اچھی دیہاتی لڑکی۔۔۔۔اپنے برتاؤ میں نہایت سادہ اور مخلص۔۔۔۔ اور اپنی معصومیت کے لحاظ سے نہایت خوش باش۔ جیسے اس طرف کی اکثر پہاڑنیں ہوتی ہیں یعنی ان پڑھ نوجوان عورتیں۔ وہ چائے کے باغ میں کام کر کے اپنی روزی کماتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے جب میں ڈچ جیل میں پڑا تھا وہ ایک بم کا شکار ہو گئی۔"

"مار دی گئی؟"

"ہاں اسے ایک کتے کی طرح مار دیا گیا۔ اس کو دشمن کا ساتھی ہونے اور جاسوسی کرنے کے الزام میں یہ سزا دی گئی۔"

وان بیورن نے اپنا گلاس ختم کیا اور غالباً ایک بار پھر ان میٹھی اور تلخ یادوں میں کچھ لمحوں کے لیے کھو گیا "لیکن حقیقت میں" اس کی آواز اب غم اور جذبات سے بھاری ہو چکی تھی "کیا اس دیہاتی عورت کو انقلاب اور سیاست کے معنی آتے تھے؟ وہ اتنی سادہ تھی کہ وہ کسی جرم میں شریک ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ پارلیمنٹ کی سیٹ کی امیدوار بھی نہیں تھی۔ کیا وہ تھی؟ لیکن ہاں میں بھول رہا ہوں، میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ اس کا ایک بچہ تھا اور وہ میرا بچہ تھا۔۔۔۔ ایک دشمن کا بچہ"

ملاچی واسیکر

میوزک باکس

ایک عورت اور ایک چھوٹا لڑکا ایک گاؤں کی گول پتھر سے بنی ہوئی ڈھلوان گلی میں جا رہے تھے۔ مسلسل تین میل تک چلتے رہنے کے بعد انھیں ایک ایسے شہر میں پہنچنا تھا، جہاں انھیں ایک مکان کی تلاش تھی۔ انھوں نے اس کا پتا شام کے اخبار کے ایک اشتہار کے ذریعے معلوم کیا تھا۔

عورت تقریباً پانچ فٹ قد کی چھوٹی سی نوجوان عورت تھی۔ اس کے پاؤں چھوٹے تھے اور ان پر اسے بہت فخر تھا۔ چھوٹے لڑکے کی آنکھیں بڑی بڑی سی تھیں، جن کا رنگ ماہگیر کا سا تھا اور کچھ سوچتی ہوئی اور خوفزدہ سی لگتی تھیں۔ اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ دونوں کے چہروں پر خوشی اور سنجیدگی کے ملے جلے تاثرات تھے..... انھیں کوئی خاص چیز ڈھونڈنا تھی۔

عورت کے خاوند کو ٹھیک سنوں ورلیٹ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس کی عمر اپنی بیوی سے زیادہ تھی اور وہ پتھر کی کان میں پتھروں کی ہاتھ چھانٹ کرنے پر ملازم تھا۔ اس کے بالوں کا رنگ ریت جیسا تھا کیوں کہ وہ سات دنوں میں ایک دن یعنی ہفتے کے روز ہی شیو بناتا تھا۔ اس لیے اس کی داڑھی اور قلموں کے بال خاصے بڑھے ہوئے اور چیک دار معلوم ہوتے تھے۔ اس کا چہرہ دھوپ کی حدت کی بنا پر سرخ سا لگتا تھا۔ وہ کھلے بدن پھرا کرتا تھا مگر اس کے جسم پر گوشت کم تھا اور اس کی آواز خاصی درشت تھی، جس میں ایک طرح کی غراہٹ بھی شامل تھی اور اس کا بیٹا اس کی آواز سے ڈرتا تھا۔

اس کی بیوی نے اسے کبھی اس کے اصل نام یعنی ٹھیک سنوں کے بجائے اسے کبھی پکارا تھا۔ نام لے کر پکارنا اس کے لیے ایک بھی جرأت کی بات تھی، اس لیے وہ اسے ہمیشہ کے لیے "ہیر" کہہ کر پکارتی تھی۔ شادی کے بعد ابتدائی ایام میں تو وہ صرف "وہ" کہہ کر بلاتی تھی یا "وہ" کہہ کر اور رہتا تھا اسے "میرے مالک" کہہ کر بلاتی تھی لیکن وہ میرے مالک کہنے سے کتراتی تھی کیوں کہ حقیقت میں وہ اس کا آقا ہی تو تھا۔ جب اس کا بچہ پیدا ہوا تو اس نے سکھ کا سانس لیا کہ اب وہ زیادہ بہتر طریقے سے اسے اپنا شوہر کہہ سکتی تھی۔

جب اس کا بچہ، جس کا نام اس نے جنی رکھا تھا، باتیں کرنے کے قابل ہوا تو وہ بھی اس

شخص کو اتنی دیر کہہ کر پکارنے کا یہ خاندان گاؤں کی قطار کے آخری مکان میں رہتا تھا۔ جہاں پکی سڑک پتھر کی گاؤں تک چلی گئی تھی اور اس سے آگے کچے میدان تک..... جب کبھی وہ چھوٹا لڑکا، بچوں کا کوئی عجیب و غریب کھیل کھیل رہا ہوتا اور اس کی نظر اس لحیم شحیم آدمی پر پڑتی، جو اپنی بھی ٹانگوں اور اپنے کھردرے کپڑے کی پتلون کو ادھر ادھر حرکت دیتا ہوا آ رہا ہوتا تو وہ اپنی ماں کی طرف یہ کہتے ہوئے دوڑتا [illegible] کا لفظ [illegible] ہوئے ہمیشہ ہی چغلی بہت ہی محسوس کرتا تھا۔

اس گھر میں اس آدمی کی عدم موجودگی کی صورت میں خاموشی اور سکون رہتا تھا کیوں کہ یہ شخص جب گھر میں ہوتا تو ایک بڑی کرسی میں، جس کی لکڑی کی پشت پر بکری کی کھال منڈھی ہوئی تھی اپنے جسم کو پھیلائے پڑا رہتا اور اپنے بیٹے کی طرف ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا رہتا وہ اپنے اس اظہار سے محسوس کرتا کہ اسے اس خاموشی اور آنکھوں میں ایک طرح کا سوال سا لیے ہوئے بچے کے بجائے موٹا تازہ ہر وقت شور مچاتا ہوا بچہ پسند تھا۔

لیکن بیوقوں کے متعلق سوچنے کی زیادہ فرصت نہیں تھی کیوں کہ دنیا میں اس کے علاوہ بھی کچھ اور دلچسپیاں تھیں..... [illegible] سنوارتے دھلاتے کا دن تھا۔ [illegible] جب بہت چھوٹا سا بچہ تھا تو اس وقت اس کی ماں اسے اس تہہ خانے میں، جو مکان کے بڑے کمرے کے نیچے تھا، ساتھ لے جاتی اس کمرے میں پرانی بیلوں کے بنے ہوئے چوکور پرانے طرز کا ایک برتن تھا، جس میں کپڑوں کے دھونے کے لیے پانی گرم کیا جاتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی جلنے والی لکڑیاں، پتوں اور کوئلے کی مدد سے آگ جلاتی اور تھوڑی ہی دیر میں بہت سا صاف ملا پانی گرم ہو جاتا اور جب وہ کچھ بڑا ہو گیا تو وہ اسے ایک بالٹی میں تھوڑا سا پانی دان دیتی اور کچھ نہ کچھ اسے بھی دھونے کے لیے دے دیتی۔ مثلاً دھبوں والے سرخ رومالوں میں سے ایک، جس میں اس کا باپ اپنا کھانا باندھ کر لے جاتا تھا، یا پھر اس کی اپنی ہی آسمانی رنگ کی سرخ لائنوں والی قمیص دے دیتی۔ اور وہ پتھریلے فرش پر نیچے جھک کر کپڑوں کو ملنے لگتا اور کبھی کبھی اس چھوٹی سی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا، جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ جب تھک جاتا تو اپنی ماں کو لکڑی کے بڑے سے بلاک پر بیٹھے ہوئے دیکھا کرتا، جس میں وہ کپڑوں کو خوب دھوتے ہوئے پانی نکالتی اور پھر زیادہ بہتر طور پر صاف ہونے کے لیے کپڑے دھونے والے برتن میں ڈال دیتی تھی۔

وہ اپنی ماں سے زیادہ دور رہنا کبھی پسند نہیں کرتا۔ وہی ایک ایسی ہستی تھی، جس کے ساتھ اس کو لگاؤ تھا۔ اس کے قرب و جوار میں اس کے کئی ہم جولی رہتے تھے مگر وہ اپنی عمر کے ان لڑکوں کے ساتھ

کھیلنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ہر اتوار کو اس کی ماں اسے چھوٹے پتھروں سے بنے ہوئے گرجا میں لے جاتی وہاں وہ لکڑی کی بنی ہوئی لمبی نشستوں پر بیٹھتے، جن پر لمبی جھالروں والی گدی پڑی ہوتی تھی۔ یہ نشستیں کچھ ایسی پھسلوان سی تھیں کہ بعض اوقات ان پر رکھا ہوا گدی پر بھی بھی آواز پیدا کیے فرش پر پھسل جاتا

گرجے میں ہر چیز مسرت بخش تھی۔ وہاں ایک بڑا سا ہنڈولوں والا فانوس لٹکا رہتا تھا۔ ان ہنڈولوں کو ہوا کے سہارے پر لگی، ایک موسیقی کے ذریعے جلایا جاتا تھا۔ یہ کبھی کبھار اس وقت روشن کیا جاتا تھا، جب گرجے میں اتنا اندھیرا محسوس ہوتا تھا کہ پادری لوگوں کو دیکھنے میں دقت محسوس کرتا تھا وہاں ایک منبر بھی تھا، جس کے دونوں طرف میں سیڑھیاں بنی تھیں تاکہ مبلغ منبر کی سیڑھیوں کی ایک طرف سے چڑھ کر دوسری طرف سے نیچے اتر جائے۔ ہاں اگر وہ ایسا کرنا چاہے تو ..... لیکن وہاں سب سے اچھی چیز وہاں کی موسیقی تھی۔

گرجے میں ان کے پاس بس صرف ایک ہارمونیم ہی تھا اور ایک مہربان چہرے والی بوڑھی عورت اسے بجاتی تھی۔ وہ جماعت کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتی تھی کیوں کہ اس میں خود آگاہی کی حس ہی نہ تھی۔ وہ گول سٹول پر جھک جاتی، جس کے کناروں پر اس کے سرخ کی بھاری چھنیں پھیل جاتیں۔ اس کے پاؤں پیڈلوں پر مستقل دباؤ ڈالتے وہ خوشی میں ہوا بھرنے کے لیے ایک یا دو بار انھیں حرکت میں لاتی اور موسیقی ہر طرف پھیل جاتی۔

ماں اور اس کا بچہ دونوں ہی اسے پسند کرتے تھے۔ وہ اونچی آواز سے حمد گاتے۔ تقریباً ایک ہی گیت تھا جو وہ اکثر گاتے تھے اور ہارمونیم ان کی آواز کے ساتھ بابا بابا کی آواز شامل کرتا تھا۔

ایک بار گرجے میں چائے کی دعوت تھی اور اس میں وہ موجود تھا نشستوں کے اب کے گھومنے والی لکڑی کی پشت سے ترتیب دیا گیا۔ گوشت سے بھرا برتن، سینڈوچ، مکھن اور ایک چھوٹے بڑے سائز کے پرانے میز پوش پر رکھے تھے جو عاریتاً حاصل کیے گئے تھے۔ ایک اونچی جگہ پر تانبے کا سماوار پڑا تھا اور میز کے اوپر عورتوں کے گھنے ہاتھوں کے سامنے چائے کے بڑے بڑے پیالے موجود تھے کسی نے گانا شروع کیا

"اے خدا ..... آ ہمیں اپنی قربت سے نواز"

اور تھکی ہوئی عورتوں نے اس گانے کو جاری رکھا

اور جیمز کا اس دن خوشی سے اتنا مغلوب رہا تھا کہ گھر پہنچ کر طور پر کھانا بھی نہ کھا سکا تھا وہ اس کو صدیوں پر بھاری محسوس کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ کھانے کو کچھ جلد ملے اس تمام

عرصے میں جب لوگ اکٹھے رہے تھے اور گاتے رہے تھے۔ وہ اس سینڈوچ کی جانب تکے جا رہا تھا۔ جس کو اس نے اپنے دل ہی دل میں کھانے کے لیے چن لیا تھا۔ لیکن عین اس وقت جب عبادت ختم ہوئی ٹھوڑی داڑھی والا ایک بوڑھا جھٹا اور اس کے سینڈوچ پر جھپٹ پڑا اور اس لیے وہ لڑکا ایک دم بہت غمگین اور بددل سا ہو گیا اور بہت دیر تک تو اس نے کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔

چرچ کے پادری کی یہ دعوت کچھ اتنی خوش گوار نہ رہی تھی مگر اس کے بعد کے واقعات نے اس شام کی کیفیت کو بدل دیا۔ چائے کی دعوت والے دن گرجے کے اندر واقع ہال وغیرہ کے کھلنے والے کمرے میں ہارمونیم رکھ دیا گیا تاکہ لوگوں کے لیے ہال میں زیادہ سے زیادہ جگہ کی سہولت ہو ..... وہاں اس چھوٹے لڑکے نے ہارمونیم کو دیکھا تو سب کی نظریں بچا کر اس کے ڈھکنے کو کھولنا چاہا اور اسے کھلا ہوا مل گیا۔ جب اس نے اپنا ہاتھ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی KEYS پر رکھا تو اس کا دل اس کے سینے میں زور سے اچھلا ..... اس نے اس کو چھو کر بہت اچھا محسوس کیا اس نے بھیڑ پشت کی ایک کرسی اس کے قریب کھینچی یہ کرسیوں میں سے ایک تھی جو اس کمرے کی روشنی کرنے والی جگہ تک پہنچنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی اور پھر وہ اس خاموش KEYS کو حرکت دینے کے لیے نیچے بیٹھ گیا۔ جلد ہی اس نے کوشش کی اور پیڈلوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ جب اس نے ہوا داخل ہونے کی ہلکی آواز سنی تو اس میں موسیقی بند ہوئی ..... ہائی اونچی آواز تھی مگر اس کمرے میں ہر طرف پر کونوں اور چیزوں نے اس آواز کو اس کمرے تک محدود رکھا جب کہ باہر سب لوگ آپس میں دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ بے قدرتی صاف ستھری عورتیں، جنھوں نے سفید اپرن پہن رکھے تھے اور جن کے ماتھے پر گھنگھریالے بال گرے ہوئے تھے، لمبی میزوں کی صفائی میں لگی ہوئی تھیں۔ اس میں کچھ مزید ہمت پیدا ہوئی اور پھر اچانک ہی اس کے ہاتھ کے نیچے سے ایک دھن برآمد ہوئی یعنی "TOILING ON! HA,HA,HA HA" اس نے خوف اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بہت کوشش کی مگر وہ اس ایک لائن کے آگے کوئی دھن برآمد کرنے میں ناکام رہا

"موسیقی" ..... وہ بڑبڑایا اور پھر اپنی ماں کی تلاش میں کرسی سے کودا ..... وہ برتن وغیرہ دھونے میں دوسروں کی مدد کر رہی تھی۔ وہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور اس کے سکرٹ کا دامن کھینچنے لگا۔ ایک دوسری عورت نے اس پر جھک کر کہا "باہر جاؤ۔ یہاں بچوں کو آنے کی اجازت نہیں" وہ وہاں سے نکلا اور بڑی بے صبری سے اپنی ماں کی توجہ کا منتظر رہا حتیٰ کہ اس کی ماں اس کی

طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے کہا "میں کچھ کہنا چاہتا ہوں" اس نے ہاتھ میں پکڑا برتن صاف کرنے والا کپڑا نیچے رکھا۔ اس جنگلی عورت کی طرف مسکراتے ہوئے معذرت کے انداز میں دیکھا اور کہا "میں شاید کہیں بھی جانا چاہتا ہے" جتنی دیر تک وہ ماں کمرے میں خوش گپیاں کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان رہا، خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا "ماں میرے ساتھ آؤ میں تمہیں ہارمونیم بجا کر دکھاتا ہوں" چوری چھپے وہ ایک والے کمرے میں چلے گئے، وہاں انھوں نے دروازہ بند کر لیا لڑکا جس کی آنکھوں میں خوشی سے گلابی رنگ جھلک آیا تھا، بولا "لو سنو"

اس نے اپنے ہاتھوں کو نیچے دبایا اور نہایت احتیاط کے ساتھ وہ اس بجانی لگی "Toiling on" اور اس کی ماں چھوٹی بچی کی طرح اس کے قریب ہو گئی۔

اس نے کہا "ذرا ٹھہرو۔۔۔۔ دوسری لائن کے لیے تو کوشش کرو۔"

اور پھر اچانک نہایت عجیب طور پر انھوں نے دوسری لائن کو پایا وہ بہت زیادہ خوش ہوئے جوں جوں آواز بلند ہوتی گئی ان کی خوشی بھی بڑھتی گئی اور جب ہارمونیم بجاتے ہوئے اس عورت مس اطلس نے دروازہ کھولا تو وہ دونوں مجرموں کی طرح وہیں جم گئے۔ ایسی حالت میں کہ ان میں سے ایک اٹھنے کی کوشش میں تھا تو دوسرا وہیں بیٹھا تھا۔

مس اطلس نے قدرے درشت لہجے میں کہا "تمہیں اس کو نہیں چھونا چاہیے تھا۔"

اس نے اسے بند کر کے تالا لگا دیا وہ اس کی طرف دیکھتے رہے اور کوئی لفظ کہے بغیر خاموشی سے وہاں سے نکل گئے۔۔۔۔ لیکن اس کے بعد گھر میں اب ان کے سامنے ایک نیا موضوع تھا۔ وہ سینکڑوں مرتبہ اس واقعے کا ذکر کرتے اور کبھی نہ تھکتے۔ پھر ایک دن چھوٹے لڑکے نے کہا "کاش ہمارے پاس بھی موسیقی کا کوئی آلہ ہوتا"

اس کی ماں نے اس وقت تنور میں سے آخری روٹی اتاری تھی اور اسے روٹی پالنے والے تختے کے آخری سرے پر رکھا تھا۔ اس نے تنور میں سے روٹی اتارنے والا نیم گرم کپڑا انگوٹھی کے نیچے رکھا اور سوچنے لگی۔ لڑکے نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا کیوں کہ وہ بھی مسکرا رہی تھی لیکن پھر خود وہ سنجیدہ ہو کر کہنے لگی "تمہارا باپ ایسی کوئی چیز گھر میں لانے کی اجازت نہیں دے گا کیوں کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا"

لیکن اس کے بعد وہ پھر خوش ہو گئی کیوں کہ ان دونوں نے ایک خفیہ فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے ہارمونیم کے لیے بچت کرنے اور پھر اسے خریدنے کا ارادہ کر لیا چوں کہ اس کے پاس زیادہ پیسے نہیں

تھے، اس لیے بچت کرنا بہت ہی مشکل تھا مگر اسے اس کے لیے کوشش کرنا تھی کہ پیسہ پیسہ کر کے ایک چھوٹی سی رقم جمع ہو گئی

دو مرتبہ تو لڑکے کے باپ پر ان کا راز فاش ہوتے ہوتے رہا۔ ایک بار تو اس وقت جب وہ موسیقی بجانے والے طلبہ کو اس کے مخصوص برتن میں کھانا دے رہا تھا اور دوسری بار اس وقت جب وہ اپنی کوئی چیز چھپا کر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا _____ لیکن خوش قسمتی سے وہ ان پیسوں تک نہ پہنچ پایا _____ بڑی بے چینی کے ساتھ تقریباً روزانہ ہی اپنی ماں سے دریافت کرتا۔

"کیا ابھی ہم خریدنے کے قابل نہیں ہوئے؟"

آخر کار اس کی ماں کو وہ بڑی فروش مل گیا، جو سو تصورات و پیسوں کو خوشیوں میں تبدیل کرنے کا کام کرتا تھا۔ اس کے پاس پیسہ زیادہ تو نہ تھے مگر اس کا خیال تھا کہ وہ ان کی مدد سے کوئی پرانا پیانو خرید لیں گے، جس پر زیادہ لاگت نہیں آتی اور اس نے یہ بھی سوچا کہ وہ اسے ہر بار کچھ نہ کچھ ادا کرتی رہے گی، جو کہ اس نے بچا کر رکھا ہوتا کیوں کہ اس نے کہاریوں کے ہاں ایسے نوٹس پڑھے تھے، جہاں لکھا ہوتا تھا: "ادائیگی ایک ہفتے بعد"

پھر ایک روز خزاں کے موسم کے ابتدائی دنوں کی ایک اداس سہ پہر کو وہ گلی میں نکلے۔ جب وہ رستراں قیصری کے قریب سے گزرے تو اس کی مشینری کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ مسز مارفیٹ اپنی شادی سے پہلے کسی ہی ایک قیصری میں کام کر چکی تھی اور اب اچانک اس کی آواز اسے واپس ان دنوں میں لے گئی۔ یہیں اس نے اپنی ہونے کے پہلے خواب دیکھے تھے، جب کہ ان خوابوں میں تھیٹر سٹوں مارفیٹ کا کوئی دخل نہ تھا۔ سڑک کے بالکل سامنے ہی ایک دروازہ تھا، جس میں کئی سوراخ تھے۔ اس نے مارگر کے لئے ان سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھا وہاں میں جھانکے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہاں پہیوں پر گھومتے ہوئے پروں اور دھوں کے سوا کچھ نہ تھا جب تک ماں کے اشتیاق نے اجازت دی وہ جھانکتے رہے، پھر سیدھے ہو کر چلنے لگے۔ وہ پل پر سے گزر کر نیچے وادی میں آ گئے اور پھر پہاڑی راستے کی طرف آ گئے۔ مسز مارفیٹ کے ایک ہاتھ میں پیسوں والی تھیلی اور اس اشتہار کا تراشہ تھا جو اس نے اخبار میں سے کاٹا تھا اس پر لکھا تھا "موسیقی کے ہر قسم کے آلات برائے فروخت حاضر ہیں..... جو جی چاہے انتخاب کیجیے گلی نمبر ۱۳ لیونارڈ ٹیس سے رجوع کریں۔"

بہر حال وہ لیونارڈ ٹیس تک جا پہنچے۔ وہاں سڑک اتنی شان دار تھی کہ ماں اور بیٹے کے کافی

دیر تک اپنے آپ میں گلی نمبر ۱۳ کا دستک دینے کی جرأت نہ پائی۔ وہاں تین منزلوں والے بڑے بڑے مکان تھے، جن کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ مکان کے سامنے رنگ دار رینگ والے باغیچے تھے۔ انھوں نے سوچا ان عمارتوں میں نہ جانے کیسے لوگ رہتے ہوں گے۔ انھیں محسوس ہوا وہ یقیناً کسی غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ جب وہ وہاں سے آئے تو ایک بوڑھا آدمی اپنے کوٹ کے اوپر والے بٹنوں کو بند کرتا ہوا اور مزاقی ہوئی آواز سے بڑبڑاتا ہوا ان کے قریب سے گزرا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانا واٹس کا ڈبہ تھا۔ جب تک وہ کونے کی طرف مڑ نہ گیا وہ اسے دیکھتے رہے، پھر انھوں نے گلی نمبر ۱۳ کی عمارت کا دروازہ کھولا اور ہال کے راستے کی طرف بڑھے اور دستک دی۔

ان کے سامنے ایک بڑا سا دروازہ تھا، جس کا دستہ تیز رنگ کا تھا۔ سب نے دستے کی طرف دیکھنے لگا وہ اس کی خوب صورتی سے اتنا متاثر ہوا کہ یہاں آنے کا مقصد ہی بھول گیا۔ یہ دروازہ ایک چوکور ہال میں کھلتا تھا۔ اس کے آگے ایک اور دروازہ، پھر اس کے آگے ایک گزرگاہ تھی۔ ایک کالی مونچھوں والا دبلا پتلا اور لمبا آدمی، ان کی دستک کے جواب میں نمودار ہوا۔

مسز مارلیٹ نے پہلے اس شخص کی وسعت کی طرف دیکھا، پھر اپنے چھوٹے پوتے کی طرف، لیکن کوئی لفظ اس کے منہ سے نہ نکلا۔ چھوٹے لڑکے نے جرأت کر کے کہا۔

"جناب یہ آپ کے پاس۔۔۔۔"

اس نے مریل سی آواز میں کچھ کہنا چاہا مگر پھر اپنی ہی آواز کو نیا اور اوپری محسوس کرتے ہوئے وہ چپ ہو گیا۔

بھاری آواز میں اس آدمی نے کہا "آ گئے آ جاؤ۔"

وہ دونوں چوکور ہال تک آگے بڑھ گئے مگر پھر ٹھہر گئے۔

اس آدمی نے ویسی ہی بھاری اور دھیمی آواز سے کہا "میرے پیچھے چلے آؤ۔"

اور وہ دونوں اس کے پیچھے بغیر قالین کے فرش والے بڑے کمرے میں پہنچ گئے۔

"معاف کیجیے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ انھیں اس کمرے میں چھوڑ گیا۔

وہ کمرے کے قدرے اندھیرے حصے میں سارنگیوں، بربطوں، پیانوں اور دوسری طرح کی شکل کے موسیقی کے آلات میں گھرا رہا۔ بالکل خاموش اور ساکت کھڑا رہا۔ حتیٰ کہ اس شخص کے واپس لوٹنے تک، انھوں نے اپنے سانس بھی روکے رکھے۔ چھوٹے لڑکے نے اس وقت بہت فخر محسوس کیا، جب اس کی ماں نے براہ راست اس شخص کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہارمونیم کی کیا قیمت ہے؟"

اور یہ کہتے ہوئے وہ کسی قدر مسکرائی بھی تھی، ایسی مسکراہٹ، جس میں خوف بھی شامل تھا۔

لڑکے نے اس وقت اسے بہت خوب صورت محسوس کیا جوں ہی اس نے قیمت سنی، وہ مڑی اور لڑکے کو زبردستی اپنے ساتھ کھینچتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی لیکن دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس آدمی نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ مسکراتے ہوئے ان سے باتیں کرنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ بغیر کچھ خریدے ہی یہاں سے چلے جائیں۔

اس نے ان کو چھوٹا سا زرد رنگ کا مربع ڈبہ، جس پر شوخ پھول بنے ہوئے تھے، دکھاتے ہوئے کہا "میرے خیال میں یہ چیز آپ کو پسند آئے گی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ڈبے کو الٹا کر پرانی پیکنگ کے ڈبے پر رکھا۔ چھیدوں والے ایک کاغذ کے بنڈل میں اسے لپیٹا اور رسیدیں لکھنا شروع کیں۔ بچہ اور عورت دونوں بہت زیادہ خوشی کے باعث بت بنے کھڑے رہے۔ اس خوشی کے مقابلے میں ہارمونیم تو کوئی چیز نہیں تھا۔ پہلی دھن جو اس کی بجی وہ تھی "THE MINSTREL BOY" اور یہ دھن بہت عرصے پہلے مسز ہارٹ نے اپنے سکول میں سیکھی تھی۔ اس نے سر کو جنبش دی اور گنگنانا شروع کر دیا اس وقت اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

لڑکے نے سرگوشی کی "اماں۔ یہ کیا ہے؟"

"یہ میوزک بکس ہے" ماں نے جواب دیا "اور اگر یہ تیز دھڑکنے لگا تو ہم اسے خرید لیں گے۔"

اس نے سوچا کہ وہ اسے ہر وقت کچن میں بجایا کریں گے وہ اسے ڈریسر کے ایک کونے پر رکھ دیں گے اور اس کا خوب خیال رکھیں گے۔ جب بارش کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوئی اور ہوا ہر چیز میدان میں شور کرے گی تو یہ اس کی آواز بند کرا دے گا پھر اس کے بعد جب بڑی ہوں گی تو یہ ہوگا اور اس کے بعد تنہا گھر پر اس کا نیا مشغلہ ہو رہا ہوگا (اور گو کہ ہوں گھر سے کچھ زیادہ دور تھا ہی نہیں) یہ بڑی کو گھر کی طرف واپس سلامتی کے ساتھ لانے والا مقناطیس ثابت ہوگا۔

اس آدمی نے اپنے دام میں قیمت کا تعین کرتے ہوئے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور شک کے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

وہ پانچ شلنگ مانگنا چاہتا تھا مگر قسمت آزمائی کے لیے اس نے ایک شلنگ اور بڑھا دیا۔

کمرے کے کونے میں پڑے وہلن کی ایک تار سے ٹوٹی تو ان سب کا انہماک بھی ٹوٹ گیا۔

اس نے کہا "تم اسے چھ شلنگ کے عوض خرید سکتی ہو اور پھر اس کی تو اکیلی دھنیں اس سے زیادہ قیمت کی ہیں۔"

ماں بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا..... جیتا پر امید اور ماں خوش تھی پھر ان دونوں نے سانولے رنگ کے، اس شریف آدمی کی طرف دیکھا، جو جمائی روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور چند لمحوں کے بعد ایک بار پھر وہ دونوں گلی نمبر ۱۳ کی لوہے کی ریلنگ کے پاس سے ہوتے ہوئے دو، سات، پانچ، تین اور گلی نمبر ایک کے قریب سے گزر رہے۔ عورت نے اس حد تک ڈھانپا ہوا بنڈل اس یوں اٹھا رکھا تھا جیسے کوئی مقدس چیز ہو۔

وہ گھر اتنی جلدی پہنچ گئے کہ ایک لمحے کی بات محسوس ہوئی تھی۔ باپ نے ذرا سے کھانے کی جگہ صحیح طور پر بیٹھ لیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اپنی چمک بکھیر رہے تھے۔ انھوں نے لباس تبدیل کرنے سے پہلے کئی ایک دھنیں بجائیں۔

بچے کی ماں چندل تھما رہی تھی اور بچہ اس کے پاس متانت کے ساتھ آنکھوں میں سرور سا لیے بیٹھا تھا۔ دونوں ہی خاموش اور ماحول میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایک بار ماں نے اونچی اور اعتماد آواز میں کہا۔

"اگلے سال تمھیں ایک بار مونیم بھی مل جائے گا۔"

حالاں کہ وہ جانتی تھی کہ یہ بات بالکل ناممکن تھی۔ ویسے بھی اب بارمونیم کا معاملہ کوئی خاص مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اور پھر اچانک انھوں نے قدموں کی آواز سنی۔

بچے نے مایوسانہ انداز میں کہا "ابا آ گئے۔"

اس کے لیے کھانا تیار نہ تھا۔

دونوں خوشی سے تمتماتے ہوئے چہروں کے ساتھ اچھل پڑے اور دروازے کی طرف بھاگے۔

بچے نے بڑی جرأت کے ساتھ ماں کے زرد پائنچے کا ایک کونہ پکڑا اور چلایا۔

"ابا ....."

اس آدمی نے پوچھا "میری چائے کہاں ہے۔"

اس کی بیوی نے میز پر کچھ چیزیں رکھتے ہوئے کیتلی کو آگ پر رکھا اور کہا۔

"بس ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا۔"

لڑکے کا باپ کسی بات پر ناراض نظر آتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک شلنگ ہار دیتا کبھی کبھی وہ

گھوڑے پر چور رقم کا تھا اور سوا نے چند موقعوں کے وہ بار بار تھا لیکن ہر مرتبہ وہ بچہ اس امید پر دا دیتا تھا کہ شاید اس بار اس کی ساری کی ساری رقم واپس ہو جائے۔ اچانک اس کی نظر میوزک باکس پر پڑی

"یہ عجیب و غریب چیز کیا ہے؟" وہ غرایا۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے چھوٹے لڑکے نے بسورنا شروع کر دیا۔

بچے نے محسوس کیا کہ اس کا باپ خاصا طاقتور ہے اور وہ اپنی طاقت کو بے دردی سے استعمال میں لائے گا۔ اس کی ماں کی سوچ بھی یہی تھی۔ وہ چولہے کے پیچھے چھپے کھڑی، کیتلی میں پڑے پانی کے ابلنے کی منتظر تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ اس بچے جیسا تھا، جو اپنے کے انتظار میں ہو۔

"ماں تو مجھے بتاؤ۔۔۔۔ یہ عجیب و غریب چیز کیا ہے؟"

اس نے خاصے تحمل سے پوچھا تھا۔

وہ بہت دھیمے لہجے میں بولی۔ "یہ۔۔۔۔ یہ میوزک باکس ہے"

اس نے بڑی افسردگی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

چھوٹے لڑکے نے اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔۔۔۔ پھر ایں ایں کرتے ہوئے اس نے اپنے کمرے کی طرف سفر کھینچا۔ اس پر کھڑا ہو گیا اور چندل تحمل کا شروع کیا۔

لڑکے کے باپ نے چند لمحوں تک سنا، پھر گہرا غصہ اس کے چہرے پر چھا گیا۔

پھر اس نے اٹھ کر بازو ہوا میں لہراتے ہوئے چلا کر کہا "بند کرو اس شور کو"۔۔۔۔ "ایسی منحوس چیز گھر میں کون لایا ہے۔"

لڑکے نے چندل تحمل بند کر کے اپنے باپ کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کی چمک غائب ہو گئی اور اس کی سیاہ آنکھوں کے گرد پیلاہٹ پھیل گئی۔ کیتلی پر رکھا ڈھکنا ہلنے لگا لیکن اس کی ماں نے گرم پانی چائے دانی میں نہ انڈیلا۔

"اسے میں لائی ہوں" یہ کہتے ہوئے اس کی رنگت بھی لڑکے کی طرح سفید ہو گئی

وہ آدمی بولا "ٹھیک ہے تم اسے واپس کر آؤ"

وہ غصے کے ساتھ اس میوزک باکس کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے اس چیز نے اسے کوئی نقصان پہنچایا ہو۔ کیتلی سے پانی بھاپ بن کر آگ پر پڑنے لگا اور صاف اس پانی کی آواز کمرے میں سنی جا سکتی تھی

پھر اگلی صبح جیسے ہی وہ آدمی اپنے کام پر روانہ ہوا۔ اس عورت نے خاموشی سے باہر جانے کے

بے بس پھنسنا شروع کیا۔ اس نے بچے کا اوورکوٹ پہنایا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر ہر طرف دھند تھی جب انھوں نے قدم باہر رکھے تو وہ کھانسنے لگے۔ وہ ناشتہ بھی نہ کر سکے تھے اور اس سرد صبح کی ہوا میں وہ کانپ رہے تھے۔ عورت نے وہ میوزک باکس اٹھا لیا جانے کو تیار تھی۔ وہ اتنی چاندی تھی کہ چمک گئی تھی اور ایسا ہی لڑکے نے بھی کیا تھا۔ انھوں نے وہ میوزک باکس گھر میں رکھنے کی اجازت چاہی تھی اور اس بچے کا بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اس وقت نہیں بجائیں گے جب وہ یعنی لڑکے کا باپ گھر پر موجود ہوگا

مگر اس نے صرف اتنا کہا "بس اسے واپس لے جاؤ۔"

وہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کی بیوی اور اس کا بچہ موسیقی سے دل بہلائیں۔

وہ دونوں آہستگی سے چلنے لگے، جیسے ان پر بہت ہی بھاری بوجھ لڑکے کی ماں شرمندہ تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کس طرح وہ واپس اس سانولے رنگ کے شخص کے پاس جائے۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ اس کی رقم واپس نہیں کرے گا۔ یہاں صرف ایک ہی بات اس کے حق میں تھی کہ اس نے اپنے خاوند کو نہیں بتایا تھا کہ اس کی کوئی قیمت بھی دی گئی تھی۔ بے شک اس کے لیے اس کے پاس وقت بھی نہ تھا کیوں کہ اس سارے وقت میں جب اس کا شوہر اس پر چیخ چلا رہا تھا تو اس کا ڈر اس کے ساتھ خاموشی سے چمٹا رہا تھا۔ وہ کئی بار سانس لینے کے لیے رکے اور آخر کار ایک بار پھر وہ ویسٹ لیونارڈ کے اس پر موجود تھے۔ بڑی بڑی عمارتیں دھند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مرے ہوئے پتوں والے درختوں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے اور پیدل چلنے کا راستہ ایسا پھسلا تھا کہ بہت مرتبہ وہ گرتے گرتے بچے۔

جب لڑکے کی ماں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ دروازے پر دستک دی تو لڑکے نے تجربے رنگ کے دستے کی کنی کو پوچھا تاکہ وہ اسے زیادہ اچھی طرح سے دیکھ سکے۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اسے گھمایا اور بغیر کوئی آواز پیدا کیے دروازہ اس کے پیچھے کھل گیا۔۔۔۔ وہاں کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔۔۔۔ وہ اپنی ماں کی طرف مڑا اور اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بہت عاجزی سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے ہاتھ سے دروازے کو دھکیلتے ہوئے، اس عورت نے بہت احتیاط کے ساتھ اس پارسل کو چھوتے ہوئے چوکھٹ کے فرش پر رکھ دیا اور پھر اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔۔۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ وجود دھند میں غائب ہو گئے۔۔۔۔!!

☆☆☆☆

پیڈرو جوآن سوتو

کبوتر لوگ

"عورتوں، گھوڑوں اور کتوں کے بغیر اس ماں پر سوار سورج پر چڑھتے ہوئے جب وہ بھیڑ کی کے بڑی تعداد میں ٹین کے ڈبے جلاتے ہیں تو وہ لوگوں کے (بغیر) میرا مذاق اڑاتے ہیں۔"

کسی شخص کے بے ہنگم سیاہ اور پیلے سوٹ پہنے ہوئے جو کہ اسے پورا آنے کے (جو کہ اس کے لیے تنگ تھا) اس نے کھڑکی میں سے کبوتروں کو راستے کے آر پار جھنجھ کے نچلے کنارے پر مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"یا ان دروازوں اور کھڑکیوں کے قریب جو ہمیشہ پروں کی طرح کھلی ہوئی ملتی ہیں۔"

اپنے ہاتھوں کو فضا میں لہراتے ہوئے، اس نے کبوتروں کی طرح شور مچایا اور تبھی اس نے اپنے پیچھے آواز سنی: "میرے بچے، میرے بچے۔"

وہ کانپتی ہوئی عورت، جس کی آنکھوں میں سختی تھی، میز کے قریب (جس کے نیچے ایک کمزور سا سوٹ کیس پڑا تھا، جسے کیڑے نے بھی کھا لیا تھا۔ یہ ہی اس کی واحد چیز تھی) ایک کرسی میں کسی بھوکی اور بھلا دی گئی بلی کی طرح دھنسی ہوئی تھی۔

"کیا؟" وہ بولا۔

ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے عورت نے کرسی کو میز سے پرے دھکیلا اور الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے روٹی کا وہ ٹکڑا، جو چوہوں کے دانتوں پر چلا گیا تھا، لیا اور اس شخص کی طرف آئی جو ابھی تک اشاراتی انکار کرتے ہوئے منہ سے آوازیں نکال رہا تھا۔

"ایک بچے کی طرح"

"چپ! شور مت کرو"

اس عورت کی طرف توجہ دیے بغیر، کھڑکی کی سل پر روٹی کے ٹکڑے کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

اس نے زبان کو حرکت دینا بند کر دیا

"لوگوں کے بغیر میرا مذاق اڑایا جانا"

"A Pasiar a la palaza" اُس نے کہا۔

"ہاں ماریلیا تمھیں سیر پر لے جانے کے لیے آئی ہے۔"

"وہ پلازا۔"

"نہیں پلازا اس طرف نہیں۔ وہ اُسے وہاں سے لے گئے ہیں۔ وہ اُڑ کر چلا گیا۔"

اُس نے منہ پھلا لیا۔ اُس نے دوبارہ کبوتروں کے پروں کی چڑ چڑاہٹ سنی

"نہیں یہ کبوتر نہیں تھے۔" وہ بولی۔ "یہ ایک شیطانی شر تھا۔"

"وہ۔"

"تم پاپا ڈایوس سے پلازا واپس لانے کی دعا مانگو۔"

اس نے دھیرے دھیرے کہا۔ "پاپا ڈایوس۔۔۔۔ Trai la plaza y el rio"

"نہیں نہیں" وہ بولی۔ "گھٹنوں کے بل جھک جاؤ اور پاپا ڈایوس سے منہ کھولے بغیر بات کرو۔"

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کھڑکی کے سامنے جھک گیا اور اس نے چھتوں کے اوپر سے دور کی جانب دیکھا۔

"میں ایک کبوتر بننا چاہتا ہوں۔"

عورت نے ہنستے ہوئے اس کی اس صبح کو سر دوں کی ہوا میں اور ریت کی طرف سے آتی جاتی عورتوں کی پھرتی دیکھی۔

آہستہ سے غمگین انداز میں سر پر بوجھ اٹھا کر اس کا توازن برقرار رکھنے والی عورت کی طرح، وہ اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں اس نے بیٹی آئینے کے سامنے بیٹھی، ڈریسنگ کے اوپر اپنے بالوں سے پنیں نکالتی ہوئی اُن کا ڈھیر لگاتی جا رہی تھی۔

"ماریلیا، اسے آج مت لے جاؤ۔"

نوجوان عورت نے ترچھی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"ماما اب اس قصے کو تم دوبارہ مت چھیڑو۔ اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ اُس کی بہت اچھی طرح سے دیکھ بھال کریں گے اور اس پر ہمارا کچھ خرچ بھی نہیں آئے گا۔"

جب یہ پنوں سے آزاد ہو گئے تو اس کے بال اُس کے کانوں پر گھنے ہوئے تھلوں کے ڈھیر کی طرح گر گئے۔

"لیکن میں جانتی ہوں کہ کس طرح اُس کی دیکھ بھال کی جانی چاہیے۔ وہ میرا بچہ ہے۔ مجھ

سے بہتر اسے کون جان سکتا ہے؟"

ماریلیا نے آئینے میں سے اس دبلے پتلے جسم کی مالک کو بغور دیکھا۔

"ماما، تم بوڑھی ہو گئی ہو۔"

ایک بے گوشت ہاتھ آئینے کے سامنے لہرایا۔

"میں ابھی مری نہیں۔ میں اس کو اب بھی سنبھال سکتی ہوں۔"

"ایسا نہیں ہے۔"

وہ کنگھی کے ذریعے بالوں کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن گھونگھرا ابھی تک گتھے ہوئے تھے۔

غم کے سمندر میں بھیگے ہوئے الفاظ کے ساتھ ماں نے کہا "تم پہ معصوم ہے۔ وہ ابھی بچہ ہے۔"

ماریلیا نے کنگھی نیچے رکھ دی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے کھلے بیگ سے پنسل نکال کر اپنی باریک بھنوؤں کو سیاہ کرنا شروع کر دیا۔

"تم اس کی تیمارداری نہیں کر سکتیں۔" اس نے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اس بات کو اچھی طرح سے جانتی ہو۔ اس لیے بہترین چیز یہی ہے کہ۔۔۔۔"

ماریلیا نے اپنے کندھوں کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پورٹو ریکو میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہاں یہ کچھ مختلف طریقے سے ہو سکتا ہے۔ وہ وہاں جا سکتا ہے کیوں کہ لوگ اسے پہچانتے ہیں۔ لیکن نیویارک میں لوگ پروا نہیں کرتے اور وہاں آپ کو اپنے پڑوس کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ زندگی مشکل ہے۔ سارا سال سے میں سلائی مشین سے چمٹی ہوئی ہوں اور میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔"

پھر وہ تلاش کرتے ہوئے اس نے اپنی ماں کے چہرے کو آئینے میں منتشر ہوتے ہوئے دیکھا۔

"لیکن کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی۔ وہ وہاں اس کی بہتر طور پر دیکھ بھال کر سکیں گے۔"

"بس یہی کچھ ہے جو تم کہنا چاہتی ہو۔" ماں نے کہا۔

ماریلیا نے اپنے میک اپ کے سامان اور کنگھی کو بیگ میں پھینکا اور اسے بند کر دیا۔ وہ اپنے باریک بلاؤز، چمکتے ہونٹوں، سیاہ بھنوؤں اور گتھے ہوئے گھونگھروؤں کے ساتھ مڑی۔

"ایک سال بعد ہم یہاں کسی قدر بہتری کے حق دار ہیں۔"

"جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا، اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔"

"لیکن ذرا سوچو کہ اگر وہ یہاں رہا تو ایسا ہو بھی سکتا ہے۔"

اُس نے اپنی ماں کا بازو پکڑ کر اُس کی چھوٹی آستین کو اوپر کھسکاتے ہوئے، اس کی طرف دیکھا۔ اوپر کی طرف ڈھیلے بازو پر ایک چاقو کی دھار تھی

"وہ تم پر پہلے بھی ہاتھ اٹھا چکا ہے اور میرے ساتھ وہ ایسا قیامت کی میں کر چکا ہے یہ کوئی آسمان بات نہیں پتہ نہیں اس کے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا ہو جائے جب کہ اس معاملے میں پہلے ہی "

"اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔"

ماں نے اپنی آستین کو نیچے کی طرف کھینچتے ہوئے اور فرش کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے بازو کو موڑا تاکہ ہارمیلیا اُسے اپنی گرفت سے آزاد کر دے۔

"شاید وہ ایسا نہیں چاہتا ہو گا جاناں کہ اس کا ہاتھ تمہارے گلے پر تھا اگر میں نے وہ بوتل دبوچ لی ہوتی تو خدا ہی جانتا ہے کہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ ہمارے پاس کوئی ایسا شخص نہیں جو کہ اس کے قریب موجود رہے۔ میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں اور تم اس سے خوف زدہ ہو۔"

ماں نے کاپی کے ساتھ خود کو اس سے پرے کرتے ہوئے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "وہ بچہ ہے۔"

ہارمیلیا نے آنکھوں کو بند کر دیا۔

وہی قصہ پھر سے شروع نہ کر دو۔ میں نوجوان ہوں اور میرے آگے میری زندگی پڑی ہے اور اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم بھی اب تھک چکی ہو اور اگر وہ یہاں نہیں ہو گا تو تم اپنی باقی ماندہ زندگی کو اچھے طریقے سے گزار سکو گی اور تم جانتی ہو لیکن تم یہ سب کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتیں کیوں کہ تمہیں خوف ہے کہ یہ گناہ ہے۔ لیکن میں یہ کہتی ہوں کہ تم تھک چکی ہو اور یہی وجہ ہے تم نے کاغذ پر دستخط کر دیے تھے کیوں کہ تم جانتی ہو کہ اس جگہ پر وہ اس کی دیکھ بھال اچھے طریقے سے کریں گے اور تب تم آرام سے بیٹھ کر بازار میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ سکو گی اور جب تمہیں خواہش ہو گی تو تم باہر نکل کر تھکی ہوئی طرح گھوم پھر سکو گی۔ لیکن تمہارے خیال میں یہ ایک جرم ہے اور میں تمہارے ساتھ ایک جرم کر رہی ہوں اور یوں تم خود کو ایک شہید کی ماں سمجھ رہی ہو اور تم ایک شہید کی ماں ہوتے ہوئے اس بات سے انکار نہیں کر سکتیں کہ تمہیں اپنے اور میرے بارے میں سوچنا چاہیے کیوں کہ جب وہ دس سال کا تھا تو اس گھوڑے نے اسے گرا دیا تھا "ماں جلدی سے کمرے سے نکل گئی جیسے کہ اسے وہاں سے نکالا گیا ہو، جیسے کہ کمرے نے خود اسے باہر دھکیل دیا ہو جب کہ ہارمیلیا کہہ رہی تھی "اور اگلے بیس سال اُس نے بے شعوری کی حالت میں بسر کیے۔۔۔۔"

اُس نے اُس کے پیچھے جائے بغیر مڑ کر اُسے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ڈریسر پر جھک گئی جہاں اُس کی کہنیاں اتنے زور سے ٹکرائیں کہ اُس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"ہم نے ان سالوں کو اُس کے ساتھ بسر کیا۔" اُس نے آئینے میں اپنے چہرے کو ہسٹریائی کارٹونوں ماسک کے طور پر دیکھا۔

"اور وہاں پہاڑوں کے سینے کی طرح جگہ ہیں اور وہاں کتے بھی ہیں اور وہاں کھیتیاں بھی ہیں اور دریا سے چھونے والی ہوا بھی ہیں اور سینما کی وہی کھنکھناہٹیں اور یہاں سورج نہیں آتا اور مجھے یہ پسند نہیں۔"

ماں نے کھڑکی کی سل کے ساتھ لگ کر وہاں دیکھتے اور سنتے ہوئے کہا "شکر ہے۔" نیچے گلی میں لڑکے ایک جھنڈ کی شکل میں ایک گیند و فٹبال مارتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

"اور یہاں اندر ٹھنڈ سوتی، چبھتی اور چلتی ہے اور مجھے یہ پسند نہیں۔"

"شکر ہے بچے، شکر ہے، کہو، آمین۔"

"آمین۔"

اس نے اُسے اٹھنے میں مدد دی اور اُس کا ہیٹ اُس کے ہاتھ میں دیا۔ اُس نے دیکھا ہارمیلیا نہایت سنجیدگی سے سرخ آنکھوں کے ساتھ اُس کی طرف آ رہی تھی۔

"پاپا، آؤ چلیں۔ ماما کو پیار کرنے دو۔"

اس نے بنا بیگ میز پر رکھا اور سوٹ کیس اٹھانے کے لیے نیچے جھکی۔ ماں نے خود کو اس کی گردن کے قریب کیا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کے گرد مضبوطی سے جما کر جلی ہوئی سرخی مائل چہرے کی جلد کو، جس کی آج صبح ہی اس نے شیو کی تھی، انگلیوں سے سہلاتے ہوئے چوم لیا۔

"کیا سوچتے ہیں۔" ہارمیلیا نے سوٹ کیس اور بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی ماں کے بازوؤں سے بل کھاتے ہوئے نکلا اور جس ہاتھ میں اُس نے ہیٹ پکڑ رکھا تھا، اسے ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف چل پڑا۔

"بچے، اپنا ہیٹ پہن لو۔" ماں نے کہا اور اپنی آنکھوں کو جھپکایا تاکہ وہ اُس کے آنسو نہ دیکھ سکے۔

مڑتے ہوئے اُس نے ہیٹ اُٹھا کر اپنے ویزلین سے چپڑے بالوں کے اوپر رکھ لیا۔ وہ ایک کھلونے کی طرح تھا جو لٹک رہا تھا جیسے کہ وہ باپ سوٹ کے نیچے چھپا ہوا دکھائی نظر آنا چاہتا ہو۔

"نہیں، اسے یہیں چھوڑ دو۔" ہارمیلیا نے کہا۔

پاپ نے منہ بنایا۔ ماں نے اپنی نظریں بارٹیلیا پر جما دیں اور اُس کی ٹھوڑی کانپنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔" بارٹیلیا نے کہا "تم اسے اپنے ہاتھ میں پکڑ لو۔"

وہ دوبارہ دروازے کی طرف گیا اور اُس کی ماں نے تھوڑا سا اُس پر جھک کر اُس کے بازو پکڑ لیے جو کہ اُس کی طرف پھیل جانا چاہتے تھے۔

بارٹیلیا نے اُسے روک دیا۔ "ماما، وہ اُس کا پورا خیال رکھیں گے۔"

"میں پسند نہیں کرتی کہ وہ اسے ماریں۔"

"نہیں، وہاں ڈاکٹر موجود ہیں۔ اور تم ۔۔۔۔۔ ہر دوسرے ہفتے میں تمھیں وہاں لے چلا کروں گی۔"

اُن دونوں نے کوشش کی کہ اُن کی آوازیں ہموار رہیں۔

"ماما، جا کر لیٹ جاؤ۔"

"اس سے کہو کہ وہ وہاں رکا رہے۔ اور ہر چیز کھائے۔"

"ہاں۔"

بارٹیلیا نے دروازہ کھول کر دیکھا کہ پاپ بینڈنگ پر رکا ہوا تھا۔ وہ ریلنگ پر جھکا ہوا نیچے تھوک رہا تھا اور اپنے تھوک کو نیچے جاتا دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

"ماما، میں جلدی گھر لوٹ آؤں گی۔"

ماں اس فضول سی نظر آنے والی لڑکی کے پاس کھڑی، اس جسم میں سے جس نے داخلی راستے کو روک رکھا تھا، اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ماما، لیٹ جاؤ۔"

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے سامنے آپس میں ملے ہوئے اپنے ہاتھوں کے ساتھ اس وقت تک ساکت رہی جب تک کہ اس کی چھاتی اور کندھوں نے تشنجی اور نازک انداز میں ہلنا شروع نہیں کر دیا اور جب تک کہ اس نے ہچکی کی طرح کی سسکیاں نہ لینی شروع کر دی تھیں۔

بارٹیلیا نے دروازہ بند کیا اور پاپ کے ساتھ جلدی سے سیڑھیوں سے نیچے آنے لگی۔ جون کے اس دن کی دوپہر کی بے پناہ شفافیت کا سامنا کرتے ہوئے اس کے اندر سمندری طوفانوں، گرجوں اور برفباریوں کی خواہش پیدا ہوئی۔

آگستو روا بستوس

خالی پن

وہ لیٹے پڑے تھے اور یوں اندھیرے کے سپرد کر دیے گئے تھے کہ ان کا کوئی چہرہ ہی نہ تھا۔ وہ جو کسی غیر واضح سائی تصویر کی طرح سے چھوٹی دوئیں لگ رہے تھے، ان دونوں کے جسم خود ان کے اپنے سایوں میں ہی مدغم ہو رہے تھے۔ ان میں ایک نہایت معصوم مظلومیت یا بالکل مطلق تعلق کے ساتھ زمین کی سطح کے ساتھ ساتھ سست روی سے رینگ رہا تھا۔ وہ تھکا ہوا اور بھاری سانسیں لیتا ہوا اپنے آپ کو جھاڑیوں اور گورا کرنے کے درمیان سے راستہ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بعض مواقع پر وہ اپنی سانسیں بحال کرنے کے لیے رک بھی جاتا تھا۔ تب وہ اپنی کمر کو جھکائے ہوئے اپنے اوپر لدے بوجھ کو پھر سے کمر پر کھینچنا شروع کر دیتا۔ مٹی کے گندے پانی کی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر یہاں کے جانوروں کی پھپھوندی کے حصوں کی بدبو اور جانوروں کے لئی جیسے فضلے کی بدبو جو کہ گندے موسم کی بنا پر برآمد ہو رہی تھی۔ وہ شخص گاہے گاہے اپنے ہاتھوں کی حرکت سے اپنے چہرے سے پرے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات کے پچھلے حصے میں خاشاک سے کرمائی دھات اور شیشے کی چاندی جیسی چمک کے درمیان موجود ہوتے ہوئے ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی بیٹھنا وہاں کے جھنڈوں جیسے یک سال ارتعاش والے چھوٹے سے گیت کو نہیں سن رہا تھا۔ اور نہ ہی شرنی اس خاموش کر دی گئی آواز کو، جو کہ زمین کے نیچے تھرتھراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ نہ ہی وہ جو کہ اپنے آپ کو آگے کی طرف گھسیٹ رہا تھا، وہ شاید صرف زمین کے ساتھ رہتے ہوئے اس جسم کی مدھم اور نرم آواز، کاغذ کے ٹکڑوں کی چرچراہٹ یا اپنے جوتوں سے ٹکرانے والے کانٹے دار اور زمین کے خاص ذروں کی آواز سن سکتا تھا۔ بعض اوقات اس دوسرے کا کندھا چٹان پر یا سخت ٹہنیوں میں الجھ جاتا تھا۔ وہ کسی قدر غصے بھرے احتجاج کے تحت بڑبڑاتے ہوئے اپنے اوپر لدے بوجھ کو جھٹکا دے کر ڈھیلا کرتا ہے یا اسے محسوس کرتے ہوئے منہ سے ان بھاری قلیوں جیسی آواز نکالتا ہے جیسی کہ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے سرکش بوجھ کے تحت کرتے ہیں۔ یہ ظاہری بات تھی کہ اس کا بوجھ بھاری تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس انتہائی مزاحمت کی بنا پر بھی کہ

جو وقتاً فوقتاً رکاوٹوں کے لمحات میں اس کو رکنے پر مجبور کر رہی ہوتی ہے اور شاید اس پیچھے کی طرف دھکیلے جانے یا عجلت کی وجہ بھی، کہ جس کی بنا پر اس کی طاقت آہستہ آہستہ ختم ہو کر جتنی جلدی ممکن ہو، اسے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی طرف لے جانے والی تھی۔

پہلے پہل یعنی آغاز میں اس نے اسے بازوؤں سے کھینچا تھا۔ اگر یہ رات اتنی ابر آلود نہ ہوتی تو کوئی بھی آپس میں جڑے ہوئے ان دو ہاتھوں والے انداز کی مدد کی حقیقت کی شکل میں دیکھ سکتا تھا جب وہ جسم چرخی پر سے گزر گیا تو اس نے اپنی کمر اس کی طرف موڑتے ہوئے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں اور ان نے اپنی جگہوں میں رگڑ کر بوجھ کھینچنا شروع کیا۔ دوسرے آدمی کا سر شانے سے ادھر ادھر ہو رہا تھا جیسے کہ اسے یہ تبدیلی پسند آئی تھی۔ جب وہ ہموار زمین، خس و خاشاک اور کوڑے کے ڈھیروں تک پہنچا تو ایک کار کی قوس بناتی ہوئی روشنی کی چکا چوند ہر طرف پھیل گئی۔ کھینچنے والا شخص اس دوسرے کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے لگا جیسے ایک مدھم سے انداز میں کھینچے گئے اسکیچ کی طرح چہرہ انھیں مل گیا ہو۔ ایک بیدار ہو اور دوسرا گرد سے اٹا ہوا، دیکھنے میں دونوں ہی کسی قسم کے احساس سے عاری تھے۔ اندھیرے نے ان دونوں کو دوبارہ نگل لیا۔

وہ اٹھ بیٹھا اور اس نے تھوڑا سا آگے کی طرف کھسکنا شروع کیا لیکن اس وقت تک وہ ایسے مقام تک پہنچ گئے تھے جہاں کی جھاڑیاں کچھ زیادہ اونچی تھیں۔ اس نے اسے جہاں تک کہ وہ کر سکتا تھا کورے کرکٹ، مٹکے ٹہنیوں اور خس و خاشاک کا لباس پہنا دیا۔ لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ اسے اچانک جگہ کی بدبو یا جلد ہی برسنے والی بارش سے محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔ وہ رک گیا اس نے اپنا رومال اس کے گیلے ماتھے سے صاف کیا، وہ کھنکارا اور اس نے غصے سے ایک طرف تھوک دیا۔ عین اس لمحے ایک نوزائیدہ بچے کے چلانے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ کمزور اور روتی ہوئی یہ آواز اس جھاڑ جھنکار سے یوں برآمد ہوئی جیسے کہ اس "دوسرے" نے کورے کرکٹ میں سے ایک نئے پیدا ہونے والے بچے کی طرح رو کر شکایت کرنا شروع کیا ہو۔

وہ وہاں سے بھاگنے ہی والا تھا کہ وہ آسمانی بجلی کی چمک سے مبہوت ہو کر رک گیا۔ بجلی کی اس چمک نے لوہے کے اس عظیم الجثہ پل کو اندھیرے سے اچک کر اس کے بہت نزدیک لا کر رکھ دیا تھا جیسے کہ اس نے بہت ہی تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس نے اپنا سر شکست کے انداز میں جھکا دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اپنا سر جھکتے ہوئے وہ اس مسلسل گرجتی ہوئی کمزور آواز کی طرف بڑھ

اجیری کے ہر ایک ایک شدید جسامت موجود تھی۔ وہ شخص وہاں کافی دیر رکا رہا وہ کہیں جا سکتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ وہاں سے جانے کے لیے اٹھا۔ اس نے چند ایک غیر متوازن سے قدم اٹھائے لیکن زیادہ دور نہ جا سکا۔ بچے کے چلانے کی آواز اس کو پیچھے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس نے بھاری سانسوں کے ساتھ راستے کو طے کرتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کر کے پیچھے آنا شروع کیا۔ وہ اب بھی جھجکتے ہوئے ایک بار پھر جھکا۔ تب اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ بنڈل کا غلاف چڑھایا۔ وہاں اخباری کاغذوں میں لپٹا ایک ننھا سا انسانی وجود مچل رہا تھا۔ اس آدمی نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ آدمی کی حرکت جبلی طور پر غیر واضح اور مبہم سی تھی۔ کسی ایسے شخص کی حرکت جسے معلوم نہ ہو کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے لیکن وہ ایسا کرنے سے خود کو روک نہ پا رہا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ سے سیدھا ہوا جیسے کہ وہ بہت ہی غیر متوقع قسم کے نازک حساسات میں جکڑ لیا گیا ہو جن سے چھٹکارا پانا اب اس کے لیے مشکل ہو گیا ہو۔ اس نے اپنی جیکٹ اتاری اس نے اسے اس کانپتی ہوئی گیلی سی مخلوق کا لباس بنا دیا۔

رفتار پکڑتے ہوئے اور تقریباً دوڑتے ہوئے اس نے اس روتے ہوئے بچے کے ساتھ اس کمرے کو پار کیا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆☆

مراد صرف نوف

مخطوطہ

میں ترکمان سائنس سوسائٹی کے لیے قدیم مخطوطات اکٹھے کر رہا تھا۔ اپنے اس کام کے ضمن میں ان چرواہوں کی بستی میں جا پہنچا جنھوں نے "کارا کم" صحرا کے وسط میں موجود ایک چھوٹی سی گہری وادی میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

چوں کہ یہ ایک قدرتی امر تھا اس لیے وہاں کے رہنے والے یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں کہاں سے آیا تھا اور یہ کہ وہاں میری موجودگی کا کیا مقصد تھا۔ میں نے انھیں اپنے کام کے بارے میں بتایا۔ اجتماعی فارم کے بیٹے میں نے، جس کے پاس میں ٹھہرا ہوا تھا، بتایا کہ اس کے پڑوسی دورت آغا کے پاس وہ چیز موجود تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔

"یہ ایک نایاب چیز ہے۔" اس نے کہا۔ "دورت آغا اپنے تمام اثاثے سے زیادہ قیمتی اسے ہی تصور کرتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ ایسی کتاب کو سونے کے صندوق میں رکھنا چاہیے۔"

میں اس کے مالک کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ دورت آغا گھر پر ہی تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا، جس کی خوب صورت داڑھی اس کے سینے پر پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے تجسس بھرے انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایک شکاری جیسا تھا مگر اس کا اندر دوستانہ تھا۔

"نوجوان۔ یہاں آتش دان کے قریب بیٹھو۔" اس نے نرمی سے کہا اور مجھ سے سوالات کرنے لگا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" میں نے اسے بتایا۔

"تم کہاں پیدا ہوئے تھے؟ تمھارا قبیلہ کہاں ہے؟ تم کیا کرتے ہو؟"

میں نے اختصار کے ساتھ اپنے متعلق بتایا اور گفتگو بڑھاتے ہوئے کہا کہ "مجھے اکیڈمی کی طرف سے قدیم مخطوطات کا کھوج لگانے کا کام تفویض کیا گیا ہے۔"

بوڑھے آدمی نے اپنی داڑھی کو تھپکتے ہوئے کہا "بہت اچھی بات ہے بہت ہی اچھی"
اس نے مجھ سے مزید سوالات کیے اور پھر اپنی بیوی کی طرف مڑتے ہوئے کہا "وہ کتاب
لاؤ"

بوڑھی عورت خاموشی سے خیمے کی جالی دار دیوار سے لٹکتے ہوئے موٹے کپڑے کے تھیلے کی طرف بڑھ گئی اور نہایت احتیاط کے ساتھ کڑھائی شدہ ریشمی کپڑے میں لپٹی کتاب نکالی۔ ایک مقدس یادگار کی طرح اس نے نہایت احترام کے ساتھ اسے اپنے خاوند کے حوالے کر دیا۔

بوڑھے آدمی نے دوبارہ میری طرف غور سے دیکھا۔

"جیسے تم نے بتایا ہے کہ تم خاص اسی مقصد کے لیے آئے ہو تو تم خود محسوس کرو گے کہ یہ کتنا قیمتی خزانہ ہے۔"

بوڑھی مخطوطہ ایک ایسے بدرنگ سوتی کپڑے میں لپٹا ہوا تھا جس پر اب بھی معدوم ہوتے ہوئے قرمزی پھولوں کی بوٹیاں موجود تھیں۔ اس کے ہر صفحے پر سرخ روشنائی میں عربی رسم الخط کی نہایت خوبصورت سطریں موجود تھیں۔ متن بالکل واضح تھا کیوں کہ نقل کرنے والا اپنے کام سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ہر حرف ایک چھوٹے سے موتی کی طرح تھا۔ کتاب یقینی طور پر کثرت سے پڑھی جا چکی تھی۔ صفحات کے کونے مڑے تڑے اور گندے تھے۔

میں نے چند سطور کا مطالعہ کرتے ہوئے جلدی جلدی ورق گردانی کی۔ یہ متن ایک مخطوطہ تھا جس کی وجہ سے میرے جیسے پیشے سے منسلک لوگ راتوں کو جاگنے، ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سفر کرنے اور ہزاروں دروازوں پر دستک دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سینکڑوں دور افتادہ مقامات پر خیموں کی خاک چھاننے پر شاید ایسی قیمتی چیز تلاش نہ کر پاتا جیسی کہ اس وقت میرے ہاتھوں میں تھی۔

سب سے بڑا کام اپنے جوش کو بوڑھے آدمی سے چھپانا تھا لیکن جلد ہی یہ بات عیاں ہو گئی کہ وہ اپنی اس چیز کی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف تھا اس لیے وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ "اس کتاب کا ہر لفظ ایک اونٹ اور اس کے بچے جیسی قدر کا حامل ہے۔"

میں نے بوڑھے آدمی کا امتحان لینے کی خاطر کئی پیراگراف نہایت اونچی آواز میں پڑھے جب میں چند سطریں پڑھ لیتا تو وہ اپنی یادداشت کے کمال ہوتے ہوئے اس سے آگے سے بیان کرنا شروع کر دیتا

"ہاں تو نوجوان اب تو تمہیں یقیناً پتہ چل گیا ہوگا کہ کیوں یہ کتاب ایک سونے کے صندوق میں رکھے جانے کے قابل ہے؟"

اس نے کانپتی کی آواز میں ایک نظم مجھے سنائی۔۔۔ یہ یقیناً اس کی پسندیدہ نظموں میں سے ایک تھی

"تم کو یہ کیسی لگی؟" اس نے پرجوش انداز میں پوچھا۔

"جوں جوں تم پڑھتے جاؤ گے تم اس کے اسیر ہوتے چلے جاؤ گے۔"

یہ سب کچھ تو واقعی بہت اچھا تھا لیکن اب مسئلہ تو اس کتاب کو اپنے قبضے میں لینے کا تھا۔ بوڑھے آدمی سے اس کا حصول بظاہر ناممکن تھا خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کی بیوی اور اس کے پڑوسی اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔

میں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا موضوع ہی بدل دیا۔ میں نے بوڑھے آدمی سے پوچھا یہ واقعی اس کا قبیلہ آموداریا میں فارم کرنے اور وہاں آباد ہونے کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس نے میرے سوال کا جواب دیا اور کتاب کی خوبیاں بیان کرتا رہا۔ اسے اس انمول خزانے کا مالک ہونے پر بہت فخر تھا اور وہ اسے اپنے سے جدا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

میں نے اس مخطوطے کو حاصل کرنے کے طریقہ کار سے متعلق اجتماعی فارم کے چیئرمین سے مشورہ کرنے کا سوچا اور وہاں سے چلا آیا۔

"اس کو حاصل کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "وہ تو شاید مجھے اس کی نقل کرنے کی اجازت بھی نہیں دے گا۔"

اجتماعی فارم کے چیئرمین نے جواب دیا "اگر تمہیں اس کی اتنی شدید ضرورت ہے تو تم خود ہی اس کو حاصل کرنے کا کوئی راستہ نکالو میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

اسی شام کو میں پھر وہ مورت آغا سے ملنے جا پہنچا۔ ایک بار پھر اس نے مجھے نہایت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا "میں جانتا تھا کہ تم پھر آؤ گے جو کوئی بھی میرے اس خزانے کو ایک نظر دیکھ لیتا ہے دوبارہ ضرور آتا ہے۔ تم اس حوالے سے پہلے شخص نہیں ہو اور تم آخری بھی نہیں ہو گے۔"

"ٹھیک ہے اگر تمہاری خواہش ہے تو اس کا مطالعہ کر لو۔"

میں اپنے دل میں چھپی خواہش کو کسی حد تک آشکار کرنے پر آ گیا۔

"ضرورت ہے؟"

"ہاں"

"کتنے عرصے سے یہ کتاب تمھارے پاس ہے؟"

"چالیس سال سے۔"

"چالیس سال سے۔۔۔؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں بیٹے۔"

"اچھا تو اسی لیے تمھیں اس کی بہت سی شاعری زبانی یاد ہے۔"

"اس کتاب کا ہر لفظ میرے دل پر نقش ہے۔ میں سارے کے سارے گیت گا سکتا ہوں۔ ان کی عظمت میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔"

"یہ غیر معمولی بات ہے" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تمھیں اس کتاب کو پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی۔"

بوڑھے آدمی نے تیز نظروں سے مجھے گھورا۔

میں قدرے پریشان سا ہو گیا مگر میں نے اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "تم جو چاہو اس کا معاوضہ مجھ سے لے لو مگر یہ کتاب تم مجھے دے دو۔"

بوڑھے آدمی میں ایک عجیب سی تبدیلی در آئی۔ اس کی آنکھیں ایک دم پھیل سی گئیں۔ اس کی حالت غیر ہو گئی اور وہ چلا پڑا۔ بوڑھے آدمی نے کتاب اپنی بیوی کے سپرد کرتے ہوئے کہا "اسے فوراً واپس وہیں رکھ دو۔"

اپنی حالت پر قابو پا کر وہ دوبارہ جزم آواز میں بولا:

"میرے بچے! میں اور میری بیوی نے پہلے ہی اس بات کی وضاحت کیوں کر دی کہ ہم سے کبھی پیسے ہاتھوں سے نکلنے نہیں دیں گے۔"

"اور چونکہ تم مہمان ہو، اس لیے ایک بار پھر میری تم سے درخواست ہے کہ اس بات کو اب نہ دہرانا۔ کسی طرح میں مان بھی جاؤں تو میری بیوی کبھی اسے دینے پر رضامند نہیں ہوگی۔ اگر وہ بھی دینا کرنے پر تیار ہو جائے تو قبیلہ اس سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوگا۔ بدترین قحط کے دور میں بھی جب کہ گھر میں اناج کا ایک دانہ تک نہ تھا، میں اس کتاب کو بیچنے کا خیال بھی دل میں نہیں لایا اور پھر اس

کے علاوہ تم نہیں جانتے کہ یہ میرے قبیلے میں کیسے آئی؟"

بوڑھا آدمی خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ اتنی نرمی کے ساتھ گویا ہوا جیسے کہ وہ خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

"کیا میں تمہیں بتاؤں کہ میں نے اسے کیسے حاصل کیا تھا؟ میں نے یہ بات پہلے کسی کو نہیں بتائی۔ میرے اور میری بیوی کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا آدمی اس کہانی سے واقف ہو گا۔"

"پلیز مجھے بتائیے۔۔۔۔ ملہورت آغا۔" میں نے کہا اور ایسا کہتے ہوئے اب مجھے اپنے تجسس کو چھپانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ملہورت آغا نے اپنا ہاتھ خیمے کی دیوار پر مارتے ہوئے اوپر کی طرف دیکھا اور پھر اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی۔

"میں اس وقت ۶۵ سال کا ہوں۔ یہ کتاب میرے پاس پچھلے چالیس سال سے ہے۔ جس دن میں نے کتاب حاصل کی اس دن کوئی بہت سال کہا گیا تھا۔ میں ان دنوں چرواہا تھا۔ جیسا کہ میں ہمیشہ رہا ہوں اور مجھے اس بات کا کچھ شعور نہیں تھا کہ کتابیں کیسی ہوتی ہیں۔ میں نے صرف ان کے بارے میں سن رکھا تھا۔ میں شادی کر چکا تھا اور اپنے والد کے خیمے میں رہائش اختیار کر چکا تھا۔ تب میں نے ایک دنبی خریدی۔ چونکہ میں اب بال بچوں والا شخص تھا اور میری کچھ ذمہ داریاں تھیں اس لیے میں نے موسم سرما کے لیے کافی مقدار میں اناج ذخیرہ کرنے کے لیے "ارکاچ" جانے کا قصد کیا۔ میں نے اپنی دنبی پر کچھ اون لادی، تھوڑی سی بکری جلا کر کوئلہ حاصل کیا اور چل پڑا۔ میں "ارکاچ" میں کسی کو نہیں جانتا تھا اس لیے جس شخص کے ہاتھ میں نے اون اور کوئلہ بیچا تھا اس کے پاس ٹھہر گیا۔ وہ ایک امیر آدمی تھا۔ شام کے وقت قبیلے کے لوگ اکٹھا ہونا شروع ہوئے۔ ان میں سے ایک اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑے خانہ والا لباس پہن رکھا تھا اور اس کی داڑھی حکم کے پتے پر موجود شکل جیسی تھی۔ اس کا چہرہ بھاری اور سرخ تھا۔ لوگوں نے اسے ملاں کہہ کر پکارا۔

تب مہمانوں میں سے ایک نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "محترم ملاں صاحب! کیا آپ ہمارے لیے کچھ پڑھنا پسند فرمائیں گے؟"

"کسی نے اسے یہ کتاب پکڑا دی لیکن ملاں نے انکار کرتے ہوئے کہا "ارے بے مغز! اس کتاب کو ایک پاگل شاعر نے لکھا تھا جس نے مقدس عقیدے کی تضحیک کی تھی۔ یہ فرسودہ حیات، گندگی اور گمراہ کن بدبختوں کا پلندہ ہے۔ یہ تو نہیں البتہ ایک اور چیز آپ کے لیے پڑھوں گا اور اس نے اپنے

لہجے سے ایک ارتعاش محسوس کیا لیکن لوگ اس کو سننے پر آمادہ نہ ہوئے۔ کسی نے اسے تحفہ دینے کا وعدہ کیا تو اس نے پہلے والی کتاب ہی پڑھنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ وہ آدھی رات تک پڑھتا رہا پھر صبح تک پڑھتا گیا اور میں نے ایک مبہوت شدہ شخص کی طرح اسے سنا۔ کتاب نے تو ان کو دیوانہ کر دیا تھا۔ میرے اندر کچھ ہو رہا تھا۔ کافی دیر تک میں کچھ بھی نہ سنا۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ یہاں ایک شخص تھا جو کائنات کو اٹھ پلٹ رہا تھا اور اس کے ارد گرد ایک شخص کو زندگی کی کہانی سنائی جا رہی تھی۔ لیکن میں جو ہر لفظ کے ساتھ اپنے آپ کو بدلتا ہوا محسوس کر رہا تھا مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ میری ہی کہانی مجھے سنا رہا تھا۔ الفاظ بے حد واضح اور پرکشش تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کتابیں اتنی طاقتور بھی ہوتی ہیں اور زندگی کو اس خوبی سے بیان کرتی ہیں کہ وہ دل کو مختلف انداز میں دھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔ میں نے اس طرح سوچا جیسے آج تم نے سوچا ہے شاید دنیا میں اتنی دولت موجود ہو جو اس کتاب کو خرید سکے کیوں کہ ایسی چیزیں بکاؤ مال نہیں ہوا کرتیں۔ میرے اندر ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اس کتاب کی کوئی قیمت مقرر ہے اور میرے پاس اتنی رقم موجود ہو تو مجھے اسے ضرور خرید لینا چاہیے۔"

اگلی صبح جیسے ہی میں نے اپنے میزبان کو دیکھا تو کہا "پچھلی رات مجھ سے جو کتاب پڑھی تھی اس کی قیمت کیا تھی؟"

وہ ہنس کر کہنے لگا "اس کی کوئی مقررہ قیمت تو نہیں ہے کتاب کسی عورت کی شال یا کوٹ سے بھری پوری نہیں ہوتی۔ تم آسانی سے اس کی قیمت کا اندازہ لگا سکتے۔"

وہ پھر ہنس پڑا اور اس نے اس وقت کمرے میں موجود ایک مہمان کے ساتھ اپنی نظروں کا تبادلہ کیا۔ پھر وہ بولا "اس کی قیمت ہے ایک ڈالر ..... ایک اچھا ڈالر۔"

شاید وہ مذاق کے موڈ میں تھا لیکن میں نے اس کے الفاظ کو سنجیدگی سے یا ناخوشی سے چھوڑ دیا۔ فوری طور پر میں نے اسے اپنی وفنی ہیٹ کا فیصلہ دیا جس پر سوار ہو کر میں "ارکانج" آیا تھا۔

"میرے پاس ایک بہت عمدہ وفنی ہیٹ ہے جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہے۔ یہ دونوں لے لو اور کتاب دے دو۔"

میرے میزبان نے کہا "ٹھیک ہے ..... وفنی چھوڑ جاؤ اور کتاب لے جاؤ ..... خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

میں نے ایک نظر وفنی کی طرف دیکھا کتاب کو اپنی بغل میں دبایا اور واپس گھر کی طرف چل

پڑا۔ گھر تک پیدل چلنے میں مجھے تین دن لگے۔

میری بیوی نے جب مجھے آتے ہوئے دیکھا تو چلاتے ہوئے کہا "ہماری اونٹنی کہاں ہے؟ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟"

میں نے کہا "زرا دم تو لینے دو۔۔۔۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔۔۔ تم یقین کرو خوش ہو جاؤ گی۔ ہمیں اپنی اچھی نسل کی اونٹنی کا اچھا نعم البدل ملا ہے۔ پھر میں نے اس کو کتاب دکھائی اور کہا "یہاں اس کپڑے کے غلاف کے اندر صرف ایک اچھی نسل کی اونٹنی سے زیادہ قیمت کا حامل ہے۔"

میری بیوی نے کتاب دیکھی۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا پھر اس نے اسے ماتھے سے لگایا اور اسے اپنے چہرے سے مس کیا۔ اس کے خیال میں یہ ایک مقدس کتاب تھی۔ وہ وہاں خاموش کھڑی رہی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت رو دے یا ہنسے؟۔۔۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت اونٹنی کے متعلق سوچ رہی تھی، جو ہمارے غریب گھرانے کی آخری امید اور سہارا تھی۔

میں نے اسے بتایا کہ کیسے اس کتاب کو ملاں نے پڑھا تھا کیسے لوگوں نے اشتیاق سے اسے سنا تھا اور خود میں بھی اسے سنتے ہوئے جذباتی ہو گیا تھا۔ میں نے جو کچھ سنا تھا اور جس نے میری یادداشت پر اپنی چھاپ لگا دی تھی، اس میں سے اسے کچھ کچھ بتایا۔ میں نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں آنسو نکلتے دیکھے۔

"تم تصور کرو گے کہ تم نے ایک بے وقعت چیز کے لیے اپنی اونٹنی گنوا دی۔۔۔۔ وہ ہمارے لیے سب کچھ تھی۔"

اپنی بیوی کی بات سن کر اس لمحے مجھے افسوس سا ہوا کہ میں نے کتاب خریدی تھی۔ لیکن میں یہ کر سکتا تھا؟ مجھے گاؤں کے سیانے آدمی کے پاس جانے کا مشورہ دیا گیا۔ میں نے اسے کتاب کے متعلق بتایا اور اسے کہا کہ وہ مجھے کوئی ایسا شخص بلوا دے جو یہ کتاب پڑھ سکے۔

اس نے حیرانی سے پوچھا "تمہیں یہ کیسے ملی؟"

میں نے اسے بتایا کہ مجھے یہ بہت سستی ملی ہے

اس نے کندھے چکائے مسکرایا اور بولا "یہ تم نے کوئی عقلمندی نہیں کی۔ اگر تمہیں یہ تحفے کے طور پر بھی ملی ہوتی تب بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب اسے پڑھے گا کون؟ وقت گذرتا گیا اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ میری بیوی دن رات بڑبڑاتی رہی۔ میں نے لوگوں کے ساتھ بھی مشورہ کیا اور

دوسری بستیوں میں بھی گیا لیکن مجھے کوئی ایسا شخص نہ مل سکا جو اس کتاب کو پڑھ سکتا۔ عام طور پر لوگ کہتے

"تم ایک غریب چرواہے ہو۔۔۔ تمھارا ایسی چیزوں سے کیا واسطہ؟"

اور میں نے اپنا اعتماد کھونا شروع کر دیا۔ ایک دن میں نے اپنے اس خزانے کو بوری میں ڈالا اور کچھ جو چیز میرے ہاتھ لگی میں نے اس کے اوپر بوری میں بھر دی۔ وہاں یہ کتاب ایک سال دو سال پورے سات سال تک پڑی رہی۔ اور ان سات سالوں میں میری بیوی اپنی اس نئی اونٹنی کو دودھ کے روتی رہی جس کے ساتھ اس کا ایک کم سن بچہ بھی تھا اور وہ کہتی کہ "اب تک اس نے ہمیں تیس مزید اونٹ دے دیے ہوتے۔ ہم اس وقت امیر ہوتے ہمارے تمام دکھ دور ہو چکے ہوتے۔"

اور پھر ایک دن وہ مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہتی "تم کسی ایسے شخص کی تلاش کیوں نہیں کرتے جو اس کتاب کو پڑھ سکے۔"

ایک دن جب ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے تو وہ کہنے لگی: "صرف ملاں اور عامل لوگ پڑھنا جانتے ہیں۔ یہ تمھارے خیال میں ہمیں اپنے بیٹے عورت جان کو کسی ایسے عقلمند آدمی کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجنا چاہیے؟ وہ وہاں پڑھنا سیکھ لے گا تو پھر وہ ہمارے لیے یہ کتاب پڑھ سکے گا۔ عامل اکشی کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہمیں اپنے بیٹے کو اس کے پاس بھیجنا چاہیے۔ ہم اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ اسے پانچ سال کے اندر لکھنا پڑھنا سیکھ لینا چاہیے۔"

میری بیوی کے الفاظ نے میری حوصلہ افزائی کی۔ جہاں تک کتاب کے پڑھے جانے کا سوال تھا تو اس کے لیے میں کسی بھی چیز کے لیے تیار تھا۔ اور اسی طرح میں اپنے بیٹے کو عامل اکشی کے پاس لے گیا۔ میرے بیٹے کی عمر اس وقت صرف آٹھ سال تھی۔ میں نے عامل اکشی سے کہا۔

"ہم بہت دور سے ایک درخواست لے کر آئے ہیں۔ کیا آپ میرے بیٹے کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں گے؟ جب تک وہ آپ کے پاس رہے گا، آپ اس کے آقا ہوں گے۔ اگر اسے مارنا پڑے تو اسے ماریں مگر اسے پڑھنا لکھنا ضرور سکھا دیں۔"

عامل نے مجھے امید دلائی۔

اس نے کہا "تم نے اپنے بیٹے کو یہاں میرے پاس لا کر اچھا کیا۔ جو کوئی میرا تحفہ لیتا ہے وہ فہم و ادراک کا مالک بن جاتا ہے۔ تم دیکھ لو گے کہ تمھارا بیٹا میری نگرانی میں کتنا بہتر ہو جائے گا۔ چار سالوں کے بعد جب آؤ گے تو اسے پہچان نہیں سکو گے۔"

میں نے اس پر خفا ہوا اور خوشی خوشی لے میں جھومتا ہوا واپس لوٹا۔ میں نے بیوی سے کہا "غم نہ کرو۔ چار سال بعد تم جان جاؤ گی کہ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ پھر تم مجھے بتانا میری غلطی تھی یا نہیں۔"

تین سال بیت گئے تو میں نے سوچا کہ اب تک سورت خان نے کافی کچھ سیکھ لیا ہوگا اس لیے میں اس سے ملنے چلا گیا۔ لیکن میں نے وہاں کیا دیکھا؟

میرے بیٹے کو سارا سارا دن دوسرے کاموں پر لگائے رکھا جاتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں سیکھا تھا اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس سے یہ اتنی مشقت کیوں لی جاتی ہے۔ میرے بیٹے نے التجا کی کہ میں اس کو وہاں چھوڑ کر نہ جاؤں۔ وہ کہا کہ اپنے ساتھ لے جاؤں۔ نہیں تو عامل اسے معمولی غذا کے عوض کام پر لگا کر کمائی کرتا رہے گا۔ میرے بیٹے نے کہا "وہ تو خود جاہل ہے۔ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ ایک عامل کے بارے میں ایسی بات منہ سے نکالنا بری بات تھی۔ لیکن سورت خان نے چلا کر کہا "ابو! تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے تو میں نہیں بھاگ جاؤں گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں پریشان ہو گیا اور میں نے اپنے بیٹے کی سچائی کو جانچنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے عامل آشی کے ایک ہمسایہ کو بلا کر اسے ساری صورت حال بتائی۔

میں نے اس سے پوچھا "کیا تمہارے خیال میں عامل میرے بیٹے کو پڑھنا لکھنا سکھا دے گا؟"

اور جو کچھ مجھے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ میرا بیٹا سچ بول رہا تھا۔ عامل آشی نہ تو پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی لکھ سکتا تھا تو پھر یہ بات تھی کہ کوئی تعلیم یافتہ ملاؤں سے زیادہ طاقتور تھا؟ اس کی طاقت اس کے خاندان کی طاقت میں پوشیدہ تھی کیوں کہ اس کے خاندان کے پاس ایک بڑا راز تھا۔ سارا قبیلہ اس کے آباؤ اجداد کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کسی کو ان کے خلاف بولنے کی جرأت نہ تھی۔ لوگوں کی زبانی مجھے جس بات کا پتہ چلا وہ یہ تھی "ایک بار ایک بھوکا وہاں ہوا۔ ایک انسان نے عامل آشی کے آباؤ اجداد میں سے ایک کا جو خود بھی ایک عامل تھا، گھاس کا گٹھا چرا لیا۔ جب وہ شخص گھر پہنچا تو وہ گٹھے کو اپنی پیٹھ سے نیچے نہ اتار سکا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے اپنے بیٹے کو بلایا مگر بے سود۔ چور پریشان ہوا اور اس گھاس کے گٹھے کو واپس اسی جگہ رکھنے چلا گیا مگر وہ وہیں اٹکا رہا۔ ساری رات وہ پریشانی کی حالت میں اس بوجھ کو پیٹھ پر اٹھائے گاؤں میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ مالک کے پاس واپس جائے اور اپنے جرم کو تسلیم کر لے۔

اس نے کہا "اے عامل! میں نے ایک جرم کیا ہے اور ساری رات اپنی بدی کو پیٹھ پر لادے

پچھتا رہا ہوں۔ مجھے عامل میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں اور تم سے معافی کا طلب گار ہوں۔ گھاس کو میری پیٹھ سے جدا کر دو۔ عامل نے اسے معافی دے دی اور اسے واپس اسی جگہ بھیج دیا، جہاں سے اس نے گھاس کا گٹھا چرایا تھا۔ عامل کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا اور گھاس کا گٹھا چور کی پیٹھ سے نیچے گر گیا۔ عامل کی کایہ رنگ ایک جادوگر تھا اور ایسے ہی عامل اکثر بھی ہے۔ اس کی طاقت کا راز نمک میں مضمر ہے۔ اگر وہ نمک پر پھونک مارے اور جادوئی الفاظ ادا کرے تو بے جان چیزوں کو اور دل جاتی ہے اور یہ شعلہ آب ہو جاتے ہیں۔"

جب میں نے یہ سب کچھ سنا تو میں نے وقت ضائع کیے بغیر سورت خان کو ساتھ لیا اور گھر واپس آ گیا تاکہ وہ جادو جان سکے۔ میں قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ وہ نمک پر پھونک مارنا سیکھ لے۔ اس طرح مہینے اور سال گزرتے گئے۔ موسم بہار میں ہم نئی چراگاہوں کی طرف کوچ کر جاتے ہیں اور خزاں میں ہم پھر وادی میں آ جاتے ہیں۔ اور اس تمام عرصے میں یہ کتاب میری بوری میں پڑی رہی۔ بعض اوقات جب میں بہت فارغ ہوتا تو اسے نکال کر اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا۔ میں اسی انداز میں بیٹھتا جیسے مدرسے میں بیٹھتا تھا اور اس کتاب کو ہر جگہ سے چھوتا مگر کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ کتاب گونگی بنی رہتی۔ میری بیوی پھر مجھے کہنے لگتی "اگر ہم نے اس موٹی کتاب کو ہاتھ نہ لگایا ہوتا تو اس کے بجائے ہمارے پاس بہت اچھی نسل کے اونٹوں کا ایک ریوڑ ہوتا۔"

اور پھر ایک نئی صبح طلوع ہوئی اور ہماری بستیاں انقلابیوں کے زیر اثر آ گئیں۔ اب اساتذہ بھی آ گئے اور انھوں نے ہمیں کتابیں لا کر دیں۔ ایک استاد ہماری بستی میں بھی آیا۔ اس نے سارے بچوں اور بڑوں کو جمع کر لیا جو پڑھنا لکھنا سیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے استاد کو دیکھتے ہی اسے پسند کیا اور اسے اپنی اس کتاب کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے کتاب لانے کو کہا اور چند روز تک اس نے یہ کتاب اپنے پاس رکھی۔

اس نے کہا "ڈیورٹ آغا تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ یہ بہترین ترکمانی مخطوطات میں سے ایک ہے۔ اپنے بیٹے کو سکول بھیجو میں اسے لکھنا پڑھنا سکھاؤں گا۔ میں اسے جلانے والی لکڑی اکٹھی کرنے یا پانی لانے نہیں بھیجوں گا۔ مجھے کسی غلام کی ضرورت نہیں۔ وہ چند سال تک سکول میں پڑھے گا اور پھر اپنی ماں اور ابا کے سامنے بیٹھ کر یہ کتاب پڑھے گا۔"

میں جانور چرانے کے لیے گئے ہوئے سورت خان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ میں نے اسے

بتایا "تم اب سکول جاؤ گے۔"

مورت خان نے میری بات سنی مگر گھر جانے سے انکار کر دیا۔

"میں دوبارہ کسی ملاں یا عامل کو دیکھنا پسند نہیں کرتا۔" اس نے کہا "شہروں اور گاؤں میں اب انقلابی آ گئے ہیں اور کسی عامل کی بیوی اب مجھے پانی ڈھونے پر نہیں لگا سکتی۔"

میں نے اسے سمجھایا کہ ہماری حکومت نے ہماری بستی میں ایک استاد بھیجا ہے، جو لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھائے گا۔ آخر میں نے اسے قائل کر ہی لیا۔ وہ گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتا، باقی وقت میں وہ لکھنا پڑھنا سیکھتا۔ آج کل وہ قریبی ضلع میں مویشیوں کی افزائش نسل کے ایک فارم میں بھیجا ہے۔

جب وہ اچھی طرح لکھنا پڑھنا سیکھ گیا، تو میں نے بوری میں سب سے نیچے پڑی کتاب نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ تب میں نے جانا کہ کتابیں کوئی ماورائی چیز نہیں ہوتیں بل کہ انھیں ہم جیسے لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں ایسے گیت بھی تھے جو ہم چرواہے لوگ گایا کرتے تھے۔ لیکن کتاب میں رباعیاں اور ایسی نظمیں ہیں جو نیکی، بدی، سچائی اور جرأت سے متعلق ہیں۔ اس کے ذریعے لوگ اپنی خوشیوں کو پانے کا گر سیکھتے ہیں۔ میں نے اس وقت یہ بھی جانا کہ اس وقت جب ملاں نے اس کتاب کو پڑھا تھا تو میں نے بہت سی چیزوں کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھا تھا۔ جب میرے بیٹے نے اپنے خاندانی آتش دان کے پاس بیٹھ کر اس کتاب کو پڑھا تو اس کا ہر لفظ اتنا مؤثر خوب صورتیوں کے ساتھ ہم پر عیاں ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے میری بیوی اور بستی کے تمام لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ جب ولورت آغا بستی میں نے ایک اونٹنی کے بدلے میں اس کتاب کو حاصل کیا تھا تو میں نے کوئی دھوکہ نہیں کھایا تھا۔

"ہاں تو میرے بچے اب تو تم نے جان لیا ہو گا کہ اس کتاب کے لیے ہمیں کیا کچھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ میرے کنبے کی یہ داستان سن کر بھلا کون ہو گا، جو مجھ سے اس کتاب کو حاصل کرنے کی جرأت کرے گا؟ یہ تم سے اپنے اس کی گھر یوں سے پڑھو گے دوبارہ مجھ سے نہ مانگنا۔"

یہ رات کا پچھلا پہر تھا جب ولورت آغا نے اپنی کہانی ختم کی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے زیادہ مجبور کرنا زیادتی ہوگی۔ اگر میں کہتا کہ ہم شک آباد میں اس کتاب کی بہت سی نقلیں بنوائیں گے تب وہ اور اس کے گاؤں کا ہر شخص یہی ایک کتاب کا مالک بن جانے کا تو شاید وہ میری سننے پر ہی تیار نہ ہوتا۔ اگر میں اسے کہتا کہ میں اسے یہ کتاب اسی حالت میں دے دیتا تھا وہ بعد واپس کر دوں گا تو وہ تب بھی نہ

ماننا یہ سب کچھ ممکن تھا کیوں کہ یہ کتاب اس کی روح تھی اور یہ اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی

میں نے موقع غنیمت جان کر کہا "ڈھورت آغا"

"کہیے کیا بات ہے؟"

"کیا تم ایک عنایت کرو گے؟"

"کیسی عنایت؟"

"میرے ساتھ چلو۔" اس نے قہقہہ لگایا اور اپنی داڑھی کو اپنے ہاتھوں سے تھپکا۔ اس لمحے وہ مارخش نہیں تھا اور نہ ہی میرے الفاظ سنجیدگی سے لیا۔ "نہیں میرے عزیز مہمان۔ یہ بکاؤ نہیں۔۔۔۔ دنیا میں چند ایسی چیزیں بھی ہیں جو کسی قیمت پر خریدی نہیں جا سکتیں۔"

"لیکن بہر حال اسے کسی نے تمھارے ہاتھ بھی تو بیچا تھا؟"

"لیکن وہ بہت خسارے میں رہا۔" وہ پھر ہنسا۔

میں اسے کس طرح سمجھاتا کہ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہم نے بہت دیر تک آپس میں مباحثہ خیال کیا اور آخر اس کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔

"اچھے نوجوان" اس نے کہا "اگر تم اس کتاب کے اتنے ہی گرویدہ ہو گئے ہو تو بیٹھ کر اس کی نقل کر لو۔"

میں نے ڈھورت آغا کے خیمے میں بیٹھ کر دو ہفتوں میں اس قیمتی مخطوطے کی نقل تیار کی۔ وہ زیادہ تر وقت میرے پاس بیٹھا رہتا۔ بعض اوقات وہ اپنی یادداشت کے بل بوتے پر مجھے لکھوانے لگتا اور بعض اوقات خاموشی سے مجھے کام کرتا ہی دیکھتا رہتا۔ مجھے کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ اکثر کہتا "میں کسی قدر پڑھنا لکھنا جانتا ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ کبھی لکھنا نہیں سیکھ سکوں گا۔" بوڑھی عورت چائے اور کباب سے ہماری تواضع کرتی رہتی۔ کبھی کبھار کوئی دوسرا مشروب بھی لے آتی۔ اب ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔

ڈھورت آغا کے پاس چالیس سال سے جو اصول نظمیں تھیں ان کا شاعر ترکمان کلاسیکی شاعری کا موسس اور مشہور شاعر مخلص قلی ہے۔ فراغی (۱۷۳۰ء تا ۱۷۸۰ء) جس نے زیادہ تر حملہ آور ایرانی بادشاہوں، بخارا کے امیروں اور کھیوا کے خانوں کو پسپا کرنے کے لیے ترکمانی قبائل کے اتحاد کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے لکھا۔۔۔۔!

تہذیب مہاپوریا

چمپون

سپیشل وارڈ کی طرف جانے سے پہلے ہسپتال کے ڈاکٹر نے اطلاع مجھ سے کی "اس مریض کا تعلق بہت اچھے خاندان سے ہے اور اس کی کہانی کا تعلق ہو کہ اس کے دوستوں اور رشتہ داروں کی فراہم کردہ اطلاعات پہنچی ہے ان میں شامل وہ دولت مند لوگوں سے ہے جو کہ ابھی زندہ ہیں۔ اس کی بیماری کی علامات ایسی ہیں کہ ہم اپنے اس ہسپتال میں ان کے بارے میں کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ خاص طور پر طبی نقطہ نگاہ سے ہم اسے فاتر العقل قرار دینے سے قاصر ہیں۔ اصولاً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مریض کو ذہنی شدید صدمہ ہوا ہے۔ اس بات کو پانچ ماہ عرصہ ہو گیا ہے اور وہ ابھی تک اپنے آپ کو اس صورت حال سے باہر نہیں نکال سکا۔ سب کچھ اس کے ذہن سے محو ہو چکا ہے۔ جس نے اسے اس حال تک پہنچایا ہے، اسے صرف وہی واقعہ یاد ہے۔ اس کا دماغ کسی اور چیز کو قبول ہی نہیں کرتا اور یہی ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔ ہم نے اسے نارمل حالت میں واپس لانے اور چیزوں کے بارے میں اس کے نارمل ردعمل کو واپس لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ صحت یاب ہو جائے گا اور اگر ناکام رہتے ہیں تو . . . .

ڈاکٹر نے مایوسی کے انداز میں اپنے ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنے کندھے اچکائے۔

مریض کی عمر ستائیس یا اٹھائیس برس کے قریب تھی۔ وہ مضبوط جثے کا آدمی تھا اور اس کی بیماری نے اس کی ظاہری حالت کو بالکل متاثر نہیں کیا تھا جیسے کہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ تندرست اور کمزور تھا اور اس کی رنگت زرد تھی۔ ظاہری طور پر وہ بالکل پاگل نہیں لگتا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک ذہین اور بھلا شخص لگتا تھا۔ اس نے مناسب لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے ایک مہذب شخص کی طرح اٹھ کر ہمارا استقبال کیا۔ اس کی شخصیت ایک ہیروکار کی نہیں بل کہ ایک لیڈر کی سی تھی۔

ڈاکٹر نے جب میرا تعارف کرایا تو اس نے میری طرف عجیب سے انداز سے دیکھا۔ وہ پریشان کر دینے والی خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔ میں نے جو بھی کہا یا پوچھا مجھے اس کا جواب نہیں

ملا۔ مجھے ڈاکٹر کے تشبیہی الفاظ یاد آنے لگے۔

"میرے خیال میں تم کچھ عرصے تک بھوکت میں ضرور رہے ہو؟"

"نہیں ۔۔۔۔ بھوکت میں نہیں ۔۔۔۔ میں تائی مانگ میں رہا ہوں جو کہ پنگنگا میں واقع ہے ۔۔۔ وہاں میں ایک لمبے عرصے تک رہا ہوں۔"

"تائی مانگ، بہت سے کان کنی کے اضلاع کا مرکز ۔۔۔۔ میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟ وہاں کی زندگی تو بہت پرلطف رہی ہوگی۔"

"وہاں کی زندگی تو جہنم سے کم نہیں تھی۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی ۔۔۔ "کیا؟" "کیا وہاں کوئی ایسی صورت حال تھی جو دوسری جگہوں پر نہیں ہوتی۔ مثلاً دیانی کی طرح۔ یا دیانی اور اس جیسی دوسری عجیب عورت، شراب اور جوئے کی وجہ سے مشہور ہیں مگر تائی مانگ کی وجہ شہرت اس کے چپوں، مگرمچھ اور آتشی زخم ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں ۔۔۔۔ بھلا چپوؤں، مگرمچھوں اور آتشی زخموں کا آپس میں کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

اس نے کہا: "میں تمہیں ان کے متعلق بتاتا ہوں۔"

اس کے بعد تو وہ شروع ہو گیا۔ میں اس کی خاموشی توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ آگے جو کچھ ہوگا، وہ تمام کی تمام وہ کہانی ہوگی جو کہ میں نے اس سے حاصل کی۔ اس کہانی میں جہاں کوئی خلا ہو جاتا، وہ میں نے دوسری جگہوں سے ملنے والی اطلاع سے پُر کر دیا تھا۔ جگہوں اور اشخاص کے نام البتہ فرضی تھے۔

"میرا باپ پنگنگا کا گورنر تھا۔ میں نے اپنے وقت کے بنکاک کے بہترین سکولوں سے تعلیم حاصل کی۔ جب میں سولہ برس کا ہوا تو میری عادتیں بگڑ گئیں۔ میرے باپ نے مجھے واپس پنگنگا جانے کا حکم دیا اور میں سکول کے بورڈنگ میں واپس چلا گیا۔ میں وہاں پانچ سال رہا اور یوں میں نے اپنی سکول کی تعلیم مکمل کر لی۔ انہی دنوں میرا باپ ملازمت سے ریٹائر ہو گیا۔ میرا باپ ایسے لوگوں میں سے ایک تھا، جنہوں نے بہت پہلے سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہم تھائی باشندوں کو یہ ملکی معاشی معاملے سے اپنے آپ کو آزاد کر لینا چاہیے۔ اس نے ہمیشہ مجھے گورنمنٹ کی ملازمت کے بجائے بزنس لائن میں جانے کی ترغیب دی۔ اس نے آسانی سے اپنی بات منوالی۔ مجھے اس کی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔ میرا باپ

ریٹائرمنٹ کے بعد بنکاک چلا گیا تو میں خود مختار ہو گیا اور میں نے کان کنی کی ایک آسٹریلوی کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ میں اپنے تعلیمی حوالے سے اس کام کے لیے بالکل موزوں تھا کیوں کہ میں ملائے، جاپانی اور تیلگو تین زبانیں بول سکتا تھا۔ فرم اس شخص کو، جو انگریزی اور تھائی زبان کے علاوہ تین زبانیں جانتا ہو، منہ مانگی تنخواہ دینے کے لیے تیار تھی۔

تاہم میں نے آسٹریلویوں کے ساتھ صرف دو سال کام کیا۔ یونی کونڈا مائنگ کمپنی نامی ایک امریکی فرم نے تائی لینگ کے قریب ایک کان میں کھدائی شروع کی تو انھیں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو تیلگو مزدوروں کی دیکھ بھال کر سکے اور ساتھ ہی تھائی کارندوں کے درمیان رابطے کا کام بھی دے سکے۔ میں نے وہاں فوراً درخواست دے دی اور دس سے نو، دلوگوں میں سے جو سب سے کم تر تھے مجھے اس کام کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ مجھے تقریباً چار سو بھات ملنے لگے۔ منیجر نے اس کے علاوہ مجھے پتھر اٹھانے کی ذمہ داریاں بھی سونپ دیں اور یوں میری آمدنی آٹھ سو بھات تک جا پہنچی۔

ویسے تو جوانی میں کسی چوبیس سالہ نوجوان کا آٹھ سو بھات ماہانہ کمانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن اس آمدنی کی وجہ سے میری زندگی میں ایک واضح اور بنیادی تبدیلی تو آنی ہی تھی۔ جب میری آمدنی صرف دو سو بھات تھی تو میں کچھ پیسے بچا بھی لیتا تھا اس وقت میں ایک خاموش سی زندگی بسر کر رہا تھا ان دنوں میں صرف مطالعہ کرتا تھا اور کام کے بعد ریڈیو سنا کرتا تھا۔

لیکن جب میں نے آٹھ سو بھات کمانا شروع کر دیے تو گزارہ کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ پیسے کم پڑنے لگے اور یہ کوئی خوش کن بات نہ تھی۔ مائے اسوئے لیکن میں نے معاشرے کے ایک خاص طبقے میں بہر حال اپنے لیے ایک جگہ بنا لی تھی۔ جہاں کہیں بھی عورت، شراب اور جوئے کی محفل سجائی جاتی، وہاں میرا ذکر ضرور ہوتا۔ میں ان محفلوں کی جان تھا۔

میں کچھ دوستوں میں بھی آگے تھا۔ میں کسی کو بھی اپنے سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دیتا تھا میں چرکار کی بنا پر لیڈر رہا اور میں نے اپنا کردار بہت اچھی طرح سے نبھایا۔ مجھے یقین ہے اس سلسلے میں میری مالی حیثیت نے بھی اپنا رول ادا کیا تھا۔ چاہے مقامی لوگوں کی دیگر محفلوں کی محفل ہوتی میں ہی کا حصہ بن جاتا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ میری دولت نے ہر ایک کو میرا دوست بنا دیا تھا

میری پسندیدہ محفلیں جہاں میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتا تھا وہ تائی لینگ کے مختلف کلب تھے۔ ہمارا قصبہ اس علاقے کا مرکزی علاقہ تھا جہاں سے سڑکیں تمام اطراف کو جاتی تھیں۔ یہاں سے

آدمی بہت سے علاقوں کی طرف جا سکتا تھا اور میری کمپنی کا ہیڈ کوارٹر یہاں سے بہت نزدیک واقع تھا۔ ساری ہی دلچسپیوں کے سامان، یہاں اردگرد موجود تھے

اب جو کچھ میں بیان کرنے جا رہا ہوں اس پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

تانی مانگ سے دریا کے دہانے تک پہنچنے کے دو راستے تھے اور وہیں کمپنی کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا یہاں سے دوسرے کنارے کی سمت میں دریا کے بہاؤ کے مخالف رخ میں چلتے ہوئے، کسی کشتی کے ذریعے تم تھوڑے وقت میں وہاں تک جا سکتے تھے۔ اگر آپ بس پر جانا چاہیں تو آپ دریا کے بہاؤ کی سمت میں تانی مانگ کی طرف چلتے ہوئے دریا کے دہانے تک پہنچ سکتے تھے۔ البتہ اس طرح وقت زیادہ لگتا تھا۔ اس طرح متواتر پانچ چھ گھنٹوں تک بیٹھے رہنے سے آدمی اکڑ کر رہ جاتا تھا اور طریقہ تماشا یہ تھا کہ بس کا مل جانا بھی کوئی یقینی بات نہیں تھی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آپ کشتی کے ذریعے دریا عبور کر کے، دریا کے دہانے کے قریبی علاقے میں پہنچ جائیں۔ پھر جنگل میں سے پیدل چلتے ہوئے آپ تانی مانگ جا سکیں۔ اس طرح تین گھنٹوں میں آدمی وہاں جا پہنچتا تھا۔ لیکن اس سفر کی کچھ اپنی قباحتیں بھی تھیں۔ جنگل کے ان راستوں سے واقفیت نہ ہونے کی بنا پر آپ جنگل میں گم بھی ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ دریا کا یہ حصہ بہت خون خوار قسم کے مگرمچھوں سے بھرا پڑا تھا۔ جب میرا باپ مگرمچھوں سے متعلق کا گورنر تھا تو میں پاک پور جنگل میں اس کی مگرمچھوں کے شکاری مہموں میں اس کے ساتھ آیا کرتا تھا کیوں کہ یہ علاقہ مگرمچھ کے شکار کے لیے نہایت موزوں تھا۔ پھر بھی ہماری کان کنی کے قریب کا دریائی علاقہ اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یہاں کے مگرمچھ کشتی میں سوار لوگوں پر چپکے چپکے حملہ کر دیتے تھے۔ اسی لیے یہ بات حیران کن نہیں تھی کہ یہ ویران علاقہ تھا اور کشتی کے چند خاندان ہی یہاں دریا کے کناروں پر آباد تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ چھوٹی کشتیوں پر یہاں سے دریا عبور کرنے کی کوئی کمپنی ہمت نہ کرتا تھا۔ بحوکت صورت یہ تھا یہ بہت بدنام جنگل تھا تانی مانگ کے علاقے کے لوگ جو ہماری کانوں کو دیکھنا چاہتے تھے، اس وقت تک رضامند نہیں ہوتے تھے جب تک انہیں یہ یقین نہیں ہو جاتا تھا کہ کشتی، جس میں وہ سفر کریں گے، بہت مضبوط ہو گی اور اس کی دیواریں بھی دونوں طرف سے اونچی اور محفوظ ہوں گی۔

بہر حال میں خود کمپنی کی بڑی اور محفوظ کشتی استعمال کرتا تھا۔ اس طرح میں نہایت ہی خطرناک

ترین علاقوں سے بھی گزر جاتا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر میں جنگل میں سے ہو لیتا تھا۔ یہ راستے اب خوب اچھی طرح سے میری پہچان میں آ چکے تھے۔ پھر بھی میری خواہش ہوتی تھی کہ میں اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے جنگل عبور کر لوں۔ شیر کے پاؤں کے نشانات اس علاقے میں اکثر دیکھے جاتے تھے۔

ہاں تو اب آپ سمجھے کہ یہ تھی وہ شخص جگہ تھی یعنی اپنے قصد کے حوالے سے حتیٰ کہ یہاں کے شیر اور مگر مچھ بھی آپس میں تال میل نہیں رکھتے تھے۔ میں شیخی میں گھار بیلیں میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں تانی وانگ کا سب سے بڑا شکاری تھا۔ علاقے میں اپنی اسی پہچان کی بنا پر تانی وانگ کی سارے جوکت کے ایک نہایت اہم شخص کے ساتھ میری ٹھن گئی۔ یہ شخص تاؤ کے سون تھا۔

تاؤ کے سون یہاں "بگ برادر سون" کے نام سے بھی جانا پہچانا جاتا تھا۔ اب اگر یہ شخص بنکاک میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کے نام کو چینی زبان کے معنوں میں پکارا جاتا۔ لیکن جوکت کے علاقے کے بیچ کے مطابق اسے چینی انداز سے ۔۔۔ طرح سے ادا کیا جا سکتا تھا، جیسے موقع محل کے مطابق کسی غیر ملکی کو پکارا جا سکتا تھا۔ جوکت کے ارد گرد کے علاقے میں تاؤ کے سون کی ہر ایک کے ساتھ ذاتی اور تعلقات تھے۔ لیکن ان جگہوں پر وہ بہت اثر تھا، وہ تانی وانگ، ہنگوپ، سنگکا، کاؤ ملے اور تک پر اور تھیں۔ ان علاقے کا کوئی بھی قانونی یا غیر قانونی کیس ہوتا، تو وہ عدالت میں جانے سے پہلے پہلے تاؤ کے سون یعنی بگ برادر کے ذریعے ہی حل ہوتا تھا۔ وہ اونچے رتبے کے سارے ہی حکومتی اہل کاروں کو خوش رکھتا تھا۔ جب انھیں تانی وانگ آنا ہوتا تھا تو وہ بگ برادر کی ہاری میں آتے تھے اور وہ انھیں بہترین جگہوں پر ٹھہراتا تھا۔

اس علاقے کی تمام تر آسائشات وہ ان کو بہم پہنچاتا تھا۔ یہاں کے ہر اہم افسر کے منہ سے نکلی ہر بات فوراً پوری کی جاتی تھی۔ بگ برادر پر تکلف مہمان نوازی کے لیے مشہور تھا۔ نوجوان حکومتی اہل کار اس کے صبیا کردہ آسائشات کے جال میں یوں پھنس جاتے تھے کہ پھر وہ اس کے آلۂ کار بن کر رہ جاتے تھے۔

بگ برادر بہت پکا قوم پرست تھا، وہ بے شک اپنے ملک کے مفاد کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی سرکاری سرزنش کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔

میں خود بھی بہت متشدد قسم کا قوم پرست تھا اور میں صرف اسی وقت اس کی مخالفت کرتا تھا، جب وہ کسی سے اپنی دوست کو بھلا کر ہر سطح پر اتر آتا تھا۔ لیکن تاؤ کے سون نے سر عام کسی کی بھی بے

مرتی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک غلط آدمی نقطہ نظر کا رویہ اپنائے رہتا تھا۔ میں بھی اپنے آپ کو اس جیسا ہی نقطہ نظر سمجھتا تھا، اسی لیے ظاہری طور پر میں بھی بھی جارحانہ رویہ نہیں اپناتا تھا۔ وہ ایک جھکا ہوا جوئے باز تھا جب کہ میں ابھی نوجوان تھا اور اس کھیل کا نیا کھلاڑی تھا۔ اگرچہ بہت سے موقعوں پر میں نے اپنے دیرینہ روحانی ہتھکنڈوں سے اس "شیر کی طاقت" کو کمزور کیا تھا۔ لوگ میری کامیابیوں کو سراہنے لگے تھے اور دور پر دور اس پر جیتتے تھے۔ اور یہی چیز سون کے نزدیک ناقابلِ معافی تھی۔

ہم ایک دوسرے کے مقابل تو کبھی نہیں آئے تھے مگر ہمارے جھگڑے کی دھوم سارے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی، اور یہ بات ہمیشہ ہی میری سمجھ سے باہر رہی کہ چینی اور تبتی باشندے ہمیشہ اس موقع کا انتظار کیوں کرتے رہتے تھے کہ کب ہم دونوں کا آمنا سامنا ہو اور ہم براہِ راست آپس میں جھگڑ پڑیں۔ میرے خیال میں میرے جیسے نوخیز اور نوآموز شخص کا سون جیسے جہاندیدہ شخص کے مقابل آنا ان لوگوں کے لیے شاید ایک پرجوش تماشے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے اس دن کے بارے میں تشویش رہتی تھی جب ان لوگوں کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے کھلے دشمن بننے والے تھے۔ سون اس سارے علاقے اور اس جنگل کا ایک بے سر سے بادشاہ چلا آ رہا تھا اور یہ صورت حال اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ جنگل کا بادشاہ ایک شیر ہی ہو سکتا ہے جو کسی دوسرے جانور کو اپنی سلطنت میں داخل کرنے کی کبھی اجازت دے سکتا تھا؟ میں سوچا کرتا تھا کہ آخر کار ایک دن یہ سب ہو تو ہونا تھا، چاہے یہ دن کی روشنی میں نہ ہو، لیکن رات کی تاریکی میں تو یہ ممکن ہو سکتا تھا۔ بہرحال اپنی اور اس کی دشمنی کے حوالے سے میں اب مختار رہے گا تھا۔۔۔۔ حتیٰ کہ۔۔۔۔"

"کیا آپ چیپوں کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔"

میں اس کے اس سوال اور اس کی کہانی کے اس نئے موڑ پر قدرے حیران ہوا۔ ڈاکٹر مجھے اپنے مریض کے پاس کیا چھوڑ کر چلا گیا تھا، اس لیے میں نے اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہوئے فوراً جواب دیا "ہاں میں نے اس کے متعلق سنا تو ہے لیکن آج تک کبھی اسے دیکھا نہیں۔"

"یہ بنگال کا ایک غیر معمولی پھول ہے لیکن جنوبی علاقوں اور خاص طور پر نائی ٹانگ کے گرد و نواح میں یہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ میں اس کے متعلق آپ کو بتاتا ہوں۔ اس پھول کا تعلق ایک خاندان سے ہے۔ یہ چمپی کی طرح دکھائی دیتا ہے لیکن جب ابھی اس کی پتیاں برآمد نہیں ہوتیں اور ابھی یہ نشوونما کی حالت میں ہوتا ہے تو یہ ایک گٹھلی کی شکل میں چھپا ہوتا ہے۔ جب یہ گٹھلی جھڑ جاتی ہے تو

اس کی پتیاں برآمد ہوتی ہیں۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ تب کیسی خوشبو پھیلتی ہے۔ اس کی پتیاں موٹی اور سخت ہوتی ہیں اور ایک موٹی تہ اپنے اوپر لیے ہوتی ہیں۔ یہ پھول چمپی کی طرح جلدی مرجھا نہیں جاتا۔ چمپیوں جب کھل جاتا ہے تو چار پانچ روز تک کھلا رہتا ہے۔ اس کی مہک اردگرد کے تمام پھولوں کی مہک پر حاوی ہوتی ہے۔ اس کی مہک نہایت طاقتور ہوتی ہے یہ آدمی کو مست اور بے خود کر دیتی ہے۔

کیا یہ چیز عجیب و غریب نہیں کہ سون اپنی تمام تر قوم پرستی کے باوجود اپنی بیٹی کا نام اس پھول کے نام پر رکھتا ہے؟ چمپیوں اپنا نام جانتا تھا کہ یہ نام اس کے لیے کتنا موزوں تھا۔ انیس سال کی عمر میں چمپیوں ایک خوب صورت اور دل آویز شخصیت کی مالک بن چکی تھی۔ اس پھول کے نام کی طرح وہ پہلی نظر میں کسی شخص کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب سنجیدگی کے ساتھ اس پر دوسری نظر ڈالی جاتی تھی تو اس کی خوب صورتی پوری طرح سے آشکار ہونے لگتی تھی۔ ایسے نام والی لڑکی سے، جس قسم کے جذبے کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ اس کے جذبوں میں ویسی ہی تبدیلیاں واقع ہوتی تھیں، جیسے کہ ایک پھول کی مہک کی اثر پذیری میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ وہ چمپیوں پھول کی طرح ایک آدمی کو مست اور بے خود کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ چمپیوں جب کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیتی تھی تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔

بارہ سال کی عمر تک چمپیوں جوئت کے ایک سکول میں پڑھتی رہی لیکن اس کے بعد اس کے باپ نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے اچھی چینی لڑکیوں کی طرح گھر میں ہی رہنا چاہیے۔ لیکن چمپیوں جو اس وقت چوتھی جماعت کی طالبہ تھی، اس نے اپنے باپ کے متعین شدہ طریقہ کار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے خلاف احتجاج کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سون کسی حد تک تو اس رویے کو پسند کرتا تھا کہ اس کی بیٹی نے کسی کی طرح اپنی مرضی کا مالک ہونے کا رویہ اپنایا تھا۔ اس لیے اس نے حارث سے تبادلہ کرتے ہوئے اسے چینگ کے کالج میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس بات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سون چمپیوں کی مزید تعلیم کا مخالف نہیں تھا بلکہ وہ تو اسے تھائی زندگی کی طرز میں اپنے آپ کو ڈھالنے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ سون قطعی طور پر نہیں چاہتا تھا کہ چمپیوں کسی تھائی باشندے سے شادی کرے۔

سکول سے فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد چمپیوں اور اس کے باپ کے خیالات کا ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ تاہم سون نے اپنی بیٹی کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں رکھا اور چمپیوں اس رویے کو خاطر

میں نہیں لاتی تھی۔ باپ اور بیٹی کے درمیان ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ چیپون چینی روایات کی اتنی پابندی تو کرتی تھی کہ وہ بغیر اجازت گھر سے باہر نہیں رہتی تھی اور گھر کے سامنے والے صحن میں نظر نہیں آتی تھی کیوں کہ اس طرح وہ اپنے باپ کی ناراضگی مول لے سکتی تھی لیکن جہاں وہ جانا چاہتی تھی اور جہاں پر اس کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی تھی، وہ وہاں جانے سے پہلے اپنے باپ کی مرضی پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔ اپنی بیٹی کی اس خودسری پر اس کا باپ اپنی رائے کا برملا اظہار نہیں کرتا تھا لیکن کسی حد تک مفاہمت کا رویہ اپنا لیتا تھا۔

مجھے یہاں آپ کو بتانا چاہیے کہ یہاں کے جنوبی علاقے میں مکان کس انداز سے تعمیر کیے جاتے ہیں تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ کیوں چیپون مکان کے سامنے والے پورچ میں نظر نہیں آنا چاہتی تھی۔

جنوبی علاقوں میں گھر بالکل بنگلے کی طرز پر بنائے جاتے تھے۔ لیکن گلی کے کنارے کنارے ایک کمرے کے پیچھے دوسرا کمرہ۔ یہ گھر بنگلے کے گھروں کی طرح ایک ہی طرح کی لمبائی کے بنتے تھے لیکن اصل میں ان کی لمبائی زیادہ ہوتی ہے۔ ایک گھر تیس سے چالیس "واہ" کی لمبائی کا ہو سکتا ہے۔ جب کہ ایک "واہ" ایک میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ مناسب روشنی کے حصول کی خاطر چھت کی جگہوں سے کھلی ہوتی ہے۔ ان کھلی جگہوں کو شیشے یا نین سے ڈھانپ دیا جاتا تھا۔ لیکن مالک اپنی حیثیت کے مطابق یہ کرتا تھا۔ شیشے یا نین کے یہ کمرے ایک میٹر کی مثل کے تحت بنائے جا سکتے تھے اور بارش کے وقت کھلی جگہوں کو پھر سے ڈھانپا جا سکتا تھا۔ امیر ترین باشندے اس علاقے میں ایسے ہی گھروں میں رہائش پذیر تھے۔ چینی تاجر پیشہ ور دکھاوے کے لیے خوب صورت بنگلے تو بنواتے تھے لیکن وہ بھی اپنے آپ کو اصل ماحول میں رکھنے پر ترجیح دیتے تھے۔

تاؤ کے سون کا گھر اسی طرز پر تعمیر تھا جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ لیکن شہر سے باہر واقع تھا۔ یہ کسی پرہجوم گلی میں نہیں تھا۔ اس گھر کا پچھواڑا جنگل کے قریب تھا۔

چینی گھروں میں لڑکیوں کا مکان کے اگلے حصے میں دکھائی نہیں دیتی تھیں، اگرچہ چینی لڑکیوں کو گھروں میں قید کر کے رکھنے کی عادی نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ گھر کے اگلے حصے میں نظر نہیں آتی تھی اور آس پڑوس کے لوگوں نے اس کا رویہ اس ضمن میں مختلف تھا۔ وہ اپنے آپ کو گھر گرہستی کے کاموں اور کشیدہ کاری وغیرہ میں مصروف رکھنے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔ وہ مطالعے کی بہت شوقین تھی اور اس مقصد کے لیے وہ ہینگ ورنگ سے کتابیں منگواتی تھی اور جنگل کی سیر جوئی سے لطف اندوز ہوتی تھی

ہم دونوں اتفاقاً ملے اور پھر ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے، جیسا کہ تقدیر نے ہمارے لیے طے کیا تھا۔ ہماری محبت اتفاقیہ تھی مگر بہت مضبوط اور گہری تھی۔ حقیقت میں ہم اپنی محبت کو راز میں رکھنا چاہتے تھے، لیکن ہماری خوشیاں رنگیں تھیں کہ یوں اس کی شدت میں ریزہ ریزہ ہوا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ تاؤ کے سون ہماری محبت کو قطعاً برداشت نہیں کرے گا اور اس شخص سے، جس سے وہ نفرت کرتا ہو اور وہ اس کا دشمن بھی ہو، وہ اس سے اپنی بیٹی کی شادی کی اجازت دینے سے، پہلے اسے جان سے مار دینے کو ترجیح دے گا۔

میں یہاں اس بات کی طرف آپ کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ تپیوں ایک پختہ ارادے کی لڑکی تھی اور پھر بھی اس نے میرے ساتھ بھاگ جانے سے انکار کیا۔ اس کی تعلیم اور تربیت کے اندر نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ ایک سچی اور گہری محبت تھی۔ اور میں خود بھی اس حوالے سے، اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اگر ہم بھاگ جانے کا فیصلہ بھی کر لیتے، تب بھی ہم نے اپنی روایات کی پاسداری ضروری ہوتی اور تپیوں نے بھی رسوائی کی آسانیوں کے بجائے اس کی سعوبتوں کو برداشت کرنے پر ترجیح دی۔

تانی ماؤ ایک چھوٹی سی جگہ تھی اور کوئی بات زیادہ دیر تک یہاں پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اور پھر ہماری محبت کی داستان۔۔۔۔ اس کی کہانی تو جنگل کی آگ کی طرح فوراً پھیلی اور تپیوں کے باپ کو بھی جلدی اس کی خبر ہو گئی۔

میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ گھر میں پابند کر دی گئی تھی کیوں کہ میرے آدمی جو اس کے گھر کے اردگرد پھیلے رہتے تھے ان کے بقول انھوں نے اسے باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ مجھے کن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے اس تک اپنا پیغام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی کہ میں نے اپنے شخص کے لیے انعام دینے کا اعلان کیا، جو کہ میرا رقعہ اس تک پہنچا دیتا اور جو اس کا جوابی رقعہ مجھ تک پہنچاتا اس کے لیے انعامی رقم میں اضافے کا بھی اعلان کیا۔ کئی لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی بھی، ان میں سے میرا پیغام اس تک پہنچانے یا اس کا پیغام مجھ تک لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ صرف یہ ہوا کہ اس طرح انھوں نے اپنی زندگی کو خطرے میں ضرور ڈالا۔

اپنی دشمنی کے ابتدائی دور سے لے کر اب تک میں اور تاؤ کے سون، جیسے تہذیبی اصولوں کے

پرندے شور مچا رہے تھے۔ ظاہر ایک دوسرے کے لیے ہمارا رویہ مذہبی تھا لیکن اب تو یہ ایک کھلی جنگ تھی
گرچہ ہم ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے لیکن اب جب بھی ہمارا آمنا سامنا ہوتا، ہم ایک
دوسرے کو گھورنے لگتے تھے۔ جہاں تک پیسوں کا تعلق ہے، اس کے متعلق تھوڑی بہت اطلاع مجھے اپنے
آدمیوں کے ذریعے ملی تھی۔ اسے مارا پیٹا گیا تھا۔ اسے اس بدبو اور اندھیرے گھر میں خاصے تشدد کا
سامنا تھا، وہ وہاں ایک قیدی کی طرح رہ رہی تھی۔

مجھے بھی ایک لمبے عرصے کے لیے بھوکت سے دور رہنا پڑا۔ میری جلاوطنی اس علاقے کا
سب سے بڑا موضوع بن گئی تھی۔ میرے چند دوستوں نے ایک موٹر بوٹ کرائے پر حاصل کی اور میری
تسلی کے لیے میرے گھر پر کچھ جنگ جو قسم کے لوگ متعین کر دیے۔ جنگ جو لوگوں کی یہ پارٹی ایک
خاص مہارت کی تھی۔ ان کا شامل وہی تھا، جس کے لیے بھوکت مشہور تھا۔ یعنی خوراک، شراب اور عورت!

میں یہاں خوراک اور شراب کے معیار کے متعلق آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ہاں میں یہ ضرور کہہ
سکتا ہوں کہ ایسی زبردست چیزیں کسی بھی قیمت پر حاصل نہیں کی جا سکتی تھیں۔

ہانگ سے خاص طور پر، میرے لیے ایک طوائف منگوائی گئی تھی۔ اس موقعہ پر البتہ اسے
یہاں آنے کی اجازت دی گئی تھی اور اس نے قبول کر لی تھی۔ زندگی کے سیاہ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے
کسی وجود کے لیے ایک سیاہ اندھیری رات میں بہت معمولی سی روشنی ہی کافی ہوتی ہے۔ اسی لیے جب
کسی شخص کی زندگی سے ایک عورت نکل جاتی ہے، تو وہ کسی دوسری کا سہارا ڈھونڈ لیتا ہے۔ میرے
دوستوں کا خیال تھا کہ کس طرح وہ میری مدد کر رہے تھے۔ میں نے شیطان کا یہ تحفہ قبول کر لیا۔

اس کا نام میتا تھا۔ وہ ایک فلپائنی عورت تھی، جس کی رگوں میں پرتگیزی خون کی آمیزش
تھی۔ وہ ایک تھائی لڑکی کی جگہ لے رہی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت چیز تھی اور اس کی شخصیت
میں ایک سحر تھا۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ ایک طوائف تھی۔

میں نے اور میرے دوستوں نے تین دن اور تین راتیں کشتی پر گزاریں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ
رونگ لے جانا چاہتے تھے مگر میں کسی ضروری کام کی وجہ سے ان کے ساتھ جانے سے قاصر تھا۔ وہ تو چلے
گئے مگر میتا یہیں میرے پاس ٹھہر گئی۔ پانچ چھ دنوں بعد واپس آ کر ان کو میتا کو اپنے ساتھ واپس بھوکت
لے جانا تھا۔

میں نے میتا سے دوستوں کے ساتھ رونگ جانے کو کہا۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اس نے

یہاں کی ویران اور دور افتادہ جگہ پر رہنا پسند کیا۔ میں نے بعد میں پوچھا کہ وہ یہاں کیوں رک گئی تھی اس نے جواباً کہا کہ اسے میری جوانی، خوب صورتی اور اچھے اخلاق نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اس تعریف کا مجھ پر کیا اثر ہوا؟ یا یہ کہ انیتا جیسی خوب صورت عورت میری زندگی اور روح میں کیا کچھ تبدیلی لا سکتی تھی؟ وغیرہ وغیرہ

مگر فوری طور پر یہ ہوا کہ جوں ہی دوست روانہ ہوئے، انیتا میرے ساتھ میرے گھر میں آ گئی ایک دوسرے کو جاننے کے سلسلے میں ہم دونوں کچھ زیادہ ہی پرجوش تھے۔ میرا گھر ایک بھدا سا لکڑی کا بنا بنگلا تھا۔ تین کمروں کے دروازے برآمدے میں کھلتے تھے، جہاں سے زمین کے فرش پر اترنے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ پہلا کمرہ تو میرا بیڈ روم تھا اور دوسرے میں، میں کھانا کھاتا تھا۔ اسی کمرے سے ایک راستہ باتھ روم کو جاتا تھا۔ آخری کمرہ عام طور پر بند رہتا تھا کیوں کہ میں وہاں اپنے خاندانی کاغذات رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ رات کے وقت بھی میں اپنے بیڈ روم میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔

میرا بنگلا کمپنی کے دوسرے گھروں سے ذرا پرے اور جنگل کے قریب واقع تھا۔ یہ بہت پرسکون، خاموش اور ایک تنہا سی جگہ تھی۔ اس کے وقت میرے پاس ایک نوکر اور باورچی ہوتا تھا۔ اور شام کو سب کارکن اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے اور وہاں وہ جوا کھیلتے تھے یا اور دوسرے طریقوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

انیتا کی آمد پر ایک شام میں کمپنی کے انجینئروں کی طرف سمندر کے قریب دی گئی رات کے کھانے کی دعوت میں شریک تھا۔ وہاں کھانے کے بعد ڈانس وغیرہ کا اہتمام بھی تھا اور دونوں انجینئروں نے وہاں اچھا وقت گزارا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ انیتا سے ملنا چاہتے تھے اور اس ضمن میں میری طرف سے دعوت ملنے کے متمنی تھے۔ ایک لمبے عرصے سے وہ یہاں عورتوں اور نہایت ہی خوب صورت عورتوں کے بغیر رہ رہے تھے اور وہ یقیناً عورتوں کے لیے مرے جا رہے تھے۔ ان کے بارے میں یہ ضرور کہا جا سکتا تھا کہ وہ مہذب اور اچھے طور کے مالک تھے۔ انھوں نے انیتا کے ساتھ ڈانس کیا اور کچھ خوش فعلیاں بھی کیں یہ پارٹی ساری رات چلتی رہی

میں ذرا ملکی نیند لینے والا آدمی ہوں اور مجھے سونے میں کچھ وقت لگتا ہے لیکن اس رات کی پارٹی کے بعد میں فوراً ہی سو گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں جاگ اٹھا۔ شاید یہ دروازے کے قبضوں کی مشین

کبھی تبدیل نہیں ہو گیا تھا، چرچ بہت کی آواز تھی۔ یہ بہت عجیب بات تھی ـــــ مجھے یقین تھا کہ سونے سے پہلے میں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

میں بیڈ روم کا رخ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھلے دروازے سے صبح کے سورج کی کرنیں سیدھی میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ پھر میں نے دروازے میں کسی جسم کا سایہ دیکھا۔ میں اس پر یقین نہ کر سکا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

وہ میرے خدا! کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟ کیا میرا دماغ چل گیا تھا؟ اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے ابھی تک دروازے میں موجود اس سیاہ بھوت کے وجود کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ چیپون تھی۔ بالکل ویسی۔۔۔۔ اس کے لمبے سیاہ بال، اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی کمر اور ٹخنوں کے گرد لوہے کی ایک زنجیر تھی۔

ہم دونوں ہی دم بخود تھے۔ میں نے اس کی نگاہوں کو اپنے چہرے سے پرے ہٹتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ چلا گیا ہو۔ میں کچھ دیر تک اپنا سانس روکے رہا، پھر ایک ساتھ ہی ہم دونوں کی نظریں میز پر پڑیں۔ جاں دار مچھلی کے پیچھے ستر پر اس کا جسم، مجھ سے پرے پڑا تھا۔ وہ سو رہی تھی اور آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔

میں نہیں جانتا کہ چیپون کی برہنگی کو دیکھ کر مجھے شرم کیوں محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن اینیا کی جسمانی نمائش نے ایک دم مجھے شرمندگی میں ضرور مبتلا کر دیا اور میں نے جلدی سے اس کے جسم پر ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔

میں چیپون کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ میں اس کی طرف سے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟ میں نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا۔ جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو چیپون جا چکی تھی۔

"چیپون نے اپنے باپ کے سامنے اس بات کا اقرار کر لیا تھا کہ وہ مائے اسنوئے یعنی مجھ سے محبت کرتی تھی اور یہ کہ ہم میں میل ملاقات بھی تھی۔ لیکن یہاں اس نے اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ اس نے ایسا کرتے ہوئے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ جس سے اس پر یا اس کے خاندان کی عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔ میں نے اس بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ اسے واقعی یقین نہیں تھا کیوں کہ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ کوئی عورت ایک مرد سے میل ملاپ رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو محفوظ کیسے رکھ

کتی ہے۔ سون کے گھر میں شوہر اس کی اپنی چھ دو اشتائیں تھیں اور اس کے علاوہ ایک صحت مند نوجوان آدمی ہوتے ہوئے اور نیکی چیزوں کا رجحان رکھتے ہوئے نائے امنوئے جو کہ اس کا دشمن تھا اور جو کہ واحد شخص تھا، جو اس سے خوف میں اس سارے علاقے میں اس کے سامنے یوں اکڑا ہوا تھا۔ اس کی بیٹی کے ذریعے، اس سے بدلہ لینے سے کیسے باز رہ سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس شخص کے ساتھ جس سے وہ شدید نفرت کرتا تھا، چیپوں نے محبت کر کے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ اس نے اسی بنا پر اس کی وضاحت اور دلیلوں کو رد کر دیا تھا۔

جب باپ اور بیٹی دونوں اپنی بات پر اڑے رہے اور دونوں میں سے کوئی اپنے موقف سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوا تو پھر آنے والے وقت میں جو کچھ ہونا تھا، اس کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔ وہ دونوں جنگ و جدل پر آمادہ ہو گئے۔ سون نے جلتی ہوئی لکڑی کا ایک ٹکڑا چیپوں پر دے مارا۔ چیپوں نے اپنے آپ کو اس وار سے بچا لیا۔ تاہم اسے بے دردی سے چلایا گیا۔ اتنا شور مچا کہ ہمسائے بھی متوجہ ہو گئے۔ چیپوں نے بہت ناقابل برداشت درد کی شدت کا اظہار محض سسکیوں کی صورت میں کیا۔ تاہم کے سون جب یہ شدد کرتے کرتے تھک گیا تو چیپوں فرش سے اٹھی۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں اب بھی پہلے ہی کی طرح پاکیزہ ہوں، لیکن تم میری بات کا یقین نہیں کر رہے۔ تم نے مجھے کایوں دیں اور مارا پیٹا۔ میں اب سیدھی امنوئے کے پاس جاؤں گی اور اپنا آپ اس کے سپرد کر دوں گی۔۔۔۔ اب خدا ہی میری مدد کرے گا۔"

کسی کو معلوم تھا کہ چیپوں جو کچھ کہتی تھی وہ کر گزرتی تھی۔۔۔ ایک ہفتے بعد جب اس کا باپ گھر پر نہیں تھا تو وہ وہاں سے نکل آئی۔

اس چینی خاندان کے سربراہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اس گھر کے لیے ایک حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر چیپوں یہاں سے بھاگی تو سب لوگوں کو یعنی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور نوکروں کو اس بات کی سزا دے گا۔ چیپوں کے لیے بچ نکلنا بہت مشکل تھا۔ گھر کے کئی افراد نے چیپوں کا پیچھا کیا۔ جگہ جگہ پر سنتری تھے۔ گھر کے مالک کو بھی اس بات کی اطلاع دے دی۔ پہلی بار بھاگنے کی کوشش پر چیپوں کو سزا دی گئی۔

اس نے کئی بار بھاگنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اسے ایسا کرنے سے روکنے کے لیے تاؤ کے سون نے حکم دیا کہ اسے اس کے بیڈروم میں ایک ستون کے ساتھ رسی سے باندھ دیا جائے۔ رات

کے وقت بہت اس نے اس کی زنجیر کی لمبائی تھی رکھنے کی اجازت دے دی کہ وہ آسانی سے کمرے میں حرکت کر سکے لیکن تب بھی زنجیر اس کے ٹخنوں سے بندھی ہوتی تھی۔ زنجیر میں بندھے ہونے کے باوجود بھی جب چیپوں نے بھاگنے کی کوشش ترک نہ کی تو سون نے اس کی سوتیلی ماؤں میں سے ایک کو حکم دیا کہ وہ رات کو سونے سے پہلے اسے کپڑوں سے بالکل آزاد کر دیا کرے۔ اسے یقین تھا کہ اس کا یہ اقدام کافی فائدہ مند رہے گا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس سلسلے میں پیچھے نہیں ہٹے گا، چاہے اس معرکے میں ان دونوں میں سے کوئی ایک تباہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ایک صبح انھوں نے چیپوں کے بیدار ہونے کو جان پایا۔ چھت کھلی ہوئی تھی اور شیشے کا کمرا اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا۔ یہ لگتا تھا کہ چیپوں نے اوپر چڑھنے کے لیے اپنی پیٹھ کا استعمال کیا تھا۔ چیپوں اپنے چاہنے والے ہاتھی کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ تک پہنچنے میں کیا کیا تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کی ہوں گی۔

شاید چیپوں نے اپنے ٹخنوں سے بندھی زنجیر اوپر اٹھا کر اس کا ایک سرا اپنی کمر کے گرد باندھ لیا ہوگا۔ وہ اپنے کپڑوں کی مدد سے چڑھ کر چھت پر آ گئی ہوگی۔ وہ ایک صحت مند اور مضبوط جسم کی مالک لڑکی تھی اور اس کے لیے یوں فرار ہونا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا ہوگا۔

لیکن اس کا میرے گھر تک پہنچ جانا تو واقعی ایک معجزہ تھا۔ اس نے گلیوں سے اتنا پیدل کس طرح عبور کیا ہوگا؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ لوگ بھی اتنا کہہ پاتے تھے کہ وہ بس کسی طرح یہاں پہنچ گئی ہوگی۔ کھلا دروازہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ یہاں موجود تھی۔

میں برآمدے کی طرف بھاگا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ وہاں اس کا کوئی سراغ موجود نہ تھا۔ میں نے اسے دریا کے کنارے تک ڈھونڈا۔ میں شام تک اسے دیوانہ وار تلاش کرتا رہا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ اتنے تھوڑے عرصے میں زیادہ دور تک جا چکی ہو اور اس نے میری آوازیں نہ سنی ہوں۔ میں نے اسے اتنی زیادہ مرتبہ پکارا تھا کہ مجھے اپنے حواس بحال کرنے میں کچھ وقت لگا۔ میں کارکنوں کے باڑوں میں گیا اور میں نے حکم دیا کہ ہمیں کوئی ادھر ادھر پھیل جائیں اور دریا کے آس پاس اس کا سراغ لگائیں۔ میں نے رات گئے تک انھیں اسے تلاش کرنے کو کہا۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہم لوٹے۔

میں اپنے بنگلے میں واپس جانے کے بجائے تائی مانگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے اپنے

آپ سے کہا کہ اگر چپوں مجھے اس کے باپ کے گھر میں بیٹھے وعافیت مل گئی تو میں شکریے کے طور پر تاو کے سون کے قدموں پر جھکنے کے لیے بھی تیار ہو جاؤں گا۔

جب میں تانی ہانگ پہنچا تو مجھے میرے آدمیوں نے اطلاع دی کہ چپوں گھر پر موجود تھی بہر حال میں اپنی تسلی چاہتا تھا، اس لیے میں چپوں کے باپ سے ملنے چلا گیا۔ ہم دونوں کی آپس میں شدید نفرت کے باوجود یہ بات اپنی جگہ اہم تھی کہ چپوں ہم دونوں ہی کو بہت پیاری تھی لیکن وہ تباہ حال شخص تو صحیح معنوں میں ایک وحشی جانور تھا۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ اگر چپوں اسے اس شرمناک حالت میں واپس مل بھی گئی تو وہ اسے جان سے مار دے گا اور اس کی لاش کو کفن میں لپیٹ کر مجھے بھیج دے گا۔

میں واپس گھر پہنچا اور میں نے وہاں سے تیس آدمی لیے اور انھیں میں نے دو گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ انھوں نے چپوں کی تلاش میں دریا کے دونوں کناروں کو چھان مارا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سوائے دریا کے پانی کے کہیں سے بھی نہیں گزری تھی۔ میں نے سوچا شاید وہ دریا کے خشک راستے سے گزری ہو۔ میں نے دونوں گروپوں کی نگرانی کی اور دریا کی مخالف سمت میں سفر کرتا رہا۔

میں چوبیس گھنٹے تک چلتا رہا اور بھاگتا رہا۔ میں نے اس دوران میں برائڈی کے دو چار گھونٹ کے سوا شاید کچھ بھی نہیں پیا تھا۔ اس دوران میں شاید میں اونگھ بھی گیا تھا کیوں کہ جب میں نے آنکھ کھولی تو میری کشتی پھر دریا کے کنارے سے ٹکراتے ہی وہاں تھی۔ میں نے کسی ایک ملاح سے پوچھا تھا کہ ہوا کیا ہے اور اس نے ایک طرف اشارہ کیا تھا اور کہا تھا۔

"کیا آپ نہیں جانتے کہ مگرمچھ ایک انسان کو کیسے نگل لیتے ہیں؟"

بہر حال مگرمچھ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ سالم انسان کو نگل نہیں سکتا۔ اس کا منہ چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ کسی جسم کے ٹکڑے نہیں کر سکتا۔ پھر اس کی دماغی چھوٹی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شکار کے جسم کو چیر پھاڑ نہیں سکتا۔ وہ اس جسم کو کھانے کے لیے سارے پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ جسم کے ایک حصے کو اپنے منہ میں لے کر اسے کسی درخت کے ساتھ بار بار مارتا ہے۔ اور جو حصہ علاحدہ ہو کر گر پڑتا ہے وہ اسے کھا لیتا ہے وہ ہر مرتبہ کوئی حصہ کوئی ٹکڑا کھا لیتا ہے حتیٰ کہ وہ جسم غائب ہو جاتا ہے۔

اس لمحے مریض بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا اس نے خلا میں گھور کر دیکھا۔ اس کی خاموشی نے مجھے بے چین کر دیا اور میں نے سوال کر دیا۔

"کیا ملاحوں نے چمپون کو پا لیا تھا؟"

"نہیں"۔ مریض نے کہا "انھیں صرف ایک انسانی ٹانگ ملی تھی جس کے گرد ایک زنجیر بندھی ہوئی تھی اور یہ کھمبے کے اوپر سے ہی ہوئی تھی۔ یہ ایک درخت کی نچلی شاخ پر لٹکی ہوئی تھی"

"جناب کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ چمپون نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر دریا میں موجود مگرمچھوں کے حوالے کر دیا تھا؟" وہ یہ کہ وہ دریا عبور کرنے کے بعد تیر کر واپس اپنے باپ کے پاس پہنچ کر اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے ایک غلط آدمی سے محبت کی تھی؟"

☆☆☆☆

ایک بازو

"رات بھر کے لیے میں تمھیں اپنا ایک بازو دے سکتی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔ اس نے اپنا دایاں بازو کندھے سے علاحدہ کیا اور اپنے بائیں ہاتھ سے اسے میرے گھٹنے پر رکھ دیا۔

"شکریہ۔" میں نے اپنے گھٹنے کی طرف دیکھا۔ بازو کی گرمائش مجھ تک پہنچی۔

"میں یہ انگوٹھی پہنوں گی۔ تمھیں یاد دلا دوں کہ یہ میری ہے۔" وہ مسکرائی اور اس نے اپنا دایاں بازو میرے سینے کی طرف اٹھایا۔ "چلیے۔" میں ایک ہاتھ سے انگوٹھی اتارنا اس کے لیے مشکل تھی۔

"منگنی کی انگوٹھی؟"

"نہیں، یہ ایک نشانی ہے میری ماں کی طرف سے۔"

"شاید یہ ایک منگنی کی انگوٹھی ہی تھی ہے۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں اسے پہنتی ہوں اور جب میں اسے اتارتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں ماں سے جدا ہو رہی ہوں۔"

بازو کو اپنے گھٹنے سے اٹھاتے ہوئے، میں نے انگوٹھی والی انگلی میں مسکا دیا۔

"کیا یہ نقلی ہے؟"

"ہاں، اس نے سر ہلایا۔ "جب تک انگلیاں اور گنجی نہ جھکے تو یہ مصنوعی لگے گا۔ تم اسے پسند نہیں کرو گے۔ مجھے اس میں جھکاؤ پیدا کرنے دو۔"

اس نے اپنا دایاں بازو گھٹنے پر سے اٹھایا اور نرمی سے اپنے ہونٹوں سے دبایا۔ پھر اس نے انگلیوں کے جوڑوں کو ہلایا۔

"اب یہ حرکت کریں گی۔"

"شکریہ۔" میں نے بازو واپس لیا۔ اب گنجی اور انگلیاں جھک رہی تھیں۔ "کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ بولے گا؟ کیا یہ میرے ساتھ بات کرے گا؟"

"یہ وہی کرتا ہے جو ایک بازو کرتا ہے۔ اگر یہ بات کرتا ہے تو مجھے شبہ ہے کہ شاید ہی میں اسے واپس لوں۔ لیکن بہر حال تم کوشش کرو۔ اگر تمھارے تعلقات اس کے ساتھ اچھے ہیں تو کم از کم یہ وہ ضرور سنے گا جو تم اسے کہو گے۔"

"میں اس کے ساتھ اچھا رہوں گا۔"

"میں تمھیں پھر ملوں گی۔" اس نے کہا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں بازو کو یوں چھوا جیسے وہ اپنی روح، اس میں منتقل کر رہی ہو۔ "تم اس کے ہو لیں صرف ایک رات کے لیے۔" جب اس نے میری طرف دیکھا تو ایسے معلوم ہوا جیسے وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"میں یہ تصور نہیں کر سکتی کہ تم اسے اپنے بازو کے ساتھ بدل لو گے۔" اس نے کہا۔ "لیکن ٹھیک ہی رہے گا۔ آگے بڑھو اور کر گزرو۔"

"شکریہ۔"

میں نے اس کا بازو اپنی رسائی میں رکھ دیا اور جسد آلود نلکیوں میں اتر گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ اگر میں ٹیکسی یا سٹیشن کار لیتا ہوں تو یہ بڑا عجیب سا حیوان ہو گا۔ لڑکی کا جسم سے علیحدہ کیا گیا بازو اگر رو پڑے یا چیخنے لگے تو یہ ایک عجب سا نظارہ ہو گا۔

اس طرف، جس طرف میرا دایاں ہاتھ تھا، میں نے اسے اپنے کندھے کے جوڑ کی گولائی پر اپنی چھاتی کے ساتھ لگایا۔ یہ پرس کوٹ کے اندر چھپا ہوا تھا اور وقفے وقفے سے اپنے بائیں ہاتھ سے مجھے اسے چھونا ہوتا تھا یہ یقین کرنے کے لیے کہ وہ اب بھی وہاں موجود تھا۔ غالباً میں اس بازو کی موجودگی سے زیادہ اپنی خوشی پر یقین کرنا چاہتا تھا۔

جہاں میں چاہتا تھا اس نے وہیں سے بازو کو علیحدہ کیا تھا۔ یہ گول اور گداز تھا۔ کیا یہ بازو کے اوپر والے مقام کی طرف تھا یا کندھے کے آغاز پر؟ یہ گولائی مغربی دنیا سے تعلق رکھنے والی ایک خوب صورت لڑکی جیسی تھی جو کہ جاپانیوں میں بہت کم تھی۔ یہ نفیس اور ستھرا پن، خود لڑکی کے اندر تھا، ایک ایسے سرے کے مانند جو تارہ اور مدھم روشنی کی طرح چمک رہا ہو۔ جب لڑکی صاف ستھری نہ رہے تو یہ نرم گولائی پھیلی ہوئی رہا مدہ پڑنے لگتی۔ وہ تیز جو ایک خوب صورت لڑکی میں محبت کے لیے ہو، اس نے مجھے لڑکی کے جسم کی گولائی کا احساس دلایا۔ اس کی چھاتیاں بڑی نہیں ہوں گی مجھے یقین تھا، بس اتنی بڑی کہ ہاتھوں کے پیالوں میں سما جائیں۔ ان میں چست جانے والی نرمی اور مضبوطی ہونی چاہیے اور

بازو کی گولائی میں، میں اس کی ہاتھوں کو محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ جل رہی ہوں۔ وہ انھیں ایک چھوٹے پرندے کی طرح ہلکے پھلکے نہ زمین پر جانے کی یا وہ ایک تتلی کی طرح، ایک پھول سے دوسرے پھول تک جاتی جائے گی۔ جب وہ چلے گی تو اس کی زبان کی نوک پر، وہی ملائمت اور لطافت ہوگی۔

یہ بغیر آستینوں کے لباس والا موسم تھا۔ لڑکی کا کندھا جو ابھی حال ہی میں ننگا ہوا تھا، اس کی جلد کی رنگت بھی ہو کے کہ اور سے کس سے متعارف نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی کلی کے مانند تھی، جو موسم بہار کے سامنے تلے نمو آلود ہوئی ہو اور ابھی تک گرمی سے پامال نہ ہوئی ہو۔ میں اس صبح ایک میکسو یہ کا شکوفہ بنا تھا اور میں نے اسے ایک شیشے کے گلدان میں لگا دیا تھا اور لڑکی کے بازو کی گولائی اس عظیم اور سفید شکوفے کے مانند تھی۔ اس کے لباس کو پیچھے کی طرف سے ایسے ہی دوسرے بغیر آستینوں والے لباسوں سے زیادہ دلچسپ طریقے سے تراشا گیا تھا۔ کندھے باہر اور کندھا خوب نمایاں تھا۔ لباس جو گہرے سبز رنگ کا تھا اور تقریباً کالا تھا، ایک بڑی چمک رکھتا تھا۔ لڑکی کے کندھوں کی ڈھلان گولائی میں تھی، جو کمر کے بھاری طرف ایک بڑی بڑی کا تاثر پیدا کرتی تھی۔ اگر تم اچھے انداز میں، پیچھے سے دیکھ جائے تو کول کندھوں کا گوشت لچکی پتلی گردن تک آتے ہوئے، اوپر کی طرف سوار سے گئے بالوں کے آغاز پر چمک رک جاتا تھا اور بالے ہوں کندھوں کی گولائی پر ایک چمک دار سایہ بناتے تھے۔

لڑکی کو اندازہ تھا کہ میں اسے خوب صورت سمجھتا ہوں، اس لیے اس نے کندھے کی گولائی سے اپنا دایاں بازو مجھے عاریتاً دیا تھا۔

برساتی کے نیچے احتیاط سے چھپایا گیا اس کا بازو میرے ہاتھ سے نیم وخنک رہا تھا۔ میرے دل کے تیزی سے دھڑکنے کی وجہ سے میرا سر چکرا رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ میرا ہاتھ گرم ہو جائے۔ میں چاہتا تھا، اس کی گردش ایسے ہی قائم رہے جیسے خوابوں کی گردش تھی۔ اور جو معمولی سی حرکت میرے ہاتھ کی تھی، اس نے اس بازو کی خوشی، مجھ تک پہنچائی۔

دھند زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ رات مجھے بارش کے انداز میں ڈراتی تھی اور میرے ساتھی بوجھل سو رہے تھے۔ میں اپنے پیچھے ایک فارمیسی کی دکان سے اندر ریڈیو کی آواز سن سکتا تھا۔ وہاں سے اعلان ہو رہا تھا کہ دھند کی وجہ سے تین ہوائی جہاز لینڈ نہیں کر سکے اور ایئرپورٹ کے اوپر آدھے گھنٹے سے منڈلا رہے ہیں۔ سننے والوں کی اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا رہی تھی کہ ایسی نم آلود راتوں کو گھڑیاں غلط وقت بھی بتانے لگتی ہیں۔ ایسی راتوں میں اگر گھڑیوں کو خاصی چابی دی جائے تو ان کے

پر تک نہیں سکتے ہیں۔ میں نے اوپر چڑھتے ہوئی جہازوں کی روشنیوں کو تلاش کیا لیکن میں انھیں نہ دیکھ سکا۔ وہاں آسمان ہی نہیں تھا۔ وہاں تو گیلا پن میرے کانوں میں گھس رہا تھا اور مجھے دوری پر موجود زمین کے اندر رہنے والے بے شمار کیڑوں کے ارتعاش سے پیدا ہونے والی گیلی گرمی جیسا تاثر محسوس ہو رہا تھا۔ میں فارمیسی کے سامنے عزائم مزید تعبیر کا منتظر رہا۔ مجھے خوف ہوا کہ اس طرح کی راتوں میں چڑیا گھر کے خوں خوار درندے، شیر، چیتے اور باقی سب اس گیلے پن میں اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے دھاڑتے ہیں اور اس وقت تو انھیں شیشے کے لیے موجود تھے۔ ایک گونج نمودار ہوئی جیسی زمین کی گونج ہوتی ہے۔ تب میں نے یہ بھی جانا کہ حاملہ عورتوں اور اداس لوگوں کو ایسی راتوں میں جلد سو جانا چاہیے۔ ورنہ عورتوں نے اپنی جلد پر اور راستے پر فیومہ چھڑکا ہو، ان کے لیے بعد میں اسے اپنے جسم سے علاحدہ کرنا مشکل ہوگا۔

درندوں کی دھاڑ کے ساتھ میں چل پڑا اور پرفیومہ کی حرارت میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ گیلی دھاڑ نے مجھے مضطرب کر دیا تھا اور میں چاہتا رہا کہ کہیں میرا اضطراب اس لڑکی کے بارے میں نہ منتقل ہو جائے۔ لڑکی بیوقوف تھی اور بنی ہی فضول باتیں کیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اس رات وریڈ بوکی تجویز پر عمل کرتے ہوئے ایک بازو کے ساتھ جلد ہی بستر پر چلی جائے گی۔ مجھے امید تھی کہ وہ صحیح طور پر سو سکے گی۔

جیسے ہی میں گلی میں پہنچا، میں نے برساتی کے اندر اپنے بائیں ہاتھ کو دیا۔ ایک ہارن کی آواز آئی۔ کوئی میرے پہلو سے مجھے چھوتا ہوا گزرا۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ شاید بازو اس ہارن کی وجہ سے ڈر گیا تھا۔ انگلیاں جکڑنے کو تھیں۔

فکر نہ کرو۔" میں نے کہا "یہ بہت دوری پر تھا، یہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یوں یوں کر رہا تھا۔"

چوں کہ میں ایک بہت ہی اہم چیز کو پکڑے ہوئے تھا، اس لیے میں نے دونوں اطراف میں دیکھا۔ ہارن کی آواز تیز رفتار سے آ رہی تھی کہ میں نے سوچا کہ یہ کسی اور کے لیے ہوگی۔ میں نے اس طرف دیکھا جدھر سے یہ آ رہی تھی، لیکن میں کسی کو نہ دیکھ سکا۔ میں صرف ہیڈ لائٹس کو دیکھ سکا۔ وہ ایک بہت زیادہ پھیلنے والے مدھم ہوتے رنگوں کے جسے میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ اس کے لیے ایک عجیب رنگ۔ جب میں نے گزرتے ہوئے اسے اپنے قریب سے سرکتے ہوئے دیکھا تو میں خود پر قابو پائے

ہوئے تھے۔ ارغوانی رنگ میں رنگی، ایک نوجوان خاتون کار ی چلا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے وہ میری طرف مزید متوجہ ہو۔ میں نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا۔ مجھے لگا کہ وہ لڑکی بازو دینے کے لیے آئی ہوئی ہے۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ وہ لڑکی تو ایک بازو کے ساتھ ڈرائیو کرنے کے قابل نہیں رہی ہوگی۔ لیکن کیا اس کار کی چلانے والی عورت نے، یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ میں کیا اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں؟ کیا اس نے تو بی وصف کے وجدان کے ساتھ، اس کا ادراک نہیں کر لیا ہوگا؟ مجھے اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچنے سے پہلے کسی اور شخص سے مدبھیڑ ہونے سے خود کو بچانا ہوگا۔ مجھے روشنیاں بھی، ایک مدھم سا سایہ لیے ہوئے تھیں۔ میں نے ابھی تک کار نہیں دیکھی تھی۔ جا تے ہی دھند میں ایک دھبے جیسا ارغوانی پھول تیرتا ہوا میرے پیچھے چلا گیا۔

"وہ بغیر کسی وجہ کے ڈرائیو کر رہی ہے، وہ بالکل کسی وجہ کے بغیر بس ڈرائیونگ کے لیے ڈرائیو کیے جا رہی ہے۔ ڈرائیو کرتے ہوئے ہی وہ غائب ہو جائے گی۔" میں بڑبڑایا "اور اس پچھلی سیٹ پر کیا بیٹھا ہوا تھا؟"

بظاہر کچھ بھی نہیں۔ کیا یہ اس وجہ سے تھا کہ میں لڑکی کا بازو ساتھ لیے ہوئے پھر رہا ہوں اور شاید اسی لیے میں خالی پن سے گزر رہا تھا؟ جو کار وہ ڈرائیو کر رہی تھی، اس کے ساتھ رات کی دھند چلی جا رہی تھی۔ ورنہ ہیڈ لائٹس میں کچھ اس کے متعلق ایسا تھا، جو دھند کے پن میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اگر یہ اس کے اپنے بدن سے نہیں آ رہی تھی تو یہ ارغوانی روشنی کہاں سے آ رہی تھی؟ کیا ایک بار وہ، جیسے کہ میں نے چھپایا ہوا تھا کے پاس خالی پن والا ایسا احساس تھا کہ ایک عورت ایسی رات کو اکیلی سفر کر رہی تھی؟ کیا اس عورت نے کار سے اس لڑکی کے بازو کے لیے سہارا دیا تھا؟ شاید ایسی رات میں، عورتوں کی حفاظت کے لیے فضا میں بھوت اور فرشتے ہوتے ہیں۔ شاید وہ عورت کار میں نہیں تھی کہ ایک ارغوانی روشنی میں سفر کر رہی تھی۔ اس کا سہ خانی (اتر قارت) نہیں تھا۔ وہ عورت میرے اس راز کی جاسوسی کر رہی تھی۔

میں ایسی مزید اتفاقیہ ملاقاتوں سے بچنے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف واپس ہوا۔ میں نے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر سننے کی کوشش کی۔ ایک مدھم سی روشنی میرے سر کو چھوتی ہوئی غائب ہو گئی۔ یہ روشنی ایک جگنو کی روشنی سے بھی زیادہ بڑی اور طاقتور تھی۔ میں پیچھے کی طرف گھوما۔ جگنو جیسی اور بہت سی روشنیاں مجھے چھوتی ہوئی گزر گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دھند، انھیں نگل جائے وہ

غائب ہو گئیں۔ کیا میرے پہنچنے سے پہلے، کسی قسم کی Death fire یا چھوا، وہاں پر دوڑتا ہوا پہنچ گیا تھا؟ لیکن چھ میں نے دیکھا کہ یہ چھوٹے پتنگوں کا ایک جھرمٹ تھا۔ دروازے کی روشنی کی زد میں آ کر پتنگوں کے پر جگنوؤں کی طرح روشن ہو اٹھے تھے۔ وہ جگنوؤں جتنے بڑے نہیں تھے لیکن پھر بھی پروانوں کے لیے اتنے چھوٹے کہ غلط فہمی میں مبتلا ہوا جا سکتا تھا۔

خودکار ایلیویٹر کو نظر انداز کرتے ہوئے، میں نے تیسرے فلور تک جانے والی تنگ سیڑھیوں والا راستہ، چوری چھپے کے مدنظر میں، طے کیا۔ صحت مند ہونے کی وجہ سے، مجھے دروازے کا تالہ کھولنے میں مشکل پیش آئی۔ میں نے جتنی زیادہ کوشش کی، اتنا ہی میرا ہاتھ کانپا، جیسے کسی جرم کے ارتکاب کے بعد کانپتا ہے۔ کوئی چیز کمرے میں میرا انتظار کر رہی ہوگی، وہ کمرہ جہاں، میں تنہا رہتا تھا اور تنہائی موجود نہیں تھی؟ لڑکی کے، روکی وجہ سے، اب میں اکیلا نہیں تھا۔ اور یوں خود میری اپنی ہی تنہائی مجھے ڈرانے کے لیے، وہاں میری منتظر تھی۔

"آگے بڑھو۔" میں نے لڑکی کا بازو باہر نکالتے ہوئے، آخرکار دروازہ کھولا "میں تمہیں اپنے کمرے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں لائٹ جلاؤں گا۔"

"کیا تم کسی چیز سے خوف زدہ ہو۔" بازو یہ کہتا ہوا محسوس ہوا "کیا یہاں کچھ ہے؟"

"تمہارے خیال میں وہاں کچھ ہو سکتا ہے؟"

"میں کچھ سونگھ رہا ہوں۔"

"لو؟ یہ میں ہوں گا جسے کہ تم سونگھ رہے ہو۔" کیا تم اندھیرے میں میرے سائے کی نشانیاں نہیں دیکھ رہے ہو؟ احتیاط سے دیکھو۔ ہو سکتا ہے کہ میرا سایہ میری واپسی کا منتظر ہو؟"

"یہ ایک اچھی بو ہے۔"

"اوہ، میکولیا۔" میں نے بشاشت سے کہا۔ میں خوش تھا یہ میری تنہائی کے بوسیدہ پن کی بو نہیں تھی۔ میرے مشن مہموں کے لیے میکولیا کی مناسبت بالکل ٹھیک تھی۔ میں اندھیرے سے مانوس ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ بہت گہرے اندھیرے میں بھی جان سکتا تھا کہ ہر چیز کہاں پر تھی۔

"مجھے لائٹ جلانے دو۔" بازو کی طرف سے ایک ریمارکس آیا "میں اس سے پہلے تمہارے کمرے میں نہیں گیا۔"

"شکریہ، مجھے بہت خوشی ہوگی۔" اور کسی نے نہیں لیکن صرف میں نے اس سے پہلے یہاں کی

بتیاں جلائی ہیں۔" میں نے دیوار کے ساتھ لگے سوئچ کی طرف بڑھتے ہوئے بازو کو تھامے رکھا۔ ایک ہی وقت میں ساری کی ساری پانچ لائٹیں چھت میں، میرے بیڈ پر، باہر اور باتھ روم میں جل اٹھیں۔ میں نے نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی روشن ہوں گی۔

میکولیا اپنے پورے جوبن پر تھا۔ اس صبح کو یہ ایک شعلے کی شکل میں تھا۔ یہ عین اسی وقت کھلنے والا ہو سکتا تھا اور اسی صورت میں پر زرد ریشے موجود تھے۔ میں نے تحیر کے ساتھ بہت نزدیکی سے زرد ریشوں کو دیکھا۔ جب میں نے ایک رہ گئے ہوئے زرد ریشے کو دیکھا تو ہوا کے جھونکے سے جو میرے پر تھا، متحرک ہونا شروع کیا۔ اس کی پنکھڑیاں کندن کے ٹکڑے کی طرح تھیں۔ اس نے زرد ریشوں کو اپنے ہاتھ میں سمیٹا۔ میں انھیں کوڑے دان میں پھینکنے کے لیے آگے بڑھا۔

"کتنی تیز بو ہے۔ یہ میری جلد میں پیوست ہو رہی ہے۔ میری مدد کرو۔"

"تم تھک گئے ہو گے۔ یہ کوئی آسان ٹرپ نہیں تھا۔ میرے خیال میں تمھیں تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنا چاہیے۔"

میں نے بازو کو بیڈ پر لٹا دیا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں نے اسے نرمی سے تھپکا۔

"یہ کتنا خوب صورت ہے۔ یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔" بازو ستر کی چادر پر سے بولے گا۔ نیلگوں آسمانی زمین پر تین رنگوں کے پھول پرنٹ کیے گئے تھے۔ جو شخص بیمار رہتا ہو، اس کے لیے کسی قدر خوش کن تھے۔

"تو یہ ہے وہ جگہ، جہاں ہم رات گزاریں گے۔ میں بہت خاموش رہوں گا۔"

"وہ۔"

"میں تمھارے پہلو میں ہوں گا اور یہیں بھی ہوں گا۔"

ہاتھ نے نرمی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ناخن جو احتیاط سے پالش کیے گئے تھے، ہلکے گلابی تھے نوکیں انگلیوں سے کافی آگے تک بڑھائی گئی تھیں۔

میرے اپنے چھوٹے اور موٹے ناخنوں کے برعکس، اس کے ناخن بڑی عجیب خوب صورتی کے حامل تھے، جیسے ان کا تعلق کسی ماورائی مخلوق سے نہ ہو۔ ایسی انگلیوں کی نوکوں والی، ایک عورت صرف انسانیت کی بلندی پر ہی فائز ہو سکتی تھی۔ یا یہ کہ وہ خود کو عورت پن کی طرف مائل کر رہی تھی؟ اس کے اندر کے نمونے سے ایک چمک دار چھلکا، شبنم میں بنائی ہوئی ایک پتی، میں نے (اس کے بارے میں) واضح

پسندیدگیوں کے بارے میں سوچا۔ حالانکہ میں ابھی تک اپنے چھلکے اور پتی کے بارے میں نہیں سوچ سکا تھا، جس کا رنگ اور شکل دن سے ملتی جلتی تھی۔ یہ پری کی انگلیوں کے ناخن تھے جن کا موازنہ کسی اور چیز سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک پتلی سی پتی اور نازک سے چھلکے کی حد سے زیادہ نیم شفاف، یہ چیزیں کسی ولیے جیسی، شبنم کو اپنے اندر سنبھالے ہوئے لگتی تھیں۔ ہر دن اور ہر رات میں اس کی قدر قوت، اس غم ناک خوب صورتی کو چکاتے ہوئے مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ یہ میری تنہائی میں پھنس گئی۔ شاید میرے اشتیاق، میری تنہائی نے، ان کو شبنم میں تبدیل کر دیا تھا۔

میں نے اس کے پتلے لمبے ناخن کی طرف دیکھتے ہوئے، جسے میں نے اپنے انگوٹھے سے رگڑا تھا، اپنے خود مختار، تحفظی انگشت شہادت پر، اس کی چھوٹی انگلی رکھ دی۔ میری انگلی نے اس کی انگلی کی نوک کو، جو ناخن کی آڑ میں تھی، چھوا۔ انگلی اور کہنی بھی جھک گئی۔

"کیا یہ گدگداتی ہے؟" میں نے کہا۔ "اسے ایسا کرنا چاہیے۔"

میں نے لاپروائی سے کہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عورت کی انگلیوں کی نوکیں اس وقت بہت حساس ہوتی ہیں، جب کہ ان کے ناخن بڑے ہوں۔ اور اس طرح میں نے لڑکی کے بارے کو بتایا کہ میں دوسری عورتوں کو بھی جانتا تھا۔

ایک وہ جو کہ اس لڑکی سے، جس نے مجھے بازو ادھار دیا تھا، بہت زیادہ بڑی عمر کی نہیں تھی لیکن وہ مردوں کے تجربے کے حوالے سے کہیں زیادہ پختگی کی حامل تھی، میں نے اس سے سنا تھا کہ انگلیوں کی نوکیں، جو ناخنوں سے ڈھکی ہوتی ہیں، اکثر بہت زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک تھی، جو چیزوں کو سر انگشت سے نہیں بلکہ ناخنوں سے چھوتی تھی اور اسی لیے جب کوئی چیز ان کے مقابل آتی تھی تو یہ مدھم پڑ جاتی تھیں۔

میں نے اس انکشاف پر حیرانی کا اظہار کیا تھا تو وہ کہتی چلی گئی "مثلاً تم کھانا پکا رہے ہو یا کھا رہے ہو، کوئی چیز تمہاری انگلیوں کو چھو جائے تو تم اپنے کندھے کو جھٹکا دیتے ہو، یہ بہت گدگداتی ہے۔"

کیا یہ نظر تھی، جو ناصاف محسوس ہوتی تھی، یا کہ سر انگشت؟ جو کوئی چیز بھی اس کی انگلیوں کو چھوتی تو وہ اس کے ناصاف ہونے کی بنا پر تلملا اٹھتی۔ اس کی اپنی صفائی ایک الماس شبنم کے قطرے کے پیچھے جو کہ ناخن کے سائے کے نیچے موجود ہوتی تھی، کی اوٹ میں رہ جاتی تھی۔ کسی کو یہ تصور

نہیں کرنا چاہیے کہ دس انگلیوں میں سے ہر انگلی کے لیے ایک علاحدہ شبنم کا قطرہ ہوگا۔

یہ فطری بات تھی کہ مجھے ان سرگوشیوں کو زیادہ سے زیادہ چھونا چاہیے تھا لیکن میں نے خود کو روکے رکھا۔ میری تنہائی نے مجھے پیچھے کر دیا۔ وہ ایک ایسی عورت تھی، جس کے بدن پر چند مارک سے نشان رہ جانے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

وہ لڑکی، جس نے مجھے پہلا زوردار تحفہ دیا تھا یہ ان میں سے ہو سکتے تھے۔ شاید ایسی کسی لڑکی کے انگلیوں کی نوکوں سے کھیلنے سے، مجھے حساس ندامت نہیں بل کہ الفت محسوس ہوئی لیکن اس نے مجھے پہلا رویا کوئی کھیل کھیلنے کے لیے نہیں دیا تھا۔ مجھے اس کے اس انداز کو مزاحیہ رنگ نہیں دینا چاہیے۔

''کھڑکی۔'' میں نے جھجک نہیں دیا کہ کھڑکی تو پہلے ہی کھلی ہوئی تھی لیکن پردہ نیچے نہیں گرا ہوا تھا۔

''کیا کوئی دیکھ لے گا؟'' لڑکی کے بازو نے پوچھا۔

''کوئی مرد یا عورت اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

''کوئی نہیں مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ اپنی ذات ہوگی، تمھاری۔''

''اپنی ذات'' یہ کیا ہے؟ یہ کہاں ہے؟''

''بہت دور۔'' بازو نے کہا جیسے کہ وہ تسلی دینے کے لیے کہہ رہا ہو ''لوگ خود کو اپنی ذات کو پانے کے لیے کھوتے رہتے ہیں، بہت دور۔''

''اور کیا وہ ایسا کر پاتے ہیں؟''

''بہت دور۔'' بازو نے ایک بار پھر کہا

مجھے محسوس ہوا کہ بازو اور لڑکی بذات خود ایک دوسرے سے لامتناہی دوری پر تھے۔ کیا اتنی دوری سے بازو لڑکی کی طرف لوٹ سکے گا؟ یا اتنی دوری سے میں اسے واپس لے جانے کے قابل ہو سکوں گا؟ بازو مجھ پر انحصار کرتے ہوئے، پرسکون انداز میں پڑا تھا اور کیا وہ لڑکی اس پرسکون اعتماد سے سو رہی ہوگی؟ کیا وہاں پر کمرے میں ایک ذرا سا خواب نہیں ہوگا؟ کیا جب وہ اس سے جدا ہوئی تھی تو وہ اپنے جذبوں کو ضبط کرتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی تھی؟ بازو اب میرے کمرے میں تھا، جس سے لڑکی ابھی تک مل نہیں پائی تھی۔

نمی نے کھڑکی کو دھندلا دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نوڈ (مینڈک) نے اپنا پیٹ اس پر پھیلا رکھا ہو۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے دھند نے بارش کو ہوا کے درمیان ہی روک رکھا ہے اور کھڑکی کے باہر فاصلہ معدوم ہو گیا تھا جو ایک اجڑے ہوئے باغیچے میں پڑا ہوا تھا۔ وہاں دیکھنے کے لیے چھتیں نہیں تھیں اور نہ ہی سننے کے لیے ہارن تھے۔

"میں کھڑکی بند کر دوں گا" پرانے تک پہنچتے ہوئے میں نے کہا۔ نمی بہت زیادہ تھی۔ میری تینتیس سالہ زندگی سے کرمچ ظاہر آنے والا میرا چہرہ کھڑکی پر جھک گیا تاکہ میں نے پردہ کھینچنے میں کوئی تردد نہیں کیا تھا۔ میرا چہرہ غائب ہو گیا۔

اچانک ایک کھڑکی نے یاد مجھ تک پہنچی۔ ایک ہوٹل کے وین فلور پر، دو چھوٹی لڑکیاں سرخ رنگ کے کھلے سویٹر پہنے ہوئے کھڑکی کے قریب کھیل رہی تھیں۔ بالکل اس طرح کے بچے، ایسے ہی کپڑوں میں۔ شاید جڑواں۔ ان کا تعلق مغربی دنیا سے تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے ہوئے، وہ کندھوں کے ساتھ اسے اٹکھیلتے ہوئے شیشے کے ساتھ ٹکرائے۔ ان کی ماں، جس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی، کچھ بیچنے میں مصروف تھی۔ اگر شیشے کے بڑے بڑے ٹکڑے ڈھیلے ہو جاتے یا ٹوٹ جاتے تو انھوں نے وین فلور سے نیچے گر جانا تھا۔ یہ میں ہی تھا، جس نے انھیں اس خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ اس کی وجہ اس سے بے خبر تھی۔ وہ شیشہ اصل میں اتنا مضبوط تھا کہ وہاں (گرنے کا) کوئی خطرہ موجود نہیں تھا۔

جب میں کھڑکی کی طرف سے مڑا تو بازو نے کہا۔ "یہ بہت خوب صورت ہے۔ شاید وہ بستر کی طرز پر بنائے گئے پھول کے نمونوں والے پردے کے متعلق کچھ کہہ رہی تھی۔

"اوہ، لیمن سورج کی وجہ سے، اس کا رنگ اڑ گیا ہے اور یہ تقریباً اپنی عمر پوری کرنے والا ہے۔" میں بیڈ پر بیٹھ گیا اور بازو کو اپنے گھٹنے پر رکھ لیا۔ یہ وہ چیز ہے جو خوب صورت ہے۔ کسی بھی چیز سے زیادہ خوب صورت۔"

اس کا ہاتھ اپنی ہتھیلی کو اپنی دائیں ہتھیلی پر اور کندھے کو اپنے بائیں ہاتھ پر لیتے ہوئے، میں نے کہنی کو خم کیا اور پھر دوبارہ ایسا کیا۔

بازو نے مسکرانے کے انداز میں کہا "ذرا تیز سے، کیا تم کوئی کھیل کھیل رہے ہو؟"

"کم از کم ایسا تو نہیں ہے۔"

روشنی کی طرح گزر جانے والی مسکراہٹ بازو پر ابھر آئی۔ یہ لڑکی کے گال پر ابھرنے والی بالکل تازہ مسکراہٹ تھی۔

میں مسکراہٹ کو جانتا تھا۔ کہنیاں میز پر ٹکائے ہوئے، وہ ڈھیلے انداز میں اپنے ہاتھوں کو بند کرے گی اور اپنی ٹھوڑی وہاں، ان پر رکھ دے گی۔ یہ پوز ایک نوجوان لڑکی کے لیے خوش نما نہیں ہونا چاہیے حالاں کہ یہ کرنے میں ایک ہلکا سا معیار غرور موجود تھا۔ پھر بھی "کہنیاں میز پر" والا اظہار غیر مناسب حد تک میں پیش کیا گیا تھا۔ کندھوں کی گولائی، انگلیاں، ٹھوڑی، گال، بال، بیٹی پتلی گردن، دل یہ سب ایک واحد متناسب حرکت کے ساتھ اکٹھے آئے تھے۔ چھوٹی اور پہلی انگلی کو تھوڑا کر مہارت سے چھری کانٹے کو استعمال کرتے ہوئے، وہ وقتاً فوقتاً نہایت آہستگی سے، اوپر اٹھائے گی۔ غذا، چھوٹے ہونٹوں سے گزر جائے گی اور کھائے گی۔ میرے سامنے کھانے پر موجود، اس انسان سے زیادہ کھلے، چہرے اور ہاتھوں کی موسیقی مدعو تھی۔ اس کی مسکراہٹ کی روشنی، اس کے بازو کی جلد میں سے گزرتی ہوئی بہہ رہی تھی۔

بازو مسکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا کیوں کہ جب میں نے اسے چھوا تو ہموار جلد کے اوپر سائے اور روشنی کی لہریں کھینچنے کے لیے مضبوط، مبارک پٹھوں پر سے بہت نرم لہریں گزر گئیں۔ اس سے پہلے جب میں نے میز کے نیچے مچھلیوں کی ٹانگوں کو چھوا تو بازو کے اوپر سے گزرتی روشنی نے کہنی کے جھٹکا دے کر میری توجہ مبذول کرلی۔ اور یہ کسی کھیل پر مبنی جذبے کی وجہ سے نہیں تھا بل کہ یہ وہی تھا جس نے مجھے اس جھٹکے نے یہ جھٹکا دے کر پکارا دیا تھا۔ میں رک گیا اور میں نے اپنے گھٹنے پر پھیل کر پڑے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ تازہ روشنیاں اور سائے ابھی تک اس پر سے گزر رہے تھے۔

"تم کہہ سکتے ہو کہ میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ تم محسوس کرتے ہو کہ مجھے اپنا ہاتھ تمھارے بازو سے جوڑنے کی اجازت ہے؟"

"میں اجازت دیتا ہوں۔"

"میں کسی وجہ سے ایسا کرنے سے ڈرتا ہوں۔"

"وہ؟"

"کیا میں کر سکتا ہوں؟"

"پلیز۔"

میں نے سن لیا تھا کہ مجھے اجازت مل گئی تھی، میں متذبذب تھا کہ آیا میں اس بات کو قبول کروں یا نہ کروں۔ "دوبارہ کہو، کہو، پلیز۔"

"پلیز، پلیز۔"

مجھے یاد آیا یہ اس عورت جیسی آواز تھی، جس نے مجھے اپنا آپ سونپ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لڑکی نے، جس نے مجھے پاگل کر دیا تھا، یہ عورت اس جیسی خوب صورت نہیں تھی۔ شاید اس کے ساتھ کچھ تھوڑی سی عجیب بات تھی۔

"پلیز۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

میں نے اپنی انگلیاں اس کے ہونٹوں پر رکھیں اور انھیں بند کر دیا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "خدا، خدا، رو دیا۔ تب یہودی بولے، لو دیکھو وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔"

"وہ اس کے لیے ایک نشانی تھی۔ یہ مرد و عورت کی کہانی تھی۔ شاید ایک عورت کی طرح اس نے اسے غلط سوچا تھا۔ شاید جانتے بوجھتے ہوئے اس کا متبادل بنایا تھا۔

اس منظر کے لیے اتنے نامناسب الفاظ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے ایسے جذبات سے گھورا، جیسے ابھی آنسو اس کی بند آنکھوں سے نکل پڑیں گے۔

اس نے انھیں کھولا اور اپنے کندھوں کو اٹھایا۔ میں نے اس کو اپنے بازو سے پیچھے کیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سر کے پیچھے رکھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے تکلیف پہنچا رہے ہو۔"

سفید تکیے پر خون کا ایک چھوٹا سا دھبا موجود تھا۔ میں نے اس کے بالوں کو پرے کرتے ہوئے، اس کے سر پر پھیلتے ہوئے خون کے قطرے پر اپنے ہونٹ رکھے۔

اس نے اپنی تمام انگلیاں میں لگاتے ہوئے کہا۔ "کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ معمولی سے چھوٹے پر میرا خون آسانی سے بہہ نکلتا ہے۔"

ایک بے چین اس کی جلد میں چبھ گئی تھی۔ ایک چٹکی اس کے اندر چھڑتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

اگرچہ میں سوچتا ہوں، مجھے سمجھ ہے کہ جب ایک عورت کسی کو اپنا آپ سونپ دیتی ہے تو وہ ایسا محسوس کرتی ہے، کچھ بھی بھی تک اس عمل کے متعلق کچھ ہے جو غیر واضح شدہ ہی ہے۔ یہ اس کے لیے کیا ہے؟ وہ کیوں ایسا کرنا چاہتی ہے، کیوں اسے ہی پہل کرنی چاہیے؟ میں اصل میں کبھی پسپائی

اختیار نہیں کر سکتا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ عورت کا جسم اس کے لیے بنایا گیا تھا حتیٰ کہ اب بھی، میرے جیسے بوڑھے کے لیے، یہ ایک عجیب بات ہے۔ اور جیسا کہ مختلف عورتیں جو امدار اختیار کرتی ہیں، نہ چاہتے ہوئے بھی، یہ بعض شاید، یا حتیٰ کہ مماثلت کے ساتھ، یہ عجیب نہیں ہے؟ شاید جو اجنبیت، میں اس سارے عمل میں پاتا ہوں وہ ایک نوجوان شخص جیسا تجسس ہے، شاید کسی شخص کی وہ مایوسی جو سالوں کے اندر بڑھ جاتی ہے یا شاید ایسی روحانی کمزوری جس میں، میں مبتلا ہوں۔

پیچھے بیٹھے کے عمل میں، اس کو جو دکھ تھا، وہ سب عورتوں میں مشترک نہیں تھا۔ اور ایک وقت میں یہ صرف اسی کے ساتھ تھا۔ نقرئی دھاگا کٹ چکا تھا۔ سونے کا پیالہ تباہ ہو چکا تھا۔

"پیلیٹ" ہر روز نے کہا تھا اور اس طرح اس نے مجھے، ہر نئی لڑکی کے بارے میں یاد دہایا تھا۔ لیکن کیا دونوں آوازیں ایک جیسی نہیں؟ کیا وہ ایک ہی طرح نہیں سنائی دیتی تھیں؟ کیوں کہ وہ تو ایک جیسے ہی تھے۔ یہ ہر روز پورے جسم کے ساتھ میں سے اپنے لیے خود مختاری حاصل کرتی تھی، جس سے کہ یہ علیحدہ ہو گئی تھی؟ اور یہ حفاظت، حفاظت، ذمہ داری یا ضبط کے بغیر، اس کے اپنے آپ کو تج دینے کا عمل، کسی بھی چیز کے لیے تیاری کی طرح نہیں تھا؟ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اگر میں اس کے بارے میں، اپنے ہر روز کی تبدیلی کی ہلاکت کو کیوں کہتا ہوں تو، میں کوئی بھی قابل بیان درد میں مبتلا کر دوں گا۔

میں نے اپنے گھٹنے پر موجود بازو کو غور سے دیکھا۔ کہنی کے اندر ایک سایہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کو چوس سکتا ہوں۔ میں نے سایے کو سمیٹنے کے لیے اپنے ہونٹوں کو اس پر رکھا۔

"یہ مدگدا تا ہے۔ ذرا تمیز اختیار کرو۔" بازو میرے ہونٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میری گردن کے گرد موجود تھا۔

"اب، جب میں ایک اچھی سی مے نوشی کر رہا تھا۔"

"اور تم کیا پی رہے تھے؟"

میں نے جواب نہیں دیا۔

"تم کیا پی رہے تھے؟"

"روشنی کی حدت کی خوشبو۔"

دھند اور ریدو دھیز ہو گئی تھی کیوں کہ میکو یا کے پتے گیلے ہو چکے تھے اور پتہ نہیں کون سی بار تھیں ریڈیو سے نشر ہوں گی؟ میں اپنے سر پر رکھے ریڈیو کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ اسے سننے کے

ہے، جب کہ بارہ میں گرمی کے گرم ہو جاتی لیکن مجھے شرط تھی کہ میں کچھ ایسا کروں کہ گیلی شاخوں اور خوان کے گیلے پاؤں اور پروں کی وجہ سے چھوٹے پرندے نیچے گرے ہوئے ہیں اور اڑ نہیں سکتے۔ پرکوں میں سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کو احتیاط کرنی چاہیے، جنہیں وہاں کا روشن ڈالیں اور گرم ہو جاتی ہے تو ہند شاید اپنا رنگ تبدیل کر لے گی۔ سننے والوں کو چاہیے کہ اگر ہند گلابی یا ارغوانی رنگ اختیار کر لے تو وہ اپنے دروازوں پر تالے ڈال دیں۔

"رنگ کی تبدیلی؟" میں بڑبڑایا۔ "ارغوانی اور گلابی رنگت اختیار کرنا؟"

میں نے پردہ ہٹایا اور باہر دیکھا۔ ہند بے وزنی کی حالت میں نیچے اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بات اس وجہ سے تھی کہ ایک پگلا اندھیرا، رات کے کالے پن سے مختلف، یہاں وہاں متحرک تھا۔ ہند کی رفتار اتنا ہی محسوس ہوتی تھی اور اس سے آگے ہوئی ذرا ہوئی تیز، کنڈلی مارے بیٹھی تلملا رہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے، جب میں اس اوجھار لیے گئے بارہ کے ساتھ، گھر کی طرف آ رہا تھا تو ارغوانی ملبوس والی، وہ عورت جو ہار چلا رہی تھی، اس کی اگلی اور پچھلی ٹانگیں کی گرفتیں، ہند میں مدغم ہو رہی تھیں۔ ایک مدھم ارغوانی رنگ کی پھیلی ہوئی عظیم گولائی، مجھے اپنی طرف آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے پردہ نیچے کر دیا۔

"بستر پر جانا چاہیے ہمیں بھی۔"

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت دنیا میں کوئی بھی جاگ نہیں رہا ہوگا۔ جاگتے رہنے میں ایک خوف تھا۔ بارہ کو اپنی ٹرکوں سے علاحدہ کر کے میں نے میز پر رکھ دیا۔ میں نے سوتی پرنٹ والا غیر استعمال شدہ لباس پہن لیا۔ جب میں کپڑے بدل رہا تھا تو بازو مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس طرح دیکھنے پر شرم محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں، اس طرح بے لباس حالت میں، مجھے آج تک کسی عورت نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس بارہ کے ساتھ میں بستر پر آ گیا۔ میں اس کا سامنا کر رہا تھا اور کچھ آہستگی سے میں نے اسے اپنی چھاتی کے قریب لایا۔ یہ خاموش پیار رہا۔ وقفے وقفے سے میں بارش کی کم ہوتی آواز سن رہا تھا۔ ایک ہلکی سی آواز جیسے ہند بارش میں تبدیل ہو رہی ہو، کہ وہ خودی قطروں کی شکل اختیار کر رہی ہو۔ کمبل کے نیچے انگلیوں نے میرے ہاتھ کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ اب گرم ہو گئی تھیں اور اس طرح مجھے احساس کی بے حد خاموش حدت مل رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ انھوں نے مجھے میری اپنی حرارت کے برابر

گرم نہیں کیا تھا

"کیا تم سو گئے ہو؟"

"نہیں۔" بازو نے جواب دیا۔

"تم اتنے خاموش تھے کہ میں نے سمجھا تم سو گئے ہو۔"

"تم کیا یہ چاہتے ہو کہ میں وہ کروں؟"

اپنے کمرے کو دیکھتے ہوئے میں نے ازسرِ نو اپنے بستر کی طرف دیکھا۔ خاموشی میں جو فرق تھا وہ اس میں مدغم ہو گیا۔ کسی حد تک میں خوش تھی، کسی حد تک ٹھنڈی رات، میں جلدی ملامت بہت خوش کن تھی۔

لائٹس ابھی تک جل رہی تھیں۔ میں بستر پر آنے سے پہلے انھیں بجھانا بھول گیا تھا۔

"لائٹس۔" میں اٹھا اور بازو میری چھاتی سے گر گیا۔

میں نے اسے اٹھانے میں جلدی کی۔ "کیا تم لائٹس آف کرو گے؟" میں دروازے کی طرف بڑھا۔

"تم اندھیرے میں سوتے ہو یا روشنی میں؟"

بازو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ یقیناً جانتا تھا کہ اس نے جواب کیوں نہیں دیا؟ میں اس کے شبینہ معمولات کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے وہ تصاویر کا آپس میں موازنہ کیا۔ ایک میں وہ اندھیرے میں تھی اور دوسری میں روشنی میں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج کی رات اپنے بازو کے لیے وہ روشنیاں جلائے رکھے گی۔ کسی حد تک میں خود بھی انھیں جلتا ہوا رہنے دینا چاہتا تھا۔ میں بازو کو بغور دیکھنا چاہتا تھا، اس لیے میں اس کے سو جانے تک، جاگتے رہنا چاہتا تھا لیکن میری انگلیاں دروازے کے ساتھ لگے سوئچ کو آف کرنے کے لیے پھیل گئیں۔

بازو میرے سینے سے لگا ہوا تھا اور میں واپس آ کر اندھیرے میں لیٹ گیا تھا۔ میں خاموشی سے لیٹا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ وہ سو جائے۔ شاید اندھیرے کی بے اطمینانی یا ذہنی وجہ سے، یا تو کھلی حالت میں، میرے پہلو میں پڑا تھا اور اس وقت پانچوں انگلیاں میرے سینے پر چڑھ رہی تھیں۔ کبھی از خود ختم ہوتی اور وہ مجھ سے ہم آغوش ہو گئی۔

لڑکی کی کلائی پر نبض ایک نازک سے انداز میں چل رہی تھی۔ یہ میرے دل پر پڑ رہا، اور یوں دو نبضیں ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔ اس کی نبض میری نبض سے چھوا ہوئی چل رہی تھی، پھر یہ دونوں

اٹھی ہو گئیں اور تب مجھے صرف اپنی ہی دھڑکن کا احساس ہوا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کون سی آہستہ تھی اور کون سی تیز تھی۔

شاید اس نقش اور دل کی دھڑکن کی پہچان ختم ہونے کے لیے ایک ہو گئی تھی جب کہ میں اپنے بازو کو اس کے بازو سے تبدیل کر سکتا تھا یا شاید وہ سو گیا تھا۔ ایک بار میں نے ایک عورت کو کہتے سنا تھا کہ عورتیں ہم بستری کے دوران کم خوش ہوتی ہیں۔ نسبت اپنے مردوں کے پہلو میں سکون کی نیند لینے کے۔ لیکن میں نے اس سے پہلے کسی عورت کو اپنے ساتھ اتنے سکون سے سویا ہوا نہیں پایا تھا جیسے کہ یہ بازو اس وقت سو رہا تھا۔

میں اس کے اوپر موجود نبض کی رفتار کی وجہ سے اپنے دل کی دھڑکن کے بارے میں آگاہ تھا۔ ایک دھڑکن اور اگلی دھڑکن کے درمیان فاصلے پر بھی پتہ چل رہا تھا اور پھر واپس بھی ہو رہا تھا۔ جب میں یہ دھڑکن سن رہا تھا تو فاصلہ بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم جو وہ رچا گیا تھا وہ اتنا ہی فاصلے پر کسی منزل کو نہیں پا رہا تھا۔ اگلی دھڑکن نے اسے واپس بلا لیا۔ مجھے ڈر لگنا چاہیے تھا لیکن میں نہ ڈرا۔ تب میں نے تکیے کے قریب موجود سوئچ کو ٹٹولا۔

اسے آن کرنے سے پہلے میں نے خاموشی سے کمبل کو تہہ کر دیا۔ جو کچھ ہو رہا تھا بازو اس سے بے خبر سو رہا تھا۔ ایک مدھم سی سفیدی کی مرمری لکیر نے میرے تکیے جیسے بستر کے میں سے رکھا تھا جیسے کہ وہ خود میرے اندر سے برآمد ہو رہی ہو اور صبح کے وقت کے چھوٹے سے سورج کی طرح چمک رہی تھی۔

میں نے لائٹ جلائی، اپنا ہاتھ انگلیوں اور کندھے پر رکھا، اور بازو کو سیدھی طرف کھینچا۔ میں نے روشنی اور سائے کے کھیل پر غور کرتے ہوئے، اسے خاموشی سے اپنے ہاتھوں میں موڑا۔ کلائی کی تنگی اور پھیلاؤ سے، اوپر کندھے کی گولائی تک، بغل کی ملگجی گولائی پر، دوبارہ سے تنگی تک، بغل کی اندرونی طرف ملگجی پستی تک، کلائی کی طرف تنگ ہوتی ہوئی گولائی تک ہتھیلی اور پشت کی طرف اور انگلیوں تک۔

"میں اسے اپناؤں گا۔" میں لفظوں کی بڑبڑاہٹ سے آگاہ نہیں تھا۔ بے خودی کے عالم میں، میں نے اپنا دایاں بازو علاحدہ کیا اور اسے لڑکی کے بازو کے ساتھ تبدیل کر لیا۔ ایک ہلکا سا سانس لیا گیا۔ یہ بازو کا سانس تھا یا میرا، میں بتا نہیں سکتا۔ میرے کندھے کا سفر ابھی موجود تھا اور میں اس تبدیلی

سے آگاہ تھا۔ لڑکی کا بازو، جو کہ اب میرا تھا، کانپ رہا تھا اور اسے ہوا کی طلب تھی۔ اسے چومتے ہوئے میں اسے اپنے منہ کے قریب لایا۔

"کیا یہ تکلیف دیتا ہے۔ کیا تمہیں تکلیف پہنچی؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں، بالکل نہیں۔" الفاظ مہمل تھے۔

آسمانی بجلی کی طرح، ایک جھرجھری میرے اندر ابھری۔ میں انگلیاں اپنے منہ میں لے گیا۔ میں نے کسی قدر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ لڑکی کی انگلیاں میری زبان پر تھیں اور جو کچھ میں نے کہا تھا، وہ لفظوں میں نہ ڈھل سکا تھا۔

"پیٹر، سب ٹھیک ہے۔" بازو نے جواب دیا۔ کپکپی ختم ہو گئی۔

"مجھے کہا گیا تھا کہ تم کر سکتے ہو اور اب....."

میں نے کسی چیز کو بھانپ لیا۔ میں لڑکی کی انگلیاں اپنے منہ میں محسوس کر سکتا تھا لیکن اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں، جو اب اس کے اپنے ہاتھ کی تھیں، میرے ہونٹوں اور دانتوں کو محسوس نہ کر پائیں۔ میں نے اپنے دائیں بازو کو جھٹکا اور میں اس جھٹکے کا احساس نہ کر سکا۔ بازو اور کندھے کے درمیان ایک سناٹا تھا، ایک تاریکی تھی۔

"خون نہیں چل رہا۔" میں پھٹ پڑا۔ "یہ چل رہا ہے یا نہیں؟"

میں پہلی دفعہ خوفزدہ ہوا تھا لہٰذا بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا اپنا بازو میرے قریب پڑا ہوا تھا۔ مجھ سے ملک، یہ ایک نظر آنے والی چیز تھی۔ لیکن زیادہ اہم یہ تھا کہ یہ جنس تو نہیں رہی تھی؟ لڑکی کا بازو گرم تھا اور اس کی نبض چل رہی تھی اور میرا، جو اپنا تھا، وہ ٹھنڈا اور سخت ہوا جا رہا تھا۔ لڑکی کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے دائیں بازو کو بھی پکڑ لیا۔ میں نے اسے پکڑ تو لیا لیکن وہاں کوئی محسوسات نہیں تھے۔

"کیا یہ نبض ہے؟" میں نے بازو سے پوچھا "کیا یہ ٹھنڈی ہو چکی ہے؟"

"تھوڑی سی۔ تھوڑی سی مجھ سے زیادہ ٹھنڈی ہے۔ میں بہت زیادہ گرم کو بھول چکی تھی۔"

زیر و بم میں کچھ خاص سا عورت پن تھا۔ اب جب کہ میرا بازو میرے کندھے کے ساتھ بندھ گیا تھا، اور یہ میرا بن گیا تھا، یہ عورت کی طرح کا تھا، جو پہلے ایسا نہیں تھا۔

"نبض نہیں رکی ہے۔"

"تمہیں زیادہ پر اعتماد ہونا چاہیے۔"

"کس چیز کے بارے میں؟"

تم نے میرے ساتھ اپنا بازو بدلا، کیا تم نے ایسا نہیں کیا؟"

"یہ خون چل رہا ہے؟"

Woman whom seekest thou? vou know the passage?

Woman why weepest thou? Whom seekest thou?

"اکثر اوقات جب میں خواب دیکھتا ہوں تو رات کو بیدار ہونے پر میں خود سے سرگوشی کرتا ہوں۔" اس بارے شک یہ "میں" میرے کندھے سے لگے دلکش بازو کے مالک کا ہوگا۔

انجیل کے یہ الفاظ ایسے تھے، جو کسی ازلی آواز میں کسی ازلی جگہ سے کہے گئے تھے۔

"یہ اس کی نیند خراب ہوئی؟" میں نے بھی اسی طرح کہہ دیا۔ "یہ وہ کوئی ڈراونا خواب دیکھ رہی ہوگی۔ یہ وہ ہے جس میں ڈراونے خوابوں کے خون آوارہ گردی کرتے ہیں۔ یہ میں بھی شیاطین کو بھی کھانسنے پر مجبور کر دے گی۔

ان کو سننے سے پرہیز رکھنے کے لیے لڑکی کے بازو نے، جس کے پاس ابھی تک میرا ہاتھ تھا، میرے دائیں کان کو ڈھانپ رکھا تھا۔

یہ سب میرا خیال ہی تھا، یہ وہم تھا لیکن اس کی حرکت اب میری مرضی کی پابند نہیں تھی کہ یہ اس کی اپنی تھی، اس کے اپنے ہی دل کی لگتی تھی۔ بہرحال یہ ملا جلا سی طرح بھی ملال نہیں تھی۔

"نبض نبض کی آواز۔"

میرے پاس میرے اپنے داہنے بازو کی نبض تھی۔ لڑکی کا بازو، جس کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا، میرے کان تک آیا اور میری اپنی کلائی میرے کان پر تھی۔ بازو کیوں گرم تھا، جیسا کہ لڑکی کے بارے نے کہا تھا، صرف اس کی انگلیوں اور میرے کانوں سے محسوساتی طور پر زیادہ ٹھنڈا تھا۔

"میں بدروحوں کو دور رکھوں گا۔" لڑکی کی چھوٹی انگلی کے لمبے ناخن نے شریر یا نہ شوخی سے میرے کان میں ہلچل مچائی۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکا۔ میرے بائیں ہاتھ نے، جو شروع سے میرا تھا، میری دائیں کلائی پکڑی جو درحقیقت اس لڑکی کی تھی۔ جیسے ہی میں نے اپنا سر پیچھے کھینچا، میں نے لڑکی کی چھوٹی انگلی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ کی چار انگلیوں نے بازو کو پکڑ رکھا تھا۔ میں نے اسے اپنے دائیں کندھے سے لیا تھا۔ چھوٹی انگلی (کیا ہمیں کہنا چاہیے کہ اس انگلی کو آزادانہ طور پر کھیلنے کی اجازت دی گئی

تھی؟) کیلی، تھوڑی پشت کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ ناخن کی نوک نے ہلکے سے میرے دائیں بازو کو چھوا۔ انگلی کسی لڑکی کے مارک، تھوڑی جیسی مکمل پوزیشن میں جھکی ہوئی تھی، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایک مارک لڑکی کا ہو، تھوڑی میرے جیسے شخص کے تخت ہونے جو رجیسا ہو۔ اپنی میاد سے یہ تیسری راہوں میں اٹھا ہوا تھا۔ پہلے جوڑ پر، ایک دوسرے زاویے پر، جھکا ہوا تھا اور اس سے اگلے پر، پھر ایک اور زاویے پر پھر اس نے ایک مربع شکل بنائی یعنی چوتھی سمت، جو انگوٹھی والی انگلی نے بنائی تھی۔ اس نے میری آنکھ کی سطح تک، ایک انگوٹھی کھڑکی بنائی۔ پھر یہ سوال ایک جھانکنے والا روزن تھا یہ ایک آنکھ کا عدسہ تھا جو کہ ایک لڑکی کے لیے بہت چھوٹا تھا، جیسے کہ میں نے کھڑکی جیسا سمجھ لیا تھا۔ اس طرح کی کھڑکی، جس سے کہ ایک نقشے کا پورا ہی، سما جھانک سکتا تھا۔ چھوٹی انگلی (آنکھ کے عدسے کے حاشیے والی انگلی) کی کھڑکی اتنی سفید تھی کہ وہ ایک ہلکی سی روشنی دے رہی تھی۔ میں اسے اپنی آنکھ کے قریب لایا۔ میں نے دوسری آنکھ کو بند کر لیا۔

"ایک متحرک تصویروں کا تماشا" بازو نے کہا "اور تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میرا نیم گرم تاریک کمرہ۔ اس کی پانچ دیواریں۔ اپنا تخم وصل کرنے سے پہلے میں بیٹھ رہا تھا "نہیں نہیں۔"

"میں اسے دیکھ رہا ہوں۔"

"اور تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یہ غائب ہو گیا ہے۔"

"اور تم نے کیا دیکھنا تھا؟"

"ایک رنگ۔ ایک پھیلتا ہوا ارغوانی رنگ، اور اس کے اندر چھوٹے دائرے سرخ اور سونے کے سکے تھے جو کہ گھومے جا رہے تھے، گھومے جا رہے تھے۔

"تم تھک گئے ہو۔" لڑکی کے بازو نے میرا دایاں بازو نیچے رکھ دیا اور اس کی انگلیوں نے نرمی سے میرے پپوٹوں کو تھپکا۔

"یہ سرخ اور سونے کے سکے ایک بہت بڑے دندانے دار پہیے کے گرد گھوم رہے تھے۔ کیا میں نے دندانے دار پہیے میں کچھ دیکھا تھا؟ جو کہ آ اور جا رہا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے اصل میں وہاں کچھ دیکھا تھا یا مجھے ایسا لگا تھا۔ ایک تیزی سے

گزرتا ہوا سراب جو کہ یادداشت میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں یاد نہیں کر سکتا کہ وہ کیا ہو سکتا تھا

"کیا یہ ایک سراب تھا جو تم مجھے دکھانا چاہتے تھے؟"

"نہیں، میں اسے مٹانے کے لیے آیا تھا۔"

"گزرے دنوں کے بارے میں، خواہشات اور تمنا کے بارے میں۔"

میرے ہونٹوں پر لڑکی کی انگلیوں کی حرکت رک گئی۔

میں نے ایک غیر متوقع سوال کیا "جب تم اپنے بالوں کو کھلا چھوڑتی ہو تو کیا یہ کندھوں کو احساس دیتے ہیں؟"

یہ ہوتا ہے۔ میں انہیں گرم پانی سے دھوتی ہوں (ہو سکتا ہے یہ میری کوئی چال ہو) میں ان کے اوپر صندل پانی ڈالتی ہوں۔ میں اپنے کندھوں، بازوؤں اور چھاتیوں پر بھی ٹھنڈے بالوں کے احساس کو پسند کرتی ہوں۔

یہ اب دوبارہ ایک لڑکی جیسی ہو گئی۔ اس کی چھاتیوں کو ابھی تک کسی مرد نے نہیں چھوا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنی چھاتیوں پر گیلے بالوں کی ٹھنڈک کے احساس کو بیان کرنے میں وہ مشکل محسوس کر رہی ہوگی۔ جسم سے علاحدہ ہونے والا بازو کیا حیا اور حجاب سے بھی جدا ہو چکا ہوگا؟

میں نے چپکے سے کندھے کی نرم گولائی کو اپنے بائیں ہاتھ میں لیا، جو اب میرا اپنا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ میں موجود اس کی گولائی ابھی اس کی چھاتیوں سے زیادہ بڑی تھی۔ اس کے کندھے کی گولائی، اس کی چھاتیوں کی نرم گولائی کی طرح تھی۔

اس کا ہاتھ نرمی سے میرے ہونٹوں پر ٹکا رہا۔ ہاتھ اور انگلیاں نرمی سے چھٹی اور دھنسی ہوئی تھیں اور ہونٹوں کے اندر نرماہٹ کا اثر ہو رہا تھا۔ یہ نرماہٹ میری آنکھوں میں اتر آئی۔

"اب خون رواں ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا "یہ رواں ہے۔"

یہ تو انی وانی چیخ نہیں تھی، جب مجھے احساس ہوا کہ میرا بازو، اس کے بازو میں تبدیل ہو گیا ہے تو جو چیخ میرے منہ سے نکلی تھی، وہ تو انی وانی نہیں تھی، میرے کندھے یا لڑکی کے بازو میں کوئی خلش یا تھرتھری نہیں تھی۔ بازو میں میرا خون اور اس کا خون، کب چلنا شروع ہوا؟ کندھے کا ٹوٹا ہوا ہونا، کب ختم ہوا؟ میں اس لمحے لڑکی کا صاف خون مجھ میں رواں تھا، لیکن کیا جب یہ بازو لڑکی کی طرف لوٹے گا تو کیا یہ ناخوش گوار احساس نہ ہوگا یعنی گندا مردانہ خون اس میں رواں ہوگا؟ جب یہ اس لڑکی کے

کندھے سے نہیں جڑے گا تو تب کیا ہوگا؟

"یہ یہ دھوکا نہیں ہوگا" میں بڑبڑایا

"سب کچھ ٹھیک رہے گا" رازو نے سرگوشی کی

یہ کوئی ناممکن آگاہی نہیں تھی کہ میرے کندھے اور رازو کے درمیان خون بہہ رہا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ میرے بائیں کندھے سے مکمل طور پر ہو رہا تھا اور میرے کندھے نے جو کہ اب خود میرا اپنا تھا حقیقت سے فطری سمجھوتہ کر لیا تھا۔ انھوں نے اس چیز کو سمجھ لیا تھا۔ اس عمل نے انھیں خنودگی میں مبتلا کر دیا۔

میں ایک بڑی لہر پر تیرنے لگا۔ یہ لمحے نے وہاں موجود تھی، جو ہلکے ارغوانی رنگ میں تبدیل ہو گئی تھی اور جہاں میں کھڑا تھا اس بڑی لہر پر تیر رہا تھا، وہاں کی لہریں بجھ چکی تھیں۔ میرے کمرے کی گیلی تنہائی ختم ہو چکی تھی۔ میرا دایاں ہاتھ کلائی کے بائیں بازو پر آہستہ سے پڑا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کی انگلیوں نے میکھیا کے زرد ریشے کو پکڑ رکھا ہو۔ میں انھیں چھو نہیں سکتا تھا لیکن میں انھیں سونگھ سکتا تھا۔

☆☆☆☆

یوکیوشی ما

حب الوطنی

28 فروری 1936ء (تقریباً سے 26 فروری کے تیسرے دن) نومورا چورٹ بریگیڈ کے لیفٹیننٹ شنجی تاکیدا نے اس طریقے سے بہت زیادہ پریشان ہونا شروع کیا کہ اس کے بہت سے قریبی ساتھی جو اس کے ساتھ تھے باغیوں کے ساتھ تھے اور شاہی فوجوں کی ناگزیر پیش قدمی پر بہت طیش میں تھے شاہی فوجوں پر حملہ آور ہو گئے تھے اپنی افسروں والی تلوار سے ہتھیار دار میں آویزاں شاہ کے بلاک چھ میں واقع اپنی پرائیویٹ رہائش گاہ کے آٹھ چٹائیوں والے کمرے میں اپنے پیٹ کی آنتیں نکال دیں۔ اس کی بیوی ریکو نے اس کی تقلید میں خود کو خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔ لیفٹیننٹ کی آخری تحریر صرف ایک جملے پر مشتمل تھی "شاہی فوجوں کی جیت ہو۔" اس کی بیوی نے اپنے مرحوم والد سے اپنی ناخلفی کی معافی مانگتے ہوئے اختتامی کلمات کہے "وہ دن جسے ایک سپاہی کی بیوی کی زندگی میں آنا تھا، آ گیا ہے۔" ایسی دلیرانہ روش کرنے والے جوڑے کے آخری لمحات ایسے تھے کہ جنھوں نے خود دیوتاؤں کو بھی رشک میں مبتلا رکھا جائے کہ لیفٹیننٹ کی عمر اکتیس سال اور اس کی بیوی کی عمر تیئس سال تھی اور ایسا ان کی شادی کی تقریب کے صرف ایک سال بعد ہوا تھا۔

وہ جنھوں نے، یادگاری تصویر میں دولہا اور دلہن کو دیکھا تھا (شاید ان سے کسی طرح بھی کم نہیں جنھوں نے بذات خود لیفٹیننٹ کی شادی میں شرکت کی تھی) انھوں نے اس خوب صورت جوڑے کی نسبت کو دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا تھا۔ لیفٹیننٹ اپنی فوجی یونی فارم میں اپنی دلہن کے ساتھ اس کے محافظ کے طور پر کھڑا تھا۔ اس نے بائیاں ہاتھ اپنی تلوار پر رکھا ہوا تھا اور سرکاری کیپ کو اس نے بائیں طرف پکڑا ہوا تھا۔ اس کے خاوند میں سنجیدگی تھی اور اس کی کان بھنویں اور گھورتی ہوئی آنکھیں اس کی نوجوانی کی رسمی بازی کی غماز تھیں۔ سفید پوشاک پہنے ہوئے دلہن کی خوب صورتی کا کوئی موازنہ کسی سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بند پلکوں کے نیچے کھلی ہوئی، اس کی باریک مگر دشت بہت والی ناک اور اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر شہوانیت اور لطافت ایک ساتھ موجود تھی۔ جو ہاتھ بوکے کے پیچھے

تھا اس میں، اس نے ایک پنکھا پکڑا ہوا تھا اور اس کی انگلیوں کے سرے چاند کی کلی کی طرح کا ایک نازک گچھا لگ رہے تھے۔

خوشی کے بعد لوگ اس تصویر کو سامنے رکھ کر تجزیہ کرتے تو اس چیز کی وضاحت ہوتی کہ اس بے عیب ملاپ میں نیا دولہا ایک بدنما داغ کا نشان دکھائی دیتا ہے۔ شاید یہ ایک معمولی تاثر ہی تھا لیکن اس حادثے کے بعد اس تصویر کو دیکھ کر یہی معلوم ہوتا تھا جیسے کہ دو نوجوان لوگ سونے جیسی پاکیزگی والی سکرین پر ایک دوسرے کو نہایت واضح انداز میں اس موت کے حوالے سے، جو انھیں پیش آنے والی تھی، دیکھ رہے تھے۔ لیفسیت جان اوری کا بھلا ہو کہ اس کی وساطت سے وہ تیسویں میں گاؤں کے مقام پر ایک نیا گھر بنانے کے قابل ہو گئے تھے۔ اسے نیا گھر کہنا شاید مناسب نہ ہوگا۔ یہ کرائے کا تین کمروں پر مشتمل گھر تھا، جس کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ جب کہ بیتو چھ چارپائیوں اور نہ ہی ساڑھے چار چارپائیوں والے (لمبائی چوڑائی) نچلی منزل کے کمرے میں سورج کی روشنی آتی تھی اس لیے وہ اوپر والی منزل کے آٹھ چارپائیوں والے کمرے کو باتھ روم اور مہمانوں کے کمرے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان کے پاس کوئی نوکرانی نہیں تھی، اس لیے ریلو اپنے شوہر کی غیر حاضری میں، خود ہی گھر کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی۔

وہ اس بیاہ پر بھی موسم خراب ہی رہے تھے کہ یہ فوجی حلقے پر ایمرجنسی کے دن تھے۔ ان دونوں نے اپنی شادی کی پہلی رات اسی گھر میں بسر کی تھی۔ بستر پر جانے سے پہلے، شنی نے اپنی تلوار اپنے سامنے رکھتے ہوئے فرش پر سیدھا بیٹھ کر اپنی بیوی کو ایک سپاہی والا لیکچر دیا تھا۔ ایک عورت، جو ایک سپاہی کی بیوی بن گئی ہو، اسے سمجھنا چاہیے اور اسے ثابت قدمی سے قبول کر لینا چاہیے کہ اس کے شوہر کی موت کسی وقت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ یہ کل آ سکتی ہے۔ یہ اس سے اگلے دن آ سکتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ کب آئے گی۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ مستقل مزاجی کے ساتھ ثابت قدم رہے گی؟ ریلو نے کھڑی ہوئی اس نے الماری کا ایک دراز کھولا اور اس نے اسے نکالا، جو اس کی ملکیت میں آنے والی ساری چیزوں سے زیادہ قیمتی تھا یعنی اس کی ماں کا دیا ہوا خنجر۔ اپنی جگہ پر واپس جاتے ہوئے اس نے کوئی لفظ کہے بغیر خنجر کو چارپائی پر یوں رکھ دیا جیسے اس کے شوہر نے اپنی تلوار رکھی تھی۔ فوری طور پر ایک خاموش رضامندی ظاہر ہو گئی اور لیفسیت نے دوبارہ کبھی اپنی بیوی کی ثابت قدمی کا امتحان نہیں لیا۔

شادی کے پہلے چند مہینوں میں ریلو کی خوب صورتی دن بدن بارش کے بعد چاند کی طرح

زیادہ خاموش، چمکدار اور روشن اندازِ نظر سے بھی۔ چونکہ دونوں کے جسم جوان اور قوی تھے اس لیے ان کے تعلقات میں جوش تھا۔ یہ محض رات کا مسئلہ نہیں تھا۔ ایک سے زیادہ مواقع پر، جنسی مشقوں سے واپسی پر، اور سست، دل نہ لگا رہا ہو تو پھر بھی اتنے وقت میں، جتنے میں کیچڑ کے چھینٹوں سے گندی ہوئی یونی فارم کو اتار جائے، لیفٹیننٹ گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی بیوی کو فرش پر دھکیل دیتا۔ ریلو بھی جواباً بالکل اسی طرح پرجوش تھی۔ ایک مہینے سے کچھ کم یا زیادہ وقت میں ریلو اپنی شادی کی پہلی رات کے بعد سے خوشی کو سمجھتی تھی اور لیفٹیننٹ بھی یہ سب محسوس کر کے بہت خوش تھا۔

ریلو کا جسم سفید اور بے داغ تھا۔ اس کی خوب بھری بھری چھاتیاں اپنے اندر ایک مستحکم حیا والا انکار لیے ہوئے تھیں لیکن اپنی مرضی پر جوش دعوت دیتے ہوئے یہ چھاتیاں اپنے محرموں کے لیے بہت فراخ دل ثابت ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ بستر میں وہ دونوں تعجب اور رعب کے ساتھ بہت سنجیدہ ہوتے تھے۔ اپنے وقتی وقار کو وہ جذبات کے عین درمیان وہ سنجیدہ اور متین رہتے تھے۔ ان کے اختتام تک تربیت کے وقفوں کے درمیان مختصر عرصے کے لیے آرام کرتے ہوئے لیفٹیننٹ اپنی بیوی کے متعلق سوچتا رہتا تھا اور سارا دن گھر پر ریلو اپنے شوہر کے تصورات میں کھوئی رہتی۔ تاہم جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے تو وہ اپنی خوشی کی ارزیابی و تصدیق کرتے ہوئے اپنی شادی والی تصویر کو دیکھا کرتے تھے۔ ریلو کو اس بات پر رشک آتا تھی نہ ہی تھی کہ ایک شخص جو صرف چند ماہ پہلے تک اس کے لیے مکمل طور پر ایک اجنبی تھا وہ اب ایک ایسا سورج تھا جس کے گرد اس کی ساری دنیا گھوم رہی تھی۔

ان ساری باتوں کا ایک اخلاقی جواز تھا اس کو تعلیم دیے گئے سرکاری حکم نامے کے مطابق میاں اور بیوی کو ہم آہنگ ہونا چاہیے تھا۔ ایک بار بھی ریلو نے اپنے خاوند سے اختلاف نہیں کیا اور نہ ہی لیفٹیننٹ نے کبھی اپنی بیوی کو گالی دینا مناسب سمجھا۔ نیم حیوں کے نیچے خدا کی عبادت والی جگہ پر، عظیم جنس کے مرد سے حاصل ہونے والی خوشی کے جلو میں، ان کے شاہی فرمان روا اور ان کی تصاویر رکھی گئی تھیں اور ان پر جانے سے پہلے صبح لیفٹیننٹ حسب معمول اپنی بیوی کے ساتھ اس مقدس جگہ پر کھڑا ہوتا اور گھٹنے ان کے سر نیچے جھک جاتے تھے۔ نذر والا پانی ہر صبح تازہ کیا جاتا اور ساسانی کی مقدس شاخ ہمیشہ سبز رہتی تھی۔ ان کی زندگیاں مقدس دیناؤں کی طلسمی حفاظت میں تھیں اور ارحد خوشی سے معمور تھیں جو ان کے جسموں کے ہر ریشے کو تھرتھرائے رکھتی تھیں۔

گرچہ لارا پر بیوی میل سیٹو کا گھر ان کی بستی میں تھا لیکن 26 فروری کی صبح کو کسی نے بھی

کوئی چلنے کی آواز نہیں سنی۔ برف باری والی صبح کے وقت فوجی ملاحظے کی بگل بجنے کی ہلکی سی آواز تھی۔ یہ اس منٹ پر بجنے والی پہلی ہی تھی جس نے کہ لیفٹیننٹ کی نیند میں پہلے ہی خلل ڈال دیا تھا۔ فوراً اپنے بستر سے باہر ہوتے ہوئے اور کچھ کہے بغیر لیفٹیننٹ نے اپنی یونی فارم، جو اس کی بیوی نے پہلے ہی تیار کر رکھی تھی، پہن کر اپنے پہلو میں تلوار لٹکائی اور اس صبح کو جب کہ ابھی اندھیرا ہی تھا برف سے ڈھکے راستوں پر تیزی سے گامزن ہو گیا۔ وہ اٹھائیس کی شام تک واپس نہ آیا۔

بعد میں ریڈیو کی خبروں کے ذریعے ریکو کو اس اچانک ابھر آنے والے تشدد کی تمام تفاصیل سے آگاہی ہوئی تھی۔ اپنی زندگی کے ان بعد کے مسلسل دنوں کے دوران میں، وہ حمل کی سوجن کے ساتھ اپنے بند دروازوں کے پیچھے موجود رہی تھی۔

اس برف باری والی صبح کو، جب وہ خاموشی کے ساتھ تیزی سے باہر نکل رہا تھا تو ریکو نے لیفٹیننٹ کے چہرے پر مر جانے کے راستے کو پڑھ لیا تھا۔ اگر اس کا خاوند واپس نہ آیا تو اس کا اپنا فیصلہ یہی تھا کہ وہ بھی موت کو گلے لگا لے گی۔ اس نے خاموشی سے اپنی ذاتی اشیاء کو دوسرے سے علیحدہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے گھر سے وہ پہننے جانے والے کپڑوں کے جوڑے یادگار کے طور پر اپنے کنوں کے دوستوں کے لیے چن لیے۔ اس نے ان سخت جاپانی کاغذوں پر جن میں وہ ایک ایک کر کے رکھے گئے تھے پتا اور پتہ لکھ دیا۔ اس کے شوہر نے اسے یہ سمجھایا تھا کہ قتل کے بارے میں مت سوچو، ریکو نے کوئی ڈائری تک اپنے پاس نہیں رکھی تھی اور اب وہ پچھلے چند دنوں کی خوشی کے ساتھ ریکارڈ و مستقل مزاجی سے دوبارہ پڑھنے سے محروم تھی اور اس نے اس سلسلے میں اس کے ہر صفحے کو آگ کے سپرد کر دیا تھا۔ ریڈیو کے اوپر ایک چھوٹا سا چاقو تھا، ایک خرگوش، ایک گلدان، ایک بھالو اور ایک لومڑی قطار میں رکھے گئے تھے۔ وہاں ایک چھوٹا گلدان اور ایک پانی والا گھڑا بھی تھا۔ یہ ریکو کی ایک اور واحد کلیکشن تھی۔ لیکن وہ ان ساری چیزوں کو یہ مشکل ہی یادگار کے طور پر تصور کر سکتی تھی۔ اور نہ ہی بعد میں یہ مناسب ہوگا کہ ان کو خاص طور پر تابوت میں رکھا جائے۔ ریکو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایسے خیالات اس کے ذہن میں یوں بھر رہے ہیں، جیسے ان چھوٹے جانوروں کے چہروں سے، یہ تاثرات غائب اور فراموش کر دیے گئے ہوں۔

ریکو نے گلدان کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی طرف دیکھا۔ اور تب اس کے خیالات بچوں کے سامان سے بھرے پڑے موجود ایک سلطنت کی طرف مڑ گئے۔ اس نے ایک عظیم سورج جیسے اصول

کے تحت وادی میں جھونکا جسے اس کے شوہر نے جنم دیا تھا وہ تیار تھی اور خوش تھی اور اس چھت دار رتھ میں اپنی تباہی کے سنگ کھینچی گئی تھی، لیکن اب تنہائی کے ان چند لمحات میں، اس نے خود کو معمولی چیزوں کے ساتھ معصوم تعلق کے حوالے سے جشن پر آمادہ ہونے دیا۔ وہ وقت جب وہ ان اشیاء سے بھرپور محبت کرتی تھی، ایک قصہ پارینہ تھا۔ اب وہ محض ان سے محبت کرنے کی یاد سے محبت کرتی تھی اور اس کے دل میں ان کی جگہ ایک نیا وجود خوشی کے ساتھ، ایک بہت زیادہ جذبے کے ساتھ بھر گئی تھی۔ ریلو نے حتیٰ کہ اپنے بے صرف جسمانی خوشی جیسے غم انگیز لطف کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا۔ فروری کی ٹھنڈ اور چینی کی بنی ہوئی گلہری نے ریلو کی پتلی انگلیوں میں سن کر دیا تھا تاکہ اس کے اعضائے مخفی میں نمونے کی وجہ کی اسلوب کے نیچے جو کہ بے ہنگے انداز کے ہلکے پن کے کنارے سے ترچھی ہو کر گزرتی تھی۔ اب وہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے لیفسیت کے طاقتور بازوؤں کا خیال کر کے اس کے گرم نم آلود جسم کو محسوس کر سکتی تھی جو اسے برفوں کی سردی سے بچا سکتا تھا۔

وہ اپنے ذہن میں منڈلاتی موت کے تصور سے بہت کم ہی خوف زدہ تھی۔ ریلو پورا یقین تھا کہ جو چیز جوس کا شوہر محسوس کر رہا تھا، یا سوچ رہا تھا یعنی اس کی تکلیف اور اکتاہٹ یقینی طور پر اس کے جسم کی طاقت ہی کی طرح تھا اسے اس کی موت کو خوش آمدید کہنے کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا جسم آرام سے پگھل جائے گا اور اس کے شوہر کے نہایت معمولی سے جسم میں تبدیل ہو جائے گا۔

ریڈیو پر مختلف قسم کے اعلانات سنتے ہوئے، اس نے اپنے شوہر کے بہت سے ہم کاروں کے نام باقیوں کے طور پر سنے۔ یہ موت ہی تھی۔ وہ تنہائی اور پریشانی کے ساتھ ان ساری سرگرمیوں کا بہت غور سے جائزہ لے رہی تھی کیوں کہ حالات روز بروز ناقابل تردید ہو رہے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ کیوں ایک شاہی فرمان جاری نہیں کیا گیا اور کیوں پہلے ہی سے اس چیز کو نہیں دیکھا گیا اور بغاوت کے غیر معروف نام کی چھاپ کے ساتھ، جب آہستہ آہستہ بگلی وقار کو داؤ پر لگایا جا رہا تھا تو اس کی بجائی کے بے وقت قدموں کو کیوں نہیں روکا گیا۔ رجمنٹ کی طرف سے کوئی پیغام رسانی نہیں ہو رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یہ محسوس ہوتا تھا کہ شہر کی ان گلیوں میں جہاں ابھی برف کی باقیات موجود تھیں لڑائی چھڑ سکتی تھی۔

28 فروری کا سورج غروب ہوتے ہی، رکھوسا سامنے والے دروازے پر ایک درشت آواز سن

[illegible] پریشان ہوگئی۔ وہ پنجوں سے نیچے اتری اور اس نے ٹورچ کی انگلیوں کے ساتھ چھوئی۔ برف سے گلوہ کر کے تختے کی مدھم سی شکل ہلے خاکے کے پار کوئی آواز نہیں تھی، لیکن وہ جانتی تھی یہ اس کا شوہر تھا۔ ریلو نہیں معلوم تھا کہ اس کا ایڈیٹ ڈور کی چٹخنی اتنی سخت ہوگئی۔ رکاوٹ اور بڑھ گئی تھی۔ دروازہ نہیں کھلا۔

ایک لمحے میں، اس سے پہلے کہ وہ جان لیتی، وہ کامیاب ہوگئی۔ پورچ کے اندر سیمنٹ کے فرش پر ایک خاکی رنگ کا وہ روٹ پہنے ہوئے اس کے سامنے لیفٹیننٹ کھڑا تھا اور اس کے لیے بوٹ گل کے کیچڑ سے بھاری ہو رہے تھے۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے دوبارہ کنڈی لگا دی۔ اس کی کیا اہمیت تھی، ریکو نہ سمجھ سکی۔

"خوش آمدید۔"

گرچہ لیفٹیننٹ گومگو کی حالت میں تھا، لیکن پہلے ہی سے اس کے ذہن میں پس و پیش کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم اس کے درمیان خاموشی سے بہتی ندی تھی جو کہ پچھلے والی شفاف برف کی طرح ہی شفاف تھی۔ دو دن کی طویل آزمائش کے بعد، وہ اپنے گھر میں بیٹھا تھا اور اپنی بیوی کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار لیفٹیننٹ اپنی سکون محسوس کر رہا تھا گو کہ اس نے چھوٹی کہا تھا لیکن ایک بار اسے پتہ چلا تھا کہ اس کی بیوی اس کے پختہ ارادے کو، جو اس کے الفاظ کے پیچھے چھپا ہوا تھا، مقدس جانتی تھی۔

"اچھا تو اب ـــــ" لیفٹیننٹ کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔ اس کی تھکن کے باوجود، وہ طاقتور اور واضح تھیں اور اب وہ پہلی بار سیدھا اپنی بیوی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "آج کی رات میں اپنا پیٹ پھاڑ دوں گا۔"

ریکو نے نگاہیں نہیں ہٹائیں۔

اس کی گول آنکھوں میں ایک جیسی جھنجھلاہٹ اور الجھن دکھائی دیتی تھی۔

"میں تیار ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں تمہارا ساتھ دینے کی اجازت چاہتی ہوں۔"

لیفٹیننٹ نے خود کو ان آنکھوں کی طاقت سے مسحور ہوتے ہوئے پایا۔

ایک شخص جو نشے کی حالت میں ہو، اس کے کہے ہوئے کی طرح آسانی اور تیزی سے، اس کے الفاظ بہہ رہے تھے اور یہ بات سمجھ سے باہر تھی کہ کوئی ایسا معاملہ جو بہت گراں ہو اس کی اجازت

بالکل ایک عام سے انداز میں کیسے دی جا سکتی ہے۔

"تو ٹھیک ہے۔ ہم دونوں اکٹھے جائیں گے۔ لیکن پہلے میں اپنی خودکشی کے لیے تمھاری گواہی چاہتا ہوں۔ تمھیں اتفاق ہے۔"

جب وہ یہ کہہ چکے تو اچانک ایک بے اندازہ خوشی ان دونوں کے دلوں میں بھر گئی۔

اس کی ذات میں اعتماد کرنے پر ریکو اپنے شوہر کی عظمت سے بے حد متاثر ہوئی۔ کچھ بھی ہو جائے رعیت کے لیے ضروری تھا کہ اس کی موت میں کوئی بے قاعدگی نہیں ہونی چاہیے۔ اسی لیے ایک گواہی کی ضرورت تھی۔ اس نے اس کام کے لیے اپنی بیوی کا چناؤ کیا تھا یہ اس کے اعتماد کا پہلا اظہار تھا۔ دوسرا اظہار جو کہ اور بھی عظیم تھا، وہ یہ تھا کہ اگرچہ اس نے اکٹھے مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی خود کو پہلے مار لے۔ وہ اس کی موت کو اس وقت تک کے لیے التوا میں رکھنا چاہتا تھا جب تک کہ وہ خود اس کی تصدیق کرنے کے لیے موجود نہ ہو۔ اگر وہ ایک عملی مزاج شوہر ہوتا تو اس نے عام خودکشی کے معاہدے کے تحت اپنی بیوی کو پہلے مارنے کے لیے چنا ہوتا۔

جب ریکو نے کہا "میں تمھارا ساتھ دینے کے لیے اجازت چاہتی ہوں۔" تو لیفٹیننٹ نے محسوس کیا کہ یہ اس تعلیم کا حتمی ثمر تھا، جو اس نے اپنی شادی کی پہلی رات سے ہی اپنی بیوی کو دی تھی اور جب وہ لمحہ آیا تو اس کی وجہ سے، اس کی یہ تعلیم ہوئی کہ وہ کسی تعجب کے شائبے کے بغیر یہ کہہ سکے۔ اس بات نے رعیت کو اپنی ذات پر انحصار کرنے والے شخص کے طور پر، اس کی رائے پختگی دی تھی۔ وہ اتنا روحانی اور خود بین شخص نہیں تھا کہ وہ تصور کرے کہ اس کی طرف سے فوری طور پر ادا کیے جانے والے الفاظ اس کے شوہر کے لیے محبت کا اظہار تھے۔

اپنے دلوں میں بہت زیادہ خوشی محسوس کرتے ہوئے، وہ ایک دوسرے کے لیے مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ ریکو نے محسوس کیا جیسے وہ اپنی شادی والی رات کی طرف لوٹ گئی ہو۔

اس کی آنکھوں کے سامنے نہ درد تھا نہ موت تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ وسیع دوری پر ایک آزاد اور لامحدود کھلے پن کو دیکھ رہی تھی۔

"پانی گرم نہیں ہے۔ کیا تم ابھی غسل کرو گے؟"

"ہاں، بالکل۔"

"اور کھانا۔"

عافیت اس طرح پر اتنے خوبصورت انداز میں کہے گئے تھے کہ لیفیسٹ ایک لمحے کے لیے یہ سوچنے کے قریب ہو گیا کہ یہ تجویز ایک ظرفی جھوٹ تھی

"میرا خیال ہے کہ ہمیں کھانا کھانے کی ضرورت نہیں ہوگی"

لیکن شاید تم تھوڑا سا ساسا کی گرم کر سکتی ہو۔

"جیسے تمھاری مرضی۔"

ریکو نے کھڑی ہوئی اور اس نے نہانے کے بعد پہننے والا فرن، کاؤں الماری میں سے نکالا۔ اس نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے شوہر کی توجہ کھلے ہوئے دراز کی طرف مبذول کی۔ لیفیسٹ اٹھا، الماری تک پہنچا اور اس کے اندر جھانکا۔ لفافوں کو اوپر کی ترتیب پر لکھے ہوئے ایک ایک لفظ اس نے پڑھا۔ وہاں وہ آنے والوں کے پتے تھے۔ اس لیے انداز سے کے حوالے سے لیفیسٹ کی طرف سے کسی دکھ کا اظہار نہیں تھا۔ اس کا دل نازکی سے بھر گیا تھا۔ اس شوہر کی طرح، جس کی نوجوان بیوی فخر کے ساتھ اپنی بچوں جیسی خریداری کو دکھا رہی ہو، لیفیسٹ نے محبت سے مغلوب ہو کر پیار کے ساتھ اپنی بیوی کو پیچھے سے اپنی آغوش میں لے لیا اور اس کی گردن پر بوسہ دیا۔

ریکو نے اپنی گردن پر لیفیسٹ کی تیز شدہ جلد کی کھردرہٹ کو محسوس کیا۔ محض اس دیا کی چیز ہونے سے زیادہ، ریکو کے جذبات اس کے لیے خود ہی ایک دنیا کی طرح تھے لیکن اس احساس کے ساتھ کہ اب یہ ہمیشہ کے لیے کھو جانے والی تھی، اس نے تمام تجربوں سے بہت آگے کی تاریکی پائی تھی۔ ہر لمحے کی ایک اپنی ہم طاقت تھی اور اس کے جسم کے ہر حصے میں جذبات پھوٹ سے بیدار ہو رہے تھے۔ پیچھے سے اپنے شوہر کے پیار کرنے کے مزے لوٹتے ہوئے ریکو نے خود کو بچوں کے بل اٹھایا اور اپنے پورے جسم میں اس کے طاقتور دباؤ کو آنے دیا۔

"سب سے پہلے غسل اور پھر اس کے بعد تھوڑا سا ساسا کی۔۔۔۔ بستر کو اوپر والی منزل پر لے جاؤ، کیا تم لے جا سکتی ہو؟"

لیفیسٹ نے یہ الفاظ اپنی بیوی کے کان میں کہے۔ ریکو نے خاموشی سے رضامندی ظاہر کی اور وہی کو تار پر سے پھینکتے ہوئے لیفیسٹ غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ پس منظر میں بہتے ہوئے پانی کے مدھم شور کے جھومتے ریکو نے رہائشی کمرے میں پڑی چارپائی کی اٹھنی کی طرف دھیان دیا اور سانس کو مزید کرنے کی تیاری کی۔ کاؤں، کمر بند اور چند ریشمی جامے لیے ہوئے، وہ یہ پوچھنے کے لیے

کہ پانی کیسا ہے؟ باتھ روم کی طرف بڑھی۔ بھاپ کے حلقہ دار بادل کے بیچ میں لیفیسٹ چوتڑ ہی مارے
میف شیو کر رہا تھا اور وہ اس کی طاقتور ریڑھ کی ہڈی کے پٹھوں کی حرکت کا کسی قدر ہی ادراک کر سکتی تھی جو اس
کے بازوؤں کی حرکت کے ساتھ موافقت کر رہے تھے

یہاں کسی خصوصی اہمیت کے لمحات کا اشارہ تک نہیں تھا۔ اپنے کاموں میں مصروف رہتے
ہوئے، ریلوگھر میں موجود سناٹے کو ہلکاتے ہوئے، سایہ نشوں کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ
کانپ نہیں رہے تھے حتیٰ کہ وہ معمول سے بھی زیادہ سکون اور پھرتی سے یہ سارا انتظام کر رہی تھی۔ یہ سچ
ہے کہ وقفے وقفے سے اس کے سینے کے اندر ایک عجیب طرح کی گہری چڑ بن تھی۔ دوری پر چمکتی ہوئی
آسمانی بجلی کی طرح اس کی شدت بہت زیادہ تھی اور پھر یہ اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر غائب بھی ہو جاتی
تھی۔ اس کے علاوہ معمول کے خلاف کوئی بات نہیں تھی۔

باتھ روم میں شیو کرتے ہوئے لیفیسٹ نے مجموعی طور پر، آخر کار پچھلے بے فیصلہ دنوں کی،
اپنے گرم جسم کی محسن سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا اور اس کے باوجود کہ آنے والی موت اس کے سر پر
کھڑی تھی، وہ خوش کر دینے والی آرزو سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی بیوی کے گھر میں چلنے پھرنے کی مدھم
آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس صحت مند جسم کی وہی خواہش، جو پچھلے دو دنوں سے دب سی گئی
تھی پھر عود کر آئی تھی۔

لیفیسٹ پر عیاں تھا کہ اس خوشی میں کوئی ناخالص پن نہیں تھا، جس کا تجربہ اسے موت کے
بارے میں پکار رہا کر لینے پر ہوا تھا۔ ہوش مندی کے واضح انداز میں تو بے شک نہیں، لیکن اس لمحے اس
دونوں نے بھانپ لیا تھا کہ وہ چار خوشیاں، جن کو وہ اپنے پرانے لمحات میں حاصل کرتے تھے، وہ
ایک بار پھر تقدس اور پارسائی کی محافظت میں تھیں اور وہ اخلاقیات، جن کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا، عمل
طور پر ان کے ریزہ ریزہ تھیں۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اور ان میں ایک قاتل کو موت کو
دریافت کرتے ہوئے انھوں نے ایک بار پھر خود کو فولادی دیواروں کے پیچھے محفوظ محسوس کیا، جن کو کوئی
تباہ نہیں کر سکتا تھا جو خوب صورتی اور سچائی کی غیر محدود شدت و زرد رنگت کے اطراف کے اندر موجود تھیں۔ اس
بے پناہ حسن و خوشی کے احساس اور جسم کی خواہشات کے درمیان کی تفاوت و موافقت کو محسوس کرتے
ہوئے بھی لیفیسٹ اس دونوں کو ایک ہی تیر کے دو حصے سمجھ رہا تھا۔ سیاہ ہوتے ہوئے دیواری آئینے
میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے، لیفیسٹ نے بہت احتیاط کے ساتھ شیو کی۔ یہ اس کی موت کا چہرہ ہو سکتا

تھا۔ وہاں پر ظاہر ہونے والے اثرات کا شاید ہی کبھی کسی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن شیو چہرہ ایک بار پھر نوجوانی کی روشنی میں اپنا ظاہر کر رہا تھا، اس سے شیشے کی سیاہی چمکنے لگی تھی حتیٰ کہ اس نے محسوس کیا کہ اس صحت مند چہرے کے ساتھ موت کی مصاحبت میں ایک یقینی خوش وضعی تھی۔

جیسا کہ وہ اس وقت دکھائی دے رہا تھا، یہ اس کی موت والا چہرہ بن جائے گا۔ حقیقت میں، یہ پہلے ہی لیفنیسٹ کے ذہنی تصرف سے آزاد نکل چکا تھا اور یہ ایک فوت شدہ ہستی کی یاد میں بدلنے کے مجسم بن رہا تھا۔ تجربے کے طور پر اس نے اپنی آنکھوں کو سختی کے ساتھ بند کر لیا۔ ہر چیز اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھی اور اب وہ ایک زندہ دیکھنے والی مخلوق نہیں تھا۔

وہ تھوڑا سا نکل کر آیا تو اس کے ہموار کالوں کے نیچے شیو کے مدھم سے نیلے نشانات نظر آ رہے تھے، وہ آگ سے خوب روشن ہوئی انگیٹھی کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اگرچہ ریکو اپنے کام کاج میں مصروف رہی تھی پھر بھی اس کے پاس اتنا وقت ضرور تھا کہ اس نے اپنے چہرے کو تھوڑا سا درست کر لیا تھا۔ اس کے کالے زیبا تھے اور اس کے ہونٹ سرخ تھے۔ وہاں غم کا کوئی سایہ تک نہیں تھا۔ لیفنیسٹ نے سچائی کے ساتھ اپنی نوجوان بیوی کی جذباتی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی بیوی کا انتخاب کیا تھا جیسا کہ اسے کرنا چاہیے تھا۔

جیسے ہی لیفنیسٹ نے اپنے سائی کپ کو بھرا، اس نے ریکو کو بھی پینے کی دعوت دی۔ ریکو نے اس سے پہلے سائی نہیں چکھی تھی لیکن اس نے اسے بغیر کسی تعجب کے قبول کیا اور ڈرتے ڈرتے اس کے گھونٹ بھرنے لگی۔

"اوہ!" لیفنیسٹ نے کہا۔

ریکو اپنے شوہر کی سمت میں مڑی اور جب وہ اس کی گود کی طرف پیچھے کو جھکی تو اسے لگتا یہ کہ اس کی چھاتیاں نہایت شدت سے تھرتھرائیں۔ غم، خوشی اور سائی کی طاقت نے آپس میں مدغم ہو کر اس کے اندر ہلچل مچا دی۔ لیفنیسٹ نے اپنی بیوی کے چہرے کی جانب دیکھا۔ یہ دنیا کا وہ واحد آخری چہرہ تھا جو وہ اب دیکھ رہا تھا، آخری چہرہ وہ دیکھے گا جو کہ اس کی بیوی کا ہوگا۔ لیفنیسٹ اس چہرے کو لمحاتی طور پر اپنی آنکھوں سے اس مسافر کی طرح دیکھ رہا تھا، جو شاندار مناظر کو الوداع کہہ رہا ہو اور جن کو وہ دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا۔ یہ وہ چہرہ تھا، جس کو دیکھتے ہوئے وہ تھک نہیں سکتا تھا، جس کے خدوخال درست تھے، ابھی ٹھنڈے نہیں ہوئے تھے، اس کے ہونٹ ایک نرمی قوت کے ساتھ سختی سے بند تھے

یفیمیٹ نے بغیر کسی سوچ کے ان ہونٹوں کو چوم لیا۔ اور اچانک حالات کے چہرے پر نظر آنے والی سسکیوں کی وجہ سے کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوا تھا، پھر بھی اس نے محسوس کیا کہ بند آنکھوں کی بھی پلکوں کے نیچے آہستگی سے آنسو لڑھک رہے ہیں اور ایک چمک دار نمی کی طرح چھلکنے لگے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد جب لیفیمیٹ نے اوپر والی منزل پر واقع بیڈروم میں جانے کی خواہش کی، اس کی بیوی نے کہا کہ وہ یہاں کر سکتی ہے لیکن نہانے کے بعد بیڈروم کی طرف جانے کے لیے اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، جہاں کی فضا پہلے ہی گیس ہیٹر کی وجہ سے گرم ہو چکی تھی، لیفیمیٹ بازوؤں اور ٹانگوں کو کھولتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ تاہم وہ وقت جب کہ وہ اپنی بیوی کا منتظر تھا کہ وہ اسے آ ملے، اس کا وقت معمول کے حساب سے بہت زیادہ تھا اور بہت ہی کم تھا۔ اس نے اپنے بازو اپنے سر کے نیچے رکھ لیے اور سٹینڈ والے لیمپ کی روشنی سے دور، نیم تاریک میں چھت کے سیاہ تختوں کی طرف دیکھا۔ یہ وہ موت تھی جس کا وہ انتظار کر رہا تھا؟ یا پھر یہ حواس کی خود ساختہ تھکن تھی؟ یہ دونوں ایک دوسرے کے اوپر آ رہے تھے ویسے ہی جیسے اس جسمانی خواہش کا مقصد بجائے خود موت ہو۔ لیکن تاہم یہ ممکن اور یقینی تھا کہ لیفیمیٹ نے اس سے پہلے ایسی آزادی کا مزہ نہیں چکھا تھا۔

باہر کھڑکی کے قریب ایک کار کی آواز آئی۔ وہ گلی میں تیز شدہ برف پر سے، اس کے ٹائروں کے پھسلنے اور چیخنے کی سن رہا تھا۔ ایوروں کے قریب سے اس کے بار بار کی بار بار آواز آئی۔ ان آوازوں کو سن کر اس کا تاثر یہ تھا کہ معمول کے مطابق، ماں اپنی بے چینی کے سمندر میں تنہا تیرے جیسے معاشرے کی طرح بھر گیا تھا۔ چاروں طرف وسیع طور پر صاف حالت میں سارا ملک موجود تھا جس کے لیے وہ غم زدہ تھا۔ وہ اس کے لیے اپنی جان دینے والا تھا۔ لیکن کیا یہ عظیم ملک، جس کی خاطر وہ اپنے آپ کو پیش کرنے جا رہا تھا، اس کی موت پر معمولی سی بھی توجہ دے گا؟ وہ نہیں جانتا تھا اور یہ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اس کا میدان جنگ عظمت والا نہیں تھا۔ یہ وہ میدان جنگ تھا جہاں کوئی اپنی شجاعت کے کارنامے دکھا سکتا تھا، یہ روح اگلا محاذ تھا۔

سیڑھیوں پر رکو کے قدموں کی آواز ابھری۔ اس پرانے گھر میں داخلوانی سیڑھیاں بہت آواز پیدا کرتی تھیں۔ اس آواز کے ساتھ کچھ اچھی یادیں بھی وابستہ تھیں اور بہت سے مواقع پر، بستر میں انتظار کرتے ہوئے لیفیمیٹ اس کی خوش آمدید کی آواز کو سنتا تھا۔ اس خیال پر کہ اب وہ اسے دوبارہ نہیں سن سکے گا، اس نے اس کو بہت زیادہ توجہ کے ساتھ سنا تاکہ اس قیمتی وقت کا ہر لمحہ سیڑھیوں کی نر

کرسی کے ساتھ پاؤں کی رگڑ کی آواز کو بھی سن سکتے۔ یہ لمحات اندر کی روشنی کے جگمگاتے موتیوں میں تبدیل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

ریکو نے اپنے یوکاتا کی کمر پر ہاتھ گیا کمر بند پکڑ رہا تھا لیکن جب لیفٹیننٹ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو روشنی کے مدھم ہونے کی بنا پر اس کی سرخی سنجیدہ ہو گئی۔ ریکو کا ہاتھ اس کی مدد کے لیے بڑھا اور کمر بند نیچے گر پڑا اور تیزی سے پھسلتا ہوا فرش پر آ گیا۔ جب کہ وہ اب بھی اپنے یوکاتا میں ملبوس اس کے سامنے کھڑی تھی۔ لیفٹیننٹ نے دونوں آستینوں کے اطراف میں موجود جھریوں میں اپنے ہاتھ ڈالے، وہ اسے گلے لگانا چاہتا تھا جب کہ اس (ریکو) کا ننگا مرمریں جسم، اس کی انگلیوں کے سروں کے لمس کے قریب تھا، اچانک اس کا سارا جسم بھڑک اٹھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ دونوں روشنی کے بیڈ کے سامنے ننگے لیٹے تھے۔

احساسات نے گفتگو نہیں کی صرف ان کے دل بولے، ان دونوں کے جسم اور ان کی آپس میں ٹکراتی چھاتیوں، اس آگاہی سے شعلہ زن ہو گئیں کہ یہ بالکل آخری وقت تھا۔ "آخری وقت" یہ الفاظ ان کے جسموں کے ساتھ پھنکارتے نظر آنے والے برش سٹروکس جیسے انداز میں نظر آتے تھے۔

لیفٹیننٹ نے اپنی بیوی کو قریب کیا اور پرجوش انداز میں اس کو چوما۔ جب ان کی زبانیں ایک دوسرے کے منہ میں گھومتے ہوئے ایک طلب کے ساتھ آگے بڑھیں تو انھیں محسوس ہوا جیسے موت کی ابھی تک نہ محسوس کی جا سکنے والی تکلیف نے، برف حد تک گرم سنسنی جیسی تھی، ان کے حواس کی معتدلی میں بدل دیا تھا۔ اس تکلیف نے، جسے انھوں نے ابھی تک محسوس نہیں کیا تھا یعنی فاصلے پر موجود موت کے ارادی تکلیف کو اس نے ان کی خوشی کی آگاہی کو بہت گہرا بنا دیا تھا۔

"یہ آخری بار ہوگا کہ میں تمھارے جسم کو دیکھوں گا" لیفٹیننٹ نے کہا "مجھے اس کو قریب سے دیکھنے دو۔" اس نے لیمپ سینڈ کی سائیڈ کو اس انداز میں جھکایا کہ روشنی کی کرنوں نے ریکو کے پھیلے ہوئے جسم کو پورے طور پر عیاں کر دیا۔

ریکو اپنی بند آنکھوں کے ساتھ ساکن پڑی تھی۔ لیمپ کا زاویہ بدلنے کی وجہ سے، اس کے سفید جسم کی شاہانہ شان و شوکت بالکل واضح ہو گئی تھی۔ ان فرصت کے لمحات میں لیفٹیننٹ نے اس کا قابل فراموش نظارہ کیا، اپنے ذہن پر مرتسم ہونے دیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے اس کے بالوں کو سہلایا اور دوسرے سے اس کے شاندار چہرے کو نرمی سے تھپکتے ہوئے، اس نے اسے یہاں وہاں،

جہاں تک اس کی آنکھوں کی پہنچ تھی، چوما۔

نیچے کی طرف جھکا ہوا رکھنے والے، اس کے بند ماتھے کی خاموش ٹھنڈک، ملکے سے لرزش دیکار والا ہوا ہے ہوئے، اس کی بھنوؤں کے نیچے لمبی پلکوں کے ساتھ بند آنکھیں، اپنی وضع میں ایک جمال ناک، بھرے بھرے ہونٹوں کے درمیان چمک دار دانتوں کی جھلک، مرمریں اور ایک ننھی سی ٹھوڑی ... ساری چیز اس نے اور اس کے ساتھ، روشن ہونے والے چہرے کی جھلک نے، اس کو کمزور کر دیا تھا اور وہ ہوا رہے ہونٹوں کو ریلو کے سفید گلے پر رکھ رہا تھا، جہاں جلد ہی ریلو کا اپنا ہاتھ کرانے والا تھا اور اس کے بوسوں سے اس کا گلا ملکا سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے منہ کی طرف مڑتے ہوئے، اس نے اس پر اپنے ہونٹوں کا ملکا سا دباؤ ڈالا اور اس نے ریلو کے جسم پر ایک رحم کے ساتھ یوں حرکت دی، جیسے کسی چھوٹی کشتی کی گھومنے والی روشنی حرکت کرتی ہے۔ اس کے آنکھیں بند کرنے پر، اس نے اسے ایک حرکت کرتے ہوئے گھوڑے کی طرح نظر آ رہی تھی۔

جہاں کہیں لیفٹیننٹ کی آنکھیں حرکت کرتیں، وہاں وہاں اس کے ہونٹ ایمان داری سے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ تنی ہوئی بھری بھری چھاتیاں اور جنگلی چیتے کے شگوفوں جیسی ڈاڑھیاں، جن پر لیفٹیننٹ کے سب تھے وہ دن کی دھوپ سے سرخ ہو چکی تھیں۔ اس کے بازو کلائیوں کی ڈھلانوں کے ساتھ دونوں چھاتیوں کے طرف میں نہایت آہستگی سے نیچے کی طرف جاتے تھے، ابھی تک انھوں نے اپنا تناسب اور گولائی نہیں کھوئی تھی اور اس کے آخر میں وہ نازک انگلیاں تھیں، جنھوں نے شادی کی تقریب میں پگھلا تھا مرکھا تھا۔ ایک ایک کر کے لیفٹیننٹ نے انھیں چوما۔ انگلیوں نے شرم کے مارے اپنے آپ کو ڈھکا ہوا ... چھاتیوں اور پیٹ کے درمیان موجود قدرتی خالی جگہ اور پیٹ پر موجود لکیریں۔ صرف اس کی نرمی کو ظاہر کرتی تھیں بل کہ یہ اس کی طاقت کی بھی مظہر تھیں اور وہ اس کے بالوں کے آس پاس موجود اپنی شان و شوکت کو ظاہر کرتی تھیں۔ ان کے دکھنے میں ایک تعجب اور کچھ ڈھیلا پن تھا۔ پیٹ اور کولہوں کی سفیدی اور شان و شوکت ایسی تھی جیسے دودھ سے لبالب بھرا ہوا ایک بڑا پیالہ ہو، اور تیزی سے سایوں میں غوطہ زن ہوتی ہوئی ہلکی سی موسم پر گرنے والے بارش کے قطرے کی اثر پذیری جیسی تھی۔ جہاں سایے تیز ہو کر زیادہ گہرے ہو رہے تھے، بالوں کا نرم اور حساس جھنڈ تھا جہاں اضطراب بڑھ رہا تھا اور اب یہ کوئی مفعول جسم نہ تھا اس جسے میں کھلتے ہوئے شگوفے جیسی خوشبو کی آتش، جس کی اثر پذیری بتدریج بڑھ رہی تھی ایک مہک کی طرح منڈلا رہی تھی۔

آخر کار، ریکو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"مجھے دیکھ لو۔ آخری بار مجھے بھی دیکھ لو۔"

اس نے اس سے پہلے کبھی اپنی بیوی کے ہونٹوں سے اتنی مضبوط اور غیر مبہم درخواست نہیں سنی تھی۔ یہ ایک سچی چیز تھی، جسے اس کی حیا آخر تک چھپائے رکھنا چاہتی تھی لیکن اب یہ اچانک اپنے صبر کی تمام حدوں کو پھلانگ گئی تھی۔ لیصیت اپنی کمر کے بل لیٹا رہا اور اس نے بیوی کی بات مان لی۔ نازک انداز سے، اس نے اپنے سفید پڑتے ہوئے جسم کو اٹھایا (اور اپنے خاوند کی طرف مڑتے ہوئے اپنی معصوم بدخواہش کی تپش میں تھرتھراتے ہوئے جو کچھ کہ وہ اس کے لیے کر چکا تھا) اور اس نے اپنی سفید ہتھیلیاں لیصیت کی آنکھوں پر رکھیں، جو اسے مسلسل دیکھ رہی تھیں۔ اس نے انھیں آہستہ سے تھپک کر بند کیا۔ اچانک نازکیت سے مغلوب ہو کر، اس کے ہاں مدہوش کر دینے والے جذبات کے اندازے پر سرشار ہو گئے۔ ریکو نے لیصیت کا سر، جو بہت قریب سے سونگھا گیا تھا، پر اپنے بازو رکھے۔ کھڑکی والوں نے اس کی چھاتیوں سے مس ہو کر اسے تھوڑی سی تکلیف پہنچائی۔ اس کے جسم میں چبھی ہوئی اس کی مشہور ناک چندی تھی اور اس کا سانس گرم تھا۔ اپنی نقل کی میں سکون پیتے ہوئے، اس نے اپنے شوہر کے سر کا پیچھا کیا۔ کھردری جنتریں، بند آنکھیں، ناک کا شاں دار بانسہ، خوش وضع ہونٹ، جو تختی سے بھیچے ہوئے تھے، نیلے گلیں شیوکاں جو روشنی میں منعکس ہوتے تھے اور ریشمی سے چمک رہے تھے، ریکو نے انھیں چوما۔ ریکو نے گردن کی چوڑی گدی اور اٹھے ہوئے کندھوں، طاقتور چھاتی کے دائروں، جو ڈھال کی طرح تھے اور اس کی بھورے رنگ کی پیٹھ کو چوما۔ بغلوں میں، شانوں اور چھاتی کے شاہ گوشت کی سایہ دار گہرائی میں بالوں کی بڑھوتری سے ایک میٹھی اداس بو برآمد ہو رہی تھی اور اس بو کی مٹھاس بچے میں کسی حد تک، ایک نوجوان موت کا جوہر رکھتی تھی۔ لیصیت کے ننگے جسم کی جلد جو کے کھیت کی طرح چمک رہی تھی اور مڑے پٹھے ایک فوری سکون کا اظہار کر رہے تھے اور پیٹ کے پٹھے میں کسی غرور کے بغیر چھوٹی سی ناف کی طرف جھک رہے تھے۔ ایک مضبوط اور نوجوان پیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے جو گھٹنوں سے ڈھکا ہوا تھا، ریکو نے سوچا کہ جلد ہی اسے ظالمانہ طریقے سے تلوار کے ساتھ کاٹ دیا جائے گا اور اس نے اپنا سر اس پر رکھ دیا۔ اس نے ترنم کے انداز میں سسکیاں لیتے ہوئے اپنے بوسوں سے اسے نہلا دیا۔

لیصیت نے اپنے پیٹ پر اپنی بیوی کے آنسوؤں کے گرنے کو محسوس کرنے پر، خودکشی کی

خاموش تکلیف کو برداشت کرنے کے لیے خود کو تیار پایا۔

انھوں نے ان سرمستیوں کے تبادلے کے نتیجے میں کیسی سرمستیاں حاصل کی ہوں گی، ان کو تصور میں لایا جا سکتا ہے۔ لیفٹیننٹ نے اور اس نے ایک خاتون بغل گیری میں اپنی بیوی کے جسم کو موڑا اس کا جسم جوش کے غم اور آنسوؤں کے بعد تھک کر بے جان ہو رہا تھا۔ جذباتی انداز میں انھوں نے اپنے چہرے ایک دوسرے کے قریب کر لیے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے کان رگڑنے لگے۔ رکو کا جسم کانپ رہا تھا۔ ان کی چھاتیاں پسینے سے بھی چپکی ہوئی ایک دوسرے میں پیوست تھیں اور ان نوجوان اور خوب صورت جسموں کا ہر حصہ ایک دوسرے میں جذب ہو کر یوں ایک ہو گیا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب کبھی دوبارہ ان میں علاحدگی نہیں ہوگی۔ ریکو روپڑی۔ بلندیوں سے وہ عمیق گہرائیوں میں جا گرے اور گہرائیوں سے وہ پروں کے ذریعے ابھر کر زیادہ مدہوش کر دینے والی اونچائیوں تک پہنچے۔ لیفٹیننٹ اپنے رات بھر رحمت کا جھنڈا لہرا کر چلنے والے کی طرح ہانپنے لگا۔ ایک چکر کے ختم ہونے پر تقریباً فوراً ہی جذبے کی ایک لہر پیدا ہوئی اور وہ کٹھنے سی تھکن کے بعد اس چوٹی کو طے کریں گے۔

آخر کار لیفٹیننٹ پر سے ہوا تو اس کی وجہ اس کی تھکن نہیں تھی۔ اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ اسے پریشانی تھی کہ جنسی مزدوری قوت کی بہتات اسے خوشی کے لیے درکار تھی وہ اس کو کم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی وہ یہ کہ نفس پرستی کی وجہ سے وہ اپنی آخری یادوں کی مٹھاس کو مسخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جب لیفٹیننٹ نے واضح طور پر اپنے عمل سے پرہیز کیا تو رکو نے بھی، جو عمومی طور پر تابع داری کرتی تھی، اس کی مثال پر عمل کیا۔ وہ دونوں کمر کے بل لیٹے ہوئے تھے اور ان کی انگلیاں آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔ کمرہ پسینے کی وجہ سے گرم تھا اور اتنی کہ جب ان کا پسینہ ان کے جسموں سے برآمد ہونا بند بھی ہو گیا تو تب بھی انھوں نے سرد محسوس نہیں کیا۔ باہر اس خاموش رات میں گزرتی ٹریفک کی آواز مفقود تھی حتیٰ کہ یتیم خانے کے سرد راستوں پر چلتی کاروں اور ٹرکوں کا شور اتنی دور تک اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ہوٹل کے ملاقاتی کی بازگشت کی اثر اندازی کے بعد وہ آٹھ کا چیس کے سامنے بڑی شاہراہ کا سامنے کرنے والے گھنے درختوں والے پارک میں گم ہو رہے تھے۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس مقام پر، جسے کہ ایک بادل نے گھیر رکھا تھا، یہاں آپس میں شدید طور پر شاہی فوجوں کے دو دھڑے جنگ پر آمادہ تھے۔

وہ اپنے باطن کی سرمستی خوشبو کے جلو میں لیٹے ہوئے ابھی تھوڑی دیر پہلے کی سرمستی کو یاد کر

رہے تھے۔ اس تجربے کے ہر لمحے کو انھوں نے دوبارہ سے بسر کیا تھا۔ انھوں نے بوسوں کے اس ذائقے کو دیا، جس میں کوئی تحسین نہیں تھی اور انھوں نے اپنے برہنہ جسموں کے ملاپ اور مدہوش کر دینے والی پے در پے خوشی کو بھی محسوس کیا۔ لیکن پہلے ہی سے محبت کے سیاہ تختوں میں سے موت کا چہرہ جھانک رہا تھا۔ یہ مسرت حتمی تھی۔ وہاں کے جسم اس کو دوبارہ نہ پا سکیں گے۔ اس شدت کی خوشی (اور یہ ایک جیسا خیال ان کو ایک ساتھ آیا تھا) وہ روحیں سننے والی نہیں تھی، چاہے وہ اپنے بدن پر ہی کیوں نہ چھو لیں۔

ان کی انگلیوں کا آپس میں الجھنا بھی، جلد ہی گم ہو جانے والا تھا۔ محبت کے سیاہ ہوتے ہوئے تختوں پر جو نمونے بنے ہوئے تھے اب انھیں ان کو دوبارہ نہیں دیکھنا تھا۔ وہ موت کو اپنی طرف سرکتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔ وہ دونوں کے اوپر ایک آنے جا رہی تھی۔ اب کوئی جھجک نہیں رہ گئی تھی۔ ان کو آگے بڑھ کر موت کو گلے لگانے کے لیے، اپنے آپ میں حوصلہ پیدا کرنا تھا اور اسے دبوچ لینا تھا۔

"تو ٹھیک ہے۔ اب ہمیں اپنی تیاری کرنی چاہیے۔" یفیمیت نے کہا۔

لفظوں میں ارادے کی پختگی کی کیفیت غلطی سے مبرا تھی۔ لیکن ساتھ ہی ریلوے پہلے کبھی بھی اپنے شوہر کی آواز کی گرمی اور مارک محسوس نہیں کی تھی۔ جب وہ اٹھ گئے تو بہت سے کام ان کے منتظر تھے۔

یفیمیت جس نے آج تک اس کی، ستر کی، چھانی کے ضمن میں کوئی مدد نہیں کی تھی، اب اس نے خوشی خوشی الماری کے دروازے کو بند کیا، اس نے کمرے میں بچھی ہوئی چھانی کو خود اٹھایا اور اس کے تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ ریلوے نے تیس بیڈ کو بند کیا اور ریپ کو بجھا دیا۔ یفیمیت کی نگرانی میں وہ احتیاط سے کمرے کی صفائی کرتی تھی، چیزوں کو جھاڑتی پونچھتی تھی تاکہ ایک تازہ صفائی محسوس کی جا سکے اور جب (اگر کوئی کمرے کے ایک کونے کی طرف سر کا دیے گئے روزہ ٹیبل کو نظر انداز کر دے تو) گھر چنانچہ وہ کمرہ ایک رسپوش روحانی طرح دکھائی دیتا تھا، جہاں کسی بہت ہی محترم مہمان کا انتظار کیا جا رہا ہو۔

"ہم نے یہاں سے خوشی دیکھی ہے، کیا نہیں؟ کانو، ہوما اور گوشی کے ساتھ۔"

"ہاں وہ سارے کے سارے بڑے اعلیٰ پائے کے مے نوش تھے۔"

"ہم جلد ہی ان سے دوسری دنیا میں ملنے والے ہیں۔ جب انھیں پتہ چلے گا کہ میں تمھیں اپنے ساتھ لایا ہوں تو وہ ہمیں چھینیں گے۔"

سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے لیفٹیننٹ نے مڑ کر خاموش اور صاف ستھرے کمرے کو دیکھا، جو اب چھت میں لگے لیمپ کی روشنی میں خوب چمک رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ان نوجوان افسروں کے چہرے تیر رہے تھے جنھوں نے کل یہاں شراب نوشی کی تھی، وہ یہیں بیٹھے تھے اور وہ اور معصومیت کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن وہ اسی کمرے میں پناہ لینے کا۔ سیڑھیوں کے نیچے والے دو کمروں میں شوہر اور بیوی نے خود کو یکسانی اور طمانیت کے ساتھ متوقع تیاری میں مصروف کر دیا۔ لیفٹیننٹ پہلے باتھ روم میں گیا اور پھر باتھ روم میں خود کو صاف کرنے کے لیے۔ اسی اثنا میں ریکو نے اپنے شوہر کا گندی وردی اتار کر اس کی یونی فارم والے چوغے کو ایک جگہ پر رکھا، اس کی پتلون، ایک بالکل نئے سیے ہوئے جانگیے کو باتھ روم میں رکھا اور رہائش کمرے کی میز پر وداعی کلمات لکھنے کے لیے کاغذ کی شیٹس کو رکھا۔ تب اس نے راشن بیگ کا اطمینان کیا اور اس نے روشنائی کو رگڑنا شروع کیا۔ اس نے اپنے نوٹ کے الفاظ کو پہلے ہی ذہن میں طے کر لیا تھا۔

ریکو نے روشنائی پر لکھے گئے الفاظ کو انگلیوں کی نوک سے دبایا اور یہ پوٹی اس دوات کی گہرائی میں پہنچتے ہی کالا سیاہ ہو گیا جیسے مٹی کا کالا سیاہ جال اس میں داخل ہو گیا ہو۔ اس نے یہ سوچنا بند کر دیا کہ وہ کیا جانے والا عمل، اس کی انگلیوں کا دبانا، یہ مدھم آواز کا اتار چڑھاؤ، یہ سب عمل طور پر موت کے لیے تھا۔ یہ معمول کا گھریلو کام تھا، یہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئے اس موت سے پہلے کا آخری کام ہونا چاہیے تھا۔ لیکن کسی حد تک پتھر پر قلم کے رگڑنے کی بڑھتی ہوئی ہموار رفتار میں اور کارکی ہوتی سیاہی کی بو میں ایک ناگفتہ انداز کا اندھیرا تھا۔ وہ صاف ستھری یونی فارم کے ساتھ، جو اب فوری طور پر لیفٹیننٹ نے اپنے جسم پر پہن لی تھی، باتھ روم سے باہر آیا۔ کوئی لفظ کہے بغیر وہ میز کے قریب بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے بالوں والا قلم اپنے ہاتھ میں لیا اور کوئی فیصلہ کیے بغیر، اس نے اپنے سامنے پڑے کاغذ کو گھورا۔

ریکو نے سفید سلک والا کمونو لیا اور باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ جب وہ سفید کمونو پہنے ہوئے چمکتے چہرے کے ساتھ رہائش کمرے میں آئی تو لیمپ کے نیچے میز پر ایک مکمل الوداعی نوٹ موجود تھا

یہ کالے موٹے موٹے قلم سے لکھے گئے سادہ الفاظ تھے

"شاہی افواج کی ہمدرد رہو آرمی لیفٹیننٹ نیکی، شجی"

جب ریلو پانا نوٹ درج کرنے کے لیے، اس کے سامنے بیٹھی تو لیفٹیننٹ نے خاموشی اور مجرمانہ سنجیدگی کے ساتھ اپنی بیوی کی زرد انگلیوں کے ضبط کو، جب وہ میز پر استعمال کر رہی تھیں، دیکھا۔ ان کے اپنے اپنے نوٹ ہاتھوں میں تھے۔ لیفٹیننٹ کی تلوار اس کے پہلو میں تسمہ بند تھی، ریکو کا چھوٹا سا خنجر اس کے سفید کوٹ کے پٹکے میں اڑسا ہوا تھا۔ وہ دونوں خدائی عبادت والی جگہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور انھوں نے خاموشی سے عبادت کی۔ جب انھوں نے پچھلی منزل کی ساری روشنیاں گل کر دیں۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو اس نے اپنا سر موڑا اور وہ اپنے پیچھے اوپر چڑھ کر آتی اپنی بیوی کے جسم پر موجود سفید لباس کی سرسراہٹ کی طرف متوجہ ہوا، جس کی نگاہیں نیچے کے اندھیرے میں جھکی ہوئی تھیں۔

اوپر والی منزل کے کمرے کے کونے میں، الوداعی نوٹ ساتھ ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آج یہاں اس لکھے ہوئے مسودے کو، جو لیفٹیننٹ جنرل اوری نے لکھا تھا، یہاں اپنا چاہیے تھا اور جو کہ صاف دو چینی خصوصیات کو ظاہر کرتا تھا، انھوں نے اسے جہاں وہ موجود تھا، وہیں رہنے دیا۔ حالاں کہ اس نے وہاں پرخوں کے چھینٹوں سے داغ دار ہو جانا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ نیت چال سمجھا جائے گا۔

سیدھے بیٹھے ہوئے لیفٹیننٹ نے، جس نے کمر جھکے کے پچھلے حصے سے لگا رکھی تھی، اپنی تلوار اپنے سامنے فرش پر رکھ دی۔

ایک چٹائی کی دوری پر، رلو اس کے روبرو بیٹھی تھی کیوں کہ اس کا باقی کا سراپا حد سے زیادہ سفید تھا اس لیے غار کے منہ سے، اس کے ہونٹ نمایاں انداز میں چمک رہے تھے۔ ایک دوسرے سے علیحدہ کرتے ہوئی چٹائی کے پار وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ لیفٹیننٹ کی تلوار اس کے گھٹنوں کے آگے پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر رلو نے، اپنے شوہر کی پچھلی رات کو، کیا اور اسے غم نے گھیر لیا۔

لیفٹیننٹ کمزوری آواز میں بولا

"اب چوں کہ میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں بچا تو مجھے اپنے میں گہرا گھاؤ لگانا ہوگا۔ یہ

کوئی چیز منظر نہیں ہو گا لیکن ہر وہ چیز جو خوف زدہ مت ہونا کسی بھی قسم کی موت کو دیکھنا ایک ارادہ عمل ہے۔ تم جو کچھ دیکھو اس سے بے حوصلہ مت ہونا۔ ٹھیک ہے ناں؟"

"ہاں۔" ریکو نے خاصی گہرائی تک خود کو جھکایا۔

اپنی دبلی پتلی بیوی کے سراپے کی طرف دیکھتے ہوئے لیفٹیننٹ کو ایک بازاری قسم کا جوشیلا تجربہ ہوا۔ جو کچھ وہ کرنے جا رہا تھا وہ ایک عوامی قسم کے سپاہی جیسا عمل تھا اور یہ مظاہرہ اس نے اس سے پہلے اپنی بیوی کے سامنے نہیں کیا تھا۔ یہ کوئی لڑائی لڑنے کے حوصلے کے برابر ایک ارادہ تھا۔ یہ کسی طرح لائن پر واقع ہونے والی موت کے درجے سے کوئی کم موت نہیں تھی۔ یہ اس کا میدان جنگ میں وہ عمل تھا، جس کا مظاہرہ وہ اب کرنے والا تھا۔

حتمی طور پر لیفٹیننٹ کا یہ خیال اسے ایک عجیب قسم کی طرف لے گیا۔ میدان جنگ میں ایک اکیلی موت، اس کی خوب صورت بیوی کی آنکھوں کے سامنے ایک موت۔۔۔۔ ایک جوش کہ اسے دو طرح کی موت کا سامنا تھا۔ وہ یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ یہ دونوں کا ایک ہی مقصد تھا اور ایسے میں جو چیز تھی وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے سوچا، اسے خوش قسمتی کا ایک اعلیٰ اصول ہونا چاہیے۔ اس خوب صورت آنکھوں سے دیکھے جانے والے موت کے اس عمل کے ہر لمحے کا ہونا، یہ ایک خوشبودار زمہریری ہوا کے جلو میں ایک موت کے سامنے جنم لینے کے مترادف تھا۔ یہاں ایک طرح کی خصوصی حمایت بھی موجود تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ اصل میں تھی یا نہیں لیکن یہ ایک ایسی عمل داری تھی جس سے دوسرے بے خبر تھے۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جو سی اور کہیں نہیں بس اسے ہی ملی تھی۔ لیفٹیننٹ کی یہ سفید ہاتھ والی اتنی جیسی روشن بیوی سی تمام چیزیں دیکھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، جن کے ساتھ اسے محبت تھی اور جس کے لیے وہ اپنی زندگی کی قربانی کر رہا تھا یعنی شاہی خاندان، قوم اور فوجی عہدہ۔

ریکو اپنے شوہر کو ہمہ تن غور سے دیکھ رہی تھی، جو بہت جلد مر جانے والا تھا، اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے دنیا میں اس جیسی خوب صورت چیز کبھی نہیں دیکھی۔ لیفٹیننٹ ہمیشہ اپنی یونیفارم میں اچھا لگتا تھا لیکن اب جب کہ وہ اپنی کھلی ہوئی بھنوؤں اور مضبوطی سے بند ہونٹوں کے ساتھ موت کے مراقبے میں تھا تو اس وقت وہ شاید مردانہ خوب صورتی کے عین عروج پر تھا۔

"جانے کا وقت ہو گیا ہے۔" آخر کار لیفٹیننٹ نے کہا۔

ریکو نے چٹائی پر اپنے جسم کو بہت زیادہ گہرائی تک جھکا دیا۔ وہ اپنا سر نہ اٹھا سکی۔ وہ اپنے

آنسوؤں کی وجہ سے وہ اپنے میک اپ کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔

اور آخر کار جب اس نے اوپر دیکھا تو اس نے آنسوؤں کے دھندلے پن میں سے دیکھا کہ اس کے شوہر نے، اب صاف شدہ اپنی تلوار کے بلیڈ کے گرد ایک سفید پٹی لپیٹ رکھی ہے اور اس کے آخری سرے پر پانچ چھ انچ کے سٹیل کو ننگا چھوڑ دیا گیا ہے۔

چٹائی پر پڑے میں پڑی ہوئی تلوار کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے، لیفینیٹ اپنے گھٹنوں کے بل اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خود کو ایک دوسری کے اوپر ٹانگ دھرنے کا انداز، دوبارہ اختیار کیا اور اپنی یونی فارم کے کالر کے بٹن کو کھول دیا۔ اس کی آنکھیں اب اپنی بیوی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ آہستہ سے، ایک ایک کر کے اس نے جیکٹ کے چھپے بٹنوں کو کھولا۔ اس کی جلد کی رنگت چھاتی نظر آنے لگی اور اس کا پیٹ بھی ظاہر ہو گیا۔ اس نے اپنی بیلٹ کھولی اور پتلون کے بٹن بھی کھول دیے۔ اس کے بے حد سفید رنگت والے چھپے ہوئے جانگیے کی جھلک دکھائی دی۔ لیفینیٹ نے دونوں ہاتھوں سے کپڑے کو کھینچا تاکہ اس کا پیٹ زیادہ نمایاں ہو جائے اور پھر سفید پٹی والے بلیڈ والی تلوار سیدھی۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے پیٹ کے نچلے حصے کو مساج کیا اور ایسا کرتے ہوئے، اس نے نیچے کی طرف نگاہ دوڑائی۔

یہ یقین کرنے کے لیے کہ اس کی تلوار کا کاٹنے والا سرا خاصا تیز ہے۔ لیفینیٹ نے اپنی پتلون کے پٹے کو اوپر کی طرف موڑا۔ اس طرح اس کی ران کا تھوڑا سا حصہ نظر آنے لگا۔ اس نے آہستگی سے چھری کو جلد پر چلایا۔ فوراً ہی خون اس کے زخم سے ابل پڑا اور کئی سرخ دھاریں نیچے کی طرف بہنے لگیں اور تیز روشنی میں چمکنے لگیں۔

یہ پہلی بار تھا کہ ریکو نے اپنے شوہر کے خون کو دیکھا تھا اور اس نے اپنے سینے میں ایک درد دار احساس کو محسوس کیا۔ اس نے اپنے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لیفینیٹ خون کو ایک خاموش تعریفی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اگرچہ وہ ایک وقت یہ سوچ رہی تھی کہ یہ ایک ریاکار سکون تھا، ریکو نے اطمینان کا سانس لیا۔

لیفینیٹ نے بازو کی طرف دیکھنے کے سخت انداز سے بیوی پر اپنی نگاہیں مرکوز کیں۔ تلوار کو اپنے سامنے موڑتے ہوئے اس نے خود کو آہستہ سے زانوؤں پر اٹھایا اور اپنے جسم کو تلوار کے سرے پر جھکنے دیا۔ وہ اپنی ساری طاقت مجتمع کر رہا تھا اور یہ کندھوں پر سے اس کی یونی فارم کے تنے تناؤ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیفینیٹ نے اپنے پیٹ کے بائیں جانب گہرا وار کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کی تیز چیخ نے کمرے

کی خاموشی کو چھیڑا۔ اس کی کوشش کے باوجود جو کہ اس نے اس وار کے لیے کی تھی، یقینیت کا تاثر یہ تھا کہ کسی اور نے اذیت ناک طریقے سے لوہے کے ایک موٹے ڈنڈے کو اس کے پیٹ کے بائیں طرف دے مارا ہے۔ ایک سیکنڈ جتنے وقت کے لیے اس کا سر ڈگمگایا اور اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا تھا۔ چٹخ چٹخ کا نگارہ اس کے جسم میں مکمل طور پر غائب ہو گیا تھا اور اس کی مٹھی میں جکڑی ہوئی سفید پٹی سیدھی اس کے پیٹ میں دبی ہوئی تھی۔

وہ ہوش میں آیا۔ اس نے سوچا بلیڈ نے یقینی طور پر اس کے پیٹ کی دیوار کو پھاڑ دیا ہے۔ اس کا سانس بہ مشکل چل رہا تھا، اس کی چھاتی شدت سے پھڑک رہی تھی اور ذرا درد کے ملا جلے میں، جس پر اسے مشکل ہی سے یقین تھا کہ یہ واقعی یہ ہی کا تھا، ایک خوف زدہ کرنے والا اور جان لیوا درد اسے گھور رہا تھا جیسے زمین پھٹتی جہاں سے ابلتی ہوئی مدی اگلنے کے لیے بہہ نکلی ہو۔ اچانک درد بہت زیادہ ایک سے خوف زدہ کرنے والی رفتار سے ہونے لگا۔ یقینیت نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹا اور ایک جھلی کراہ کو دبا دیا۔

وہ سوچ رہا تھا۔۔۔۔ "یہ یہ سچ مچ بدکاری ہے؟"

یہ ایک بے حد انتشار کا جوش تھا جیسے کہ آسمان اس کے سر پر آ گرا ہو اور دنیا شراب کے نشے میں ڈگمگا رہی ہو۔ اس کی قوت ارادی اور حوصلہ، جو اس کے گھاؤ لگانے سے پہلے مضبوط تھا اب وہ ایک بال جیسے فولادی دھاگے کی طرح کم ہو گیا تھا اور اب وہ ایک خوف کرنے والے احساس کے دب گیا تھا کہ اب اسے مایوسی سے چمٹ کر اس دھاگے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ اس کی مٹھی کی گرفت میں نمی بڑھ رہی تھی۔ اس نے نیچے نگاہ کی، اس کا جانگیہ بھی گیلا ہو رہا تھا۔ اسے یہ بات ناقابل یقین لگی کہ ابھی تک اس خوف ناک درد کے بیچ میں، چیزیں جنھیں نظر آنا چاہیے، نظر آ رہی تھیں اور چیزیں جنھیں موجود ہونا چاہیے تھا موجود تھیں۔

اس لمحے، جب یقینیت نے تھوڑا سا اپنی بائیں جانب گھومنا، اس کی بیوی نے اس کے چہرے پر ہر قسم کی موت کی زردی کو دیکھا جیسے کوئی پردہ فوری طور پر گرا دیا گیا ہو۔ اس نے خود کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی۔ جو کچھ پیش آیا تھا، اسے وہ دیکھنا تھا۔ اسے اس کا گواہ بننا تھا۔ یہ وہ فرض تھا، جو اس کے شوہر نے اس کے ذمے لگایا تھا۔ اس کی مخالف سمت میں وہ، ایک چٹائی کی دوری پر اپنے شوہر کو درد دباتے ہوئے، اپنے ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے، دیکھ رہی تھی۔ درد تو ایک حتمی حقیقت کی

طرح اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور ریلو کے پاس اسے اس سے نجات دلانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

اس کے شوہر کے ماتھے پر پسینہ نمودار ہوا۔ لیفیسٹ نے آنکھیں بند کیں اور پھر انھیں کھولا جیسے وہ کوئی تجربہ کر رہا ہو۔ آنکھوں نے اپنی روشنی کھو دی تھی اور ایک چھوٹے جانور کے مانند خالی اور معصوم لگ رہی تھیں۔

ریلو کی آنکھوں کے سامنے تکلیف کی جلن اتنی طاقتور تھی جتنی کہ گرمیوں کے سورج کی ہوتی ہے۔ یہ درد اس غم سے بہت دور تھی جو اس کے اندر سے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔ درد آہستگی سے اپنے وقفے وقفے سے بڑھتے ہوئے دائروں کی طرف پھیل رہا تھا۔ ریلو نے محسوس کیا کہ اس کا شوہر اب اس کی دنیا کا حصہ نہیں رہا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کا سب کچھ اب ایک درد میں تبدیل ہو چکا تھا، وہ اب درد کے چکر سے باقی تھا، جہاں کوئی ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن ریلو نے درد کو بالکل محسوس نہیں کیا۔ اس کا غم درد نہیں تھا۔ جب وہ اس کے متعلق سوچتی تو ریلو محسوس کرتی کہ ایک بہت اونچے شیشے کی ظالم دیوار اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان اٹھا دی گئی ہے۔

شادی سے لے کر اب تک اس کے شوہر کا ہونا، خود اس کا ہونا تھا اور اس کے شوہر کا سانس لینا خود اس کا سانس لینا تھا۔ لیکن اب جب کہ درد میں اس کے خاوند کا ہونا ایک واضح حقیقت تھی تو ریلو اپنے اس غم میں اپنے ہونے کے یقینی ثبوت کے طور پر محسوس کر سکتی تھی۔

لیفیسٹ کا ہاتھ جو کہ تلوار پر تھا، اس نے اسے اپنے پیٹ کے اندر دائیں بائیں گھمانا شروع کر دیا۔ لیکن جب تلوار انتڑیوں میں الجھ گئی تو وہ متواتر ایک نرمی کے انداز میں باہر کی طرف دھکیلی جا رہی تھی اور لیفیسٹ نے محسوس کیا کہ جیسے اس نے کاٹ لیا تھا، اس کو دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کے اندر اس مقام تک لے جانے رہنا چاہیے تھا۔ اس نے پھل کو آرے انداز میں کھینچا جتنی کہ اسے توقع تھی اس نے اس طرح نہیں کاٹا۔ اس نے اپنے پورے جسم کی طاقت اپنے دائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اسے دوبارہ کھینچا۔ یہ تین یا چار انچ کا گھاؤ تھا۔

اندرونی گہرائیوں سے درد آہستہ سے باہر کی طرف پھیل گیا حتیٰ کہ سارے پیٹ میں اس کی گونج محسوس ہوئی۔ یہ ایک تھکی ہوئی وحشی جھنجھناہٹ کی طرح تھی۔ یا اس کے ہر سانس کے ساتھ جو وہ لے رہا تھا ایک بہت زخمیوں کی سرسراہٹ آواز جیسی تھی اور اس کی نبض کی ہر پھڑکن اس کے سارے وجود کو تھرا رہی تھی۔ لیفیسٹ اب اپنے آپ کو سانس لینے سے باز نہ رکھ سکا۔ لیکن اب تک پھل نے اس کی ناف

کے نیچے تک گھاؤ کو بڑھایا تھا اور جب اس نے یہ جانا تو اس نے اطمینان محسوس کیا اور اس کا حوصلہ کچھ سے بڑھ گیا۔

خون کی مقدار آہستہ سے بڑھ گئی اور اب وہ زخم سے اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا جیسے وہ نبض کی ہر دھڑکن کے ساتھ بڑھ رہا ہو۔ لیفینسٹ کے سامنے والی چٹائی، وہاں پھیلے ہوئے خون سے بھیگ چکی تھی اور خون کی بہت زیادہ مقدار برآمد ہو رہی تھی جو لیفینسٹ کی پتلون کی تہوں میں جذب ہو گئی تھی۔ ایک پردے کی طرح گرتا ہوا ایک دھبا ریلو کی طرف آیا، جو اس کے سفید سختی موزے پر اس کی گود تک جا پہنچا تھا۔ اس وقت جب لیفینسٹ نے آخر بار تلوار کو پیٹ کی دائیں طرف کھینچا تو چاقو نے تھوڑی کم گہرائی تک کاٹا تھا اور اس کی نوک نکلی ہوئی تھی جو خون اور چربی سے چکنی ہو گئی تھی۔ لیکن اچانک متکی کے ایک دوسرے کے زور نے لیفینسٹ کی چھپی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ متکی نے شدید درد کی شدت کو اور بڑھا دیا اور پیٹ جو اب تک مضبوط اور مستحکم رہا تھا، اب اچانک چھلنے لگا اور اس کا زخم بالکل کھل گیا اور انتڑیوں کی سے باہر آ گئیں جیسے زخموں والی قے آ گئی ہو۔ اپنے مالک کی تکلیف سے، ہم رہتے ہوئے، انتڑیوں نے صحت کی مضبوطی کا اظہار کیا تھا اور انھوں نے آہستہ سے باہر آتے ہوئے قوت جاں داری سے تقریباً موافقت کا اظہار کیا اور وہ شانے پر پھیل گئیں۔ لیفینسٹ کا سر جھک گیا، اس کے کندھے ابھر گئے، اس کی آنکھیں نیم وا ہو گئیں اور اس کے منہ سے رال بہنے لگی۔ اس کے اردلی کے کندھے پر لگے اعزازی نشانات روشن ہو کر چمکنے لگے۔

خون ہر طرف پھیل گیا۔ لیفینسٹ اس میں اپنے گھٹنوں تک گیلا ہو گیا اور اب وہ ایک بے پروا انداز سے جھک گیا تھا، اس کا ایک ہاتھ فرش پر تھا۔ ایک خاصی بڑی سے کمر دبی گئی تھی۔ لیفینسٹ جس کا سر جھکا ہوا تھا بار بار قے کر رہا تھا اور اس کے کندھوں کی حرکت واضح نظر آ رہی تھی۔ تلوار کے پھل کا سرا، جسے اب انتڑیوں نے پیچھے دھکیل دیا تھا اور جو لیفینسٹ کے دائیں ہاتھ میں تھا، نمایاں ہو رہا تھا۔ جیسا کہ اس وقت لیفینسٹ دکھائی دیتا تھا، اس سے زیادہ دلیرانہ نظارے کا تصور محال تھا۔ اس نے اپنی قوت کو جمع کیا اور اس کا سر پیچھے کی طرف ڈھلک رہا تھا۔ حرکت میں اچانک شدت آ گئی تھی اور اس کا سر جبڑے کے سٹوں کے ساتھ ایک تیز آواز کے ساتھ ٹکرایا۔ وہ اب تک اپنے سر کو جھکائے ہوئے، اپنے گھٹنوں کی طرف آتے خون کے تاریک حلقوں کو، کمر دوہری کیے دیکھ رہی تھی لیکن آواز سے تیز ان ہو کر، اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

لیفیسٹ کا چہرہ ایک زندہ شخص کا چہرہ نہیں تھا۔ آنکھیں کھلی لگ رہی تھیں، جلد بھی گئی تھی، اس کے بال اور ہونٹ جو کبھی روشن ہوا کرتے تھے، اب ان کا رنگ سوکھے کیچڑ جیسا تھا۔ اس کا صرف دایاں ہاتھ حرکت کر رہا تھا۔ بڑی مشقت کے ساتھ تلوار پکڑے ہوئے، اس کا ہاتھ لکڑی کے ہاتھ کی طرح ہوا میں ہل رہا تھا اور وہ لیفیسٹ کے گلے کے نیچے جیسے کسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ریکو اپنے شوہر کی اس آخری دل توڑ دینے والی مدافعانہ جدوجہد کو دیکھ رہی تھی۔ خون اور چربی سے چپکتے ہوئے اس نے گلے پر وار کیا اور اس کا نشانہ خطا گیا۔ جو طاقت اس وار میں درکار تھی مفقود تھی۔ خالی جاتے وار اس کے کاندھوں سے ٹکرائے۔ اگرچہ اس کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ اکڑے ہوئے فوجی کالر دوبارہ بند ہو جاتے تھے اور وہ گلے کی حفاظت کر رہے تھے۔

ریکو اس سے زیادہ یہ نظارہ برداشت نہ کر سکی۔ اس نے اپنے شوہر کی مدد کرنا چاہی لیکن وہ کھڑی نہ ہو سکی۔ وہ خون میں سے اپنے ہاتھوں کے بل چلی اور اس کا سفید سلرٹ خون سے گہرا سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے عقب میں آ کر صرف اتنا کر سکی کہ اس نے اس کے کاندھوں کو چھو کر دیا۔ ادھر ادھر پڑتے چھل نے آخر کار گلے کے نیچے گوشت سے ملاپ کیا۔ اس لمحے ریکو کا احساس یہ تھا کہ خود اس نے اپنے شوہر کو آگے دھکیلا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ حرکت خود لیفیسٹ کی طرف سے تھی یعنی یہ اس کی طاقت کی آخری جدوجہد تھی۔ اچانک اس نے اپنے جسم کو چھل پر گرا دیا اور چھل اس کی گردن میں گھس گیا اور پیٹھ کی طرف سے باہر نکل گیا۔ خون کا ایک فوارہ وہاں پر اور لیفیسٹ ساکن ہو گیا۔ یہ اس کی گردن کی پچھلی طرف سے باہر نکلا ہوا نیلے رنگ میں رنگا ٹھنڈا فولاد تھا۔

ریکو جس کی جڑیں خون میں لت پت تھیں وہ آہستہ سے سیڑھیوں سے نیچے اتری، اوپر والی منزل والا کمرہ اب مکمل طور پر خاموش تھا۔

ریکو نے گراؤنڈ فلور کی لائٹس آن کیں۔ اس نے تیس جیٹ اور تیس کے تین پلگ کو چیک کیا اور اس نے کیبنٹ میں نیچے دبے ہوئے سگنل بکس پر پاور ڈالی۔ وہ ساڑھے چار چٹانوں والے کمرے میں سیدھے مدار میں رکھے گئے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی اور اس نے اپنے سلرٹ کو پکڑ کر رکھا۔ خون کے چھینٹے اس طرح دکھائی دیتے تھے جیسے وہاں ان کا واضح اور تیز رنگوں والا نمونہ بنایا گیا ہو اور یہ اس کے سفید کمونو کے نچلے آدھے حصے پر پھیلا ہوا تھا۔ جب وہ آئینے کے سامنے بیٹھ گئی تو وہ اپنے راہنماؤں کے آس پاس موجود اپنے شوہر کے خون کی نمی اور ٹھنڈک سے آگاہ تھی اور وہ کانپ رہی تھی۔ پھر

وہ کسی قدر دیر تک اپنے شکار کی تیاریوں کے حوالے سے سستی برتتی رہی تھی۔ اس نے اپنے کاموں پر خاصی زیادہ مقدار میں مارو لگایا اور اس نے اپنے ہونٹوں کو بھی خوب رنگا۔ یہ اس کے شوہر کو خوش کرنے والا میک اپ نہیں تھا۔ یہ ایک میک اپ تھا جو وہ کسی کے لیے تھا اور جسے اس نے پیچھے چھوڑ جانا تھا۔ یہ شان دار تھا اور اس کا رنگ قاتل دیدنی تھا۔ جب وہ نکلی تو آئینے کے سامنے والی چٹانی ڈھلان سے بھیگی ہوئی تھی۔ ریکو کو اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔

شکار ختم کر کے وہ آخر وہ پورچ کے سیمنٹ والے فرش پر کھڑی ہو گئی۔ جب رات کو اس کے شوہر نے دروازے کو چٹخنی لگائی تھی تو یہ موت کی تیاری کے لیے تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ سادہ سے مسئلے کے گرد میں مستغرق کھڑی رہی۔ کیا اسے اب چٹخنی کھول دینا چاہیے؟ اگر وہ دروازے پر تالا لگائے رکھتی تو اس طرح ان کے ہمسایوں میں دو دن تک ان کی خوشی کی اطلاع نہیں ہو سکتی تھی۔ ریکو اس بات کا مزہ نہیں لے سکتی تھی کہ اس وقت ہونے تک وہ لاشیں یہاں پڑی رہتیں۔ بہرحال اس نے محسوس کیا کہ اسے کھلا چھوڑ دینا چاہیے۔ اس نے چٹخنی ہٹائی اور اس نے دھکے سے آلو دروازے کو ذرا سا کھلا رہنے دیا۔ فوراً ہی ہوا کا ایک جھونکا اندر آ گیا۔ آدھی رات کے وقت باہر کسی قدر کا شائبہ تک نہ تھا اور مخالف سمت میں موجود بڑے سے گھر کے درختوں میں برف کی طرح ٹھنڈا چاند چمک رہا تھا۔ دروازے والی جگہ میں چھوڑ کر ریکو نیند میں مست کر کے وہ گئی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اب اس کی جرابوں میں پھسلن موجود نہیں تھی۔ وہ آدھے راستے پر اس کے تلوؤں سے ایک خاص قسم کی بو آ رہی تھی۔

لیفٹیننٹ وہاں پڑا تھا۔ اس کا چہرہ خون کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی گردن کے آگے کی طرف کا حصہ اب پہلے سے زیادہ نمایاں ہوا تھا۔ ریکو بے چینی سے خون میں سے گزری۔ لیفٹیننٹ کی لاش کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے اس کے چہرے کو، جو ایک کان کے رخ پر چھائی پر پڑا تھا، ہمدردی مصروفیت کے ساتھ دیکھا۔ لیفٹیننٹ کی آنکھیں اس طرح پوری کھلی ہوئی تھیں جیسے کسی چیز نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی ہو۔ اس نے سر کو اٹھایا اور اپنی آستین سے اس کے ہونٹوں کو صاف کیا۔ اس کو چیخ مارنی چاہیے تھی اور اس نے الماری سے ایک نیا سفید کمبل اور ایک کمر کی ڈوری لی۔ اپنی سلرٹ کے کھردرے کنارے کے لیے اس نے کمبل کو اپنی کمر کے گرد لپیٹا اور اسے مضبوطی سے ڈوری کے ساتھ باندھ دیا۔

ریکو، لیفٹیننٹ کے جسم سے ایک فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اپنے لبادے سے خنجر نکال کر اس

نے اس کے چیختے ہوئے پھل کا بغور معائنہ کیا اور اسے اپنی زبان کے قریب لے گئی۔ پاش شدہ سیب کی قدر خوش ذائقہ تھا

ریلو نے سختی کہیں دھانی۔ جب اس نے سوچا کہ کس طرح، اس سے پہلے اس کے مرنے والے شوہر اور اس کے درمیان ایک خلیج در آئی تھی، اور اب یہ خود اس کے تجربے کا ایک حصہ بننے والی تھی، اس کے سامنے بس ایک ہی لطف والی بات تھی کہ وہ اس قلعہ میں داخل ہونے والی تھی، جسے اس کے شوہر نے پہلے ہی سے اپنے لیے چن لیا تھا۔ اس کے خاوند کے تکلیف اٹھاتے ہوئے چہرے پر کھلا یہ تھا، جسے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا اور جس کو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اب وہ اس معمے کو حل کر سکے گی۔ اس کو احساس ہو گیا تھا کہ آخر کار وہ خود بھی اس عظیم خلاقی عمل کی نزاہت اور مٹھاس کے ذائقے کو محسوس کرنے کے قابل ہو گئی ہے جس پر اس کے شوہر کو یقین تھا۔ جو ذائقہ اس نے اب تک چکھا تھا یہ وہ ہوس سے انداز میں اس کے شوہر کی مثال کے حوالے سے تھا۔ اب وہ خود اپنی زبان سے اس خوشبو کو چکھنے والی تھی۔

ریلو نے خنجر کے پھل کی نوک کو اپنے گلے کے نچلے حصے پر رکھا۔ اس نے شدت سے اسے گھونپا۔ زخم گہرا تھا۔ اس کے سر میں شعلہ سا بھڑکا اور اس کے ہاتھ بے اختیاری سے ہلے۔ اس نے پھل کو دونوں طرف میں سختی سے کھینچا۔ ایک گرم سوا سے اس کا منہ بھر گیا اور اس کے سامنے کی ہر چیز سرخ ہو گئی۔ اس نے خون کا ایک فوارہ بلند ہوتا دیکھا۔ اس نے ساری طاقت سمیٹ لی اور پھل کی نوک کو اپنے گلے میں گہرائی تک ڈبو دیا۔

☆☆☆☆

وولف گانگ بروشر

رک جاؤ، زرافہ

وہ دنیا کے بھورے نامک رہ تنہا چاندیاں میں شور مچاتی ہوا اور رات جیسے خالی پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ رات کے وقت خالی اسٹیشن بے معنی اور معدوم ہوتے ہوئے زندگی کا احساس دلاتے ہیں۔ اور کالعدم، کالعدم، کالعدم، کالعدم۔ لیکن اگر تم اور آگے بڑھو تو تم کھو جاؤ گے۔

تب تم اپنا وجود کھو دو گے کیوں کہ اندھیرے کی ایک ہولناک آواز ہوتی ہے۔ تم اس سے بچ نہیں سکتے اور چشم زدن میں یہ تم پر حاوی ہو جائے گا۔ یہ تمہارے گزشتہ روز کیے گئے قتل کی یاد کے ساتھ حملہ کرتا ہے۔ اور وہ قتل جو ابھی تم کل کرو گے، اس کے پیشگی علم کے ساتھ تم پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اور یہ تمہارے اندر ایک چیخ کو دبوچتا ہے۔ تنہا جاور بھیس بدلی جانے والی مچھلی کی چیخ، جو کہ خود اپنے سمندر سے مغلوب ہو گئی ہو۔ اور یہ چیخ دوسروں وارانے کے خطرے سے آگے لے جاتی ہے اور تمہارے چہرے کو پوری طرح سے چیر پھاڑ کر اس میں غار سا پیدا کر دیتی ہے۔ سوا اپنے ہی سمندر میں تنہا جاور کی چیخ، خوف زدہ کر دینے والے اندھیرے کی خاموشی ہے۔ اور یہ چمکتی تو رہے والے دھمکی آمیز انداز اور سیاہ پروں والے سیپ کی طرح تم پر چڑھ دوڑتا ہے اور جھاگ کی طرح شرارتی انداز سے پھنکارتا ہے۔

وہ دنیا کے آخری سرے پر کھڑا تھا۔ ٹھنڈے سفید محرابی لیمپ بے رحم تھے اور وہ ہر چیز کو غم ناک اور برہنہ کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے پیچھے ایک خوفناک اندھیرا ہوتا ہے۔ رات جیسے خالی پلیٹ فارموں کے سفید لیمپوں کے گرد اندھیرا اتنا سیاہ ہوتا ہے کہ کوئی سیاہی بھی اتنی کالی نہیں ہو سکتی۔

"میرے خیال میں تمہارے پاس سگریٹ ہیں۔" ایک پیلے چہرے پر موجود سرخ منہ والی لڑکی نے کہا

"ہاں" اس نے کہا، "میرے پاس چند ایک ہیں"

"تو پھر تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟" اس نے نزدیک آ کر سرگوشی کی

"نہیں" اس نے کہا، "کس لیے؟"

"تم نہیں جانتے کہ میں کس قماش کی ہوں۔" اس نے چاروں طرف سے سونگھا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" اس نے جواب دیا "تم بھی ان سب کی طرح ہی ہو"

"اے موتم ایک زرد ہو، ایک ضدی زرد جیسے کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں کیسی لگتی ہوں، میں بھوکی ہوں۔" اس نے کہا "ننگی اور تمہارے جسم پر نقش و نگار ہیں ان کی طرح۔"

"زرافے، تم لمبے اور گوتھک ہو۔" وہ بے ہودہ انداز میں اس کے قریب ہو گئی۔ "لیکن تم اچھے لگتے ہو اور تمہارے پاس سگریٹ ہیں۔ لڑکے بات کو سمجھو، یہ رات ہے۔"

تب اس نے اس کی طرف دیکھا۔ ٹھیک ہے، وہ ہنسا۔ "تم سگریٹ لے لو اور میں تمہارا بوسہ لیتا ہوں، لیکن اگر میں تمہارے لباس پر ہاتھ ڈال دوں تو؟"

"تب میں شرما جاؤں گی۔" اس نے کہا۔

اس نے سوچا، اس کی ہنسی میں گنوار پن تھا۔

ایک مال گاڑی، تیز رفتار میں چیختی ہوئی، سٹیشن پر آئی۔ اور رکے بغیر گزر گئی۔ اس کی سست ٹمٹماتی ہوئی بتی لڑکے اپنی محبوبہ کو اندھیرے میں چھوڑتی ہوئی چلی گئی۔ دھماکا، ہوک، توڑ پھوڑ، گڑگڑاہٹ اور وہ گئی۔ تب وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔

پھر اس کے بعد ہاتھ، چہرے اور ہونٹ تھے۔ لیکن اس کے خیال میں، ان سارے چہروں سے خون بہہ رہا تھا، ان کے منہ خون آلود تھے اور ان ہاتھوں میں دق بھرے تھے۔ لیکن تب اس کو میک اپ کا اندازہ ہوا اور عورت کے ہاتھ نے اس کے بدبو دار بازو کو پکڑ لیا۔ پھر ایک کراہ سنائی دی اور ایک آستین کا بٹا ہیلمٹ گرا اور ایک آنکھ پھوٹ گئی۔

"تم مر رہی ہو۔" وہ چیخا۔

"مر رہی ہوں۔" اس نے اسے ذہنیوں کی طرح دیکھا۔ "شاید کچھ ایسا ہی ہو۔"

تب اس نے ہیلمٹ پیچھے ماتھے کی طرف دھکیلا۔ اس کے کالے بال ملائمت سے چمکے۔

"واہ تمہارے بال۔" وہ آہستگی سے بولا

"کیا تم رکو گے؟"

"ہاں"

"زیادہ دیر تک؟"

"ہاں"

"ہمیشہ کے لیے؟"

"تمہارے بالوں سے گیلی شام جیسی خوشبو آتی ہے۔" وہ بولا۔

"ہمیشہ کے لیے؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

اور تب قریبی فاصلے سے ایک موٹی اور عظیم چیخ ابھری۔ مچھلی چیخ، چمگادڑ چیخ، گوریلا چیخ، ایک کبھی نہ بجنے والی ٹھنڈی جیوفی چیخ۔ کیا اس چیخ سے پوری طرح ڈری ہوئی زین، اپنے راستے پر چلتی ہوئی جھول رہی تھی؟ معدوم ہوتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ کے نیچے، جو ذہنی، انجانی نیلی سبز چیخ۔ کیا یہ چیخ سن کر ستارے کانپنے لگتے تھے؟

تب اس نے کھڑکی کو کھول دیا۔ اور اس طرح رات کے ٹھنڈے ہاتھوں نے اس کی ننگی چھاتیوں کو پکڑ لیا۔ اور اس نے کہا: "اب مجھے جانا چاہیے۔"

"زرافہ، رک جاؤ۔" اس کے پیلے چہرے پر اس کا پڑمردہ سرخ منہ چمکا لیکن زرافہ باز گشتی آواز پیدا کرتے ہوئے کھلے قدموں سے فٹ پاتھ پر چپکے سے چلتا گیا۔ اور اس کے پیچھے بھورے چاند جیسی گلی ایک بار پھر پتھر بنے والی تنہائی میں جا گری۔ رینگنے والے جانور جیسی آنکھوں والی کھڑکیاں دودھیا دھند میں پتی، مردہ نظر آتے تھیں۔ نرمی سے بلکورے لیتے، رازداری سے سانس لیتے ہوئے اور پرانے گہری نیند سو رہے ہیں۔ پیچھے گرتے ہوئے، سفید، نرم اور غمگین انداز میں اس کے پیچھے ہراتے ہوئے۔

شہر نے میووں جیسی آواز نکالی اور عورت کا سینہ ٹھنڈا ہو گیا۔ جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کھڑکی کے شیشے کے پیچھے بھی ایک سرخ چہرہ موجود تھا۔ زرافہ رو دیا۔

☆☆☆☆

میلان کنڈیرا

پرانے مُردوں کو نئے مُردوں کے لیے جگہ بنانی چاہیے

(۱)

وہ ایک چھوٹے سے چیک (Czeck) ٹاؤن کی اس گلی میں موجود، اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا، جہاں وہ سالوں پہلے سے رہتا چلا آیا تھا۔ وہ کسی جوش کے بغیر اپنی ردی، چغل خور ہمسایوں اور اپنے کام کے اوقات کے بے رنگ جھگڑوں میں گھرے ہونے کو یاد کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھے بغیر (جیسے کہ کوئی سینکڑوں بار گزرتا ہوا چل رہا ہو) اس کے قریب سے گزر رہا تھا لیکن اس نے اسے دور ہی سے پہچان لیا تھا اور وہ اس کی طرف آتے ہوئے اسی اپنی مرضی سے مسکرا رہی تھی۔ لیکن اسی لمحے، جب وہ ایک دوسرے کے پاس سے گزر رہے تھے، اس مسکراہٹ نے اس کی یادوں میں ایک ٹھنڈی سی بھاری اور اسے اس کی خنودگی سے اچک لیا۔

"میں شاید تمھیں پہچان نہیں سکا۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ لیکن یہ ایک احمقانہ معذرت تھی کیوں کہ اس عمل نے انھیں تیزی سے اس دردناک صورت حال کی طرف لوٹا دیا تھا، جس کی بنا پر ان کا خاموش رہنا بہتر ہوتا۔ انھوں نے پچھلے پندرہ سال سے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا اور اس دوران میں وہ دونوں عمر رسیدہ ہو گئے تھے۔ "کیا میں بہت زیادہ بدل گئی ہوں؟" اس نے پوچھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نہیں کہے لیکن اس حقیقت کو اگر یہ جھوٹ تھا تو بھی مکمل جھوٹ نہیں تھا کیوں کہ اس کی وہ نرم مسکراہٹ (جو کہ شرمگیں انداز کی دبی ہوئی ایسی مسکراہٹ تھی، جس میں ہمیشہ قائم رہنے والے جوش کی کشادگی موجود تھی) جو کئی سالوں کے فاصلے سے بغیر تبدیل ہوئے نمودار ہوئی تھی اور جس نے کہ اسے تعجب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس (مسکراہٹ) نے واضح طور پر اس سے پہلے جیسی مشابہت والی عورت کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا کہ اسے یقینی طور پر اس سے بے اختیار رشتہ تھا اور اسے ایسے دیکھنا تھا جیسے کہ وہ آج دکھتی تھی۔ اب وہ تقریباً ایک بوڑھی عورت تھی۔

اس نے اسے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی تھی اور اسے کیا کام تھا۔ اس نے جواب دیا کہ اسے

اور کچھ نہیں کر رہی تھی، سوائے اس کے کہ اس ٹرین کا انتظار کرے، جو شام کو اسے پراگ لے جانے والی تھی۔ اس نے اس غیر متوقع ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا اور کیوں کہ (ایک معقول وجہ کی بنا پر) انھوں نے اس پر اتفاق کیا تھا کہ دونوں مقامی کیفے گندے اور لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، اس لیے اس نے اسے اپنے کمرے میں، جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھا، آنے کی دعوت دی۔ اس نے چائے اور کافی دونوں پیش کیں اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ ایک صاف ستھری اور سکون ملاقات تھی۔

(۲)

گفتگو ہی سے یہ ایک دن تھا۔ پچیس سال پہلے ایک نئی دلہن کے طور پر وہ یہاں تھوڑی سی مدت کے لیے رہتی رہی تھی۔ پھر وہ پراگ چلے آئے۔ جہاں وہ اس سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اسے اس کی ایک عجیب و غریب آخری وصیت کے تحت مقامی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ اس وقت اس نے قبر کے لیے اس سال کی پیشگی رقم حاصل کی تھی لیکن چند دن پہلے وہ اس بات سے ڈر گئی تھی کہ اس رقم کی مدت ختم ہو چکی تھی اور وہ اس کی تجدید کروانا بھول گئی تھی۔ سب سے پہلے اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ اس کے بارے میں قبرستان کی انتظامیہ کو لکھے، لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس معاملے میں حکام سے خط و کتابت کرنا کتنا بے معنی تھا اور وہ باہر نکل آئی۔

وہ اپنی یادداشت کے بھروسے سے اپنے خاوند کی قبر کی طرف جانے والے راستے کو جانتی تھی لیکن آج اچانک اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ قبرستان میں پہلی بار آئی ہو۔ وہ قبر کو نہ ڈھونڈ سکی اور اسے لگا جیسے وہ بھٹک گئی ہو۔ اسے سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ وہاں جہاں کہ شوہر کی طرف سے مرحوم اس کے خاوند کے نام والی کتبے کی رنگ کا پتھر والا تبہ تھا لیکن اس جگہ (اس نے یقینی انداز میں ارد گرد موجود قبروں کو پہچان لیا تھا) اب ایک کالے رنگ کے سنگ مرمر کا تبہ بالکل مختلف قسم کی تحریر والا میں موجود تھا۔

پریشان سی ہو کر وہ قبرستان کی انتظامیہ کے پاس آئی۔ وہاں انھوں نے اسے بتایا کہ پچیس کی مدت ختم ہو جانے پر قبروں کو معدوم کر دیا جاتا تھا۔ اس نے ان پر الزام لگایا کہ انھوں نے اسے اپنے کی تجدید کے لیے کوئی ہدایت نہیں دی تھیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ قبرستان میں جگہ کی کمی تھی اس لیے پرانے مردوں کو نئے مردوں کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے۔ اسے غصہ آ گیا اور اس نے انھیں اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس اور انسانیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن جلد ہی وہ سمجھ گئی کہ ان سے کچھ کہنا بے فائدہ تھا جیسے کہ وہ اپنے شوہر کی موت کو روک نہیں سکتی تھی، اس لیے وہ اس کی اس

دوسری موت یعنی "پرانے آدمی کی موت" کے حوالے سے بھی بے بس ہی تھی کہ جس کی بنا پر وہ اب ایک مرے ہوئے آدمی کی حیثیت بھی کھو چکا تھا۔

وہ وہاں سے پلٹ آئی اور اس کی پریشانی جلد ہی اس کے غم میں تحلیل ہو گئی۔ اس نے تصور یہ کہ کیسے وہ اپنی عفت کا جو رہ پیش کر سکے گی۔ آخر کار تجسس اس پر غالب آ گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کی رہائی تک کے بے وقات کو کیسے گزارے۔ وہ یہاں کسی کو نہیں جانتی تھی اور اسے کسی چیز نے جذباتی قسم کی چہل قدمی پر بھی نہیں ابھارا۔ یوں کہ وقت کی گزران نے شہر کو بہت حد تک تبدیل کر دیا تھا اور پہلے والی مانوس جگہیں اب اسے اجنبی لگ رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس پرانے واقف کار کی (جسے وہ تقریباً بھول چکی تھی) موت قبول کر لی تھی، جو اسے اتنا قابل لگا تھا۔ اس نے اس کے واش روم میں اپنے ہاتھ دھوئے اور نرم سی بازوؤں والی کرسی پر (اس کی ٹانگیں درد کر رہی تھیں) بیٹھ گئی۔ اس نے کمرے میں نگاہیں دوڑائیں اور پردے کے پیچھے، پانی کے ابلنے کی آواز سننے لگی، جس نے کہ کمرے سے کچن کے گوشے کو علاحدہ کر رکھا تھا۔

(۳)

اسے پینتیس سال کا ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور یہی اس وقت، اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے سر کے اوپری حصے کے بال کم ہونے، کھلنے لگے ہیں۔ ابھی وہاں گنجا پن نمایاں نہیں ہوا تھا لیکن یہ ظاہر ہونا شروع ہو چکا تھا (بالوں کے نیچے کھوپڑی نظر آنے لگی تھی) اور یہ وہ اہم بات تھی کہ وہ وقت بے یاد و دور نہیں تھا کہ جب اسے یقینی طور پر ظاہر ہونا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ گم ہوتے یا گرتے بالوں کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنانا ایک مضحکہ خیز بات تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ گنجا پن، اس کے چہرے کو بدل دے گا اور اس کی اس وقت تک کی ظاہری جوانی، (اس سے انکار نہیں تھا کہ یہ بہترین تھی) اپنے اختتام کی طرف گامزن تھی۔

اب ناملاحت نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیسے ایک ایسے شخص کی، (بالوں والا) جس کی جوانی اب رخصت ہونے والی تھی، عمر دیہات میں کیا ہو چکا تھا یعنی اس نے کیا تجربہ حاصل کیا تھا اور کیا لطف اٹھایا تھا۔ جس چیز نے اسے تنگ کیا وہ یہ تھی کہ اس نے تجربہ قدرے کم حاصل کیا تھا۔ جب اس نے یہ سوچا تو اسے کچھ راحت ہوئی۔ ہاں وہ شرمسار ہوا کہ اس نے اس زمین پر اتنا سا عرصہ گزارا اور اتنا کم تجربہ حاصل کیا تھا، یہ رسوائی کی بات تھی۔

جب اس نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ اس نے زیادہ تجربہ حاصل نہیں کیا تو اس سے اس کی مراد کیا تھی؟ کیا اس سے مراد کام، پیک سواری، کھیل اور عورتیں، جیسا مطلب نکلتا تھا بے شک اس کا مطلب یہ تمام چیزیں ہی تھیں لیکن پھر بھی ان سب سے بڑھ کر عورتیں تھیں کیوں کہ اگر اسے زندگی کے دوسرے میدانوں میں کچھ کمی کا سامنا کرنا پڑا تھا تو یقیناً اس کے لیے پریشان کن بات تھی لیکن وہ اس سب کا ذمہ دار خود پر نہیں اٹھاتا تھا، اس کام پر بھی نہیں جو کہ غیر دلچسپ اور کسی ترقی کے بغیر تھا، نہ ہی اپنے خرچوں کو کنٹرول کرنے پر کیوں کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے، نہ ہی معتبر معرفتی حوالوں پر اور آخر میں حتیٰ کہ اس حقیقت پر بھی نہیں کہ جب وہ بیس سال کا تھا تو اس نے اپنا گھنٹا رکھی کر دیا تھا اور اس کی وجہ سے اسے اپنا وہ کھیل جس سے کہ وہ لطف اندوز ہوتا تھا، چھوڑنا پڑا تھا۔ دوسری طرف عورتوں کی سلطنت اس کے لیے نہتا آزادی کا میدان تھا کیا ہونے پر وہ کوئی بہانے بازی نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں وہ اپنی دولت مندی کا مظاہرہ کر سکتا تھا کیوں کہ اس کے ہر ایک زندگی کے خصوصی پن کی یہ چار کسوٹی تھی۔

چوں کہ قسمت ہی بھی ہو سکتی تھی، اس لیے اس کے لیے عورتوں کے حوالے سے حالات کسی قدر برے ہی رہے۔ پچیس سال کی عمر تک (اگرچہ وہ ایک اچھی شکل والا شخص تھا) شرمیلے پن نے اسے دشواری میں مبتلا رکھا پھر وہ محبت میں مبتلا ہو گیا، اس نے شادی کر لی اور سات سال بعد اس نے خود کو راغب کیا کہ کسی ایک عورت میں نہ ختم ہونے والے عشق کی توقعات کو پانا ناممکن ہے۔ تب اس نے اسے طلاق دے دی اور ایک ہی عورت پر ٹھہرنے کا خطرہ (اور کسی نہ ختم ہونے والے سراب) بھی نکل اور اس کی جگہ رضامندی پر مبنی دوستی کے حوالے سے عورت کے حصول میں ایک جرأت مندی (ان کا رنگا رنگ محدود حصول) کا تصور آیا۔ بدقسمتی سے اس کی مالی حالت نے اس کی دریافت شدہ خواہشات کو ناکامی میں بدل دیا (اسے اس کی پہلی بیوی سے موجود اپنے بچے کے ماں نفقے کے لیے ادائیگی کرنی ہوتی تھی، جس سے کہ سال میں ایک یا دو بار اسے ملنے کی اجازت تھی) اور اس چھوٹے سے قصبے میں ہمسایوں کی دوسروں کی ٹوہ لینے کی عادت کی زیادتی تھی کہ عورت کے انتخاب کے مواقع محدود تھے

وقت پہلے ہی بہت تیزی سے گزر رہا تھا اور اس نے وہ غسل خانے میں واش بیسن کے اوپر جب گول شیشے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے سر کے اوپر دائیں ہاتھ میں ایک گول آئینہ رکھا تھا اور جو اس ہاتھ سے سر کے پیچھے پن کے ذریعے کا معائنہ کر رہا تھا جو کہ اب ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا اس نظارے نے چمک (جس کے لیے وہ تیار نہ تھا) یہ خلا اس کے سامنے لا کر رکھ دیا کہ جو وہ کھو چکا

تھا، اسے واپس نہیں لایا جا سکتا تھا اس لیے اس نے خود کو ایک پرانی گندی منتقم صورت حال میں گرا دیا اور تبھی کہ خودکشی کے لفظی خیال میں بھی گرفتار رہا فطرتاً (اور اس پر زور دینا ضروری ہے کہ نہیں اسے ایک ہسٹیریا کے مریض اور ایک احمق شخص کے طور پر نہیں دیکھنا چاہیے) اس نے ان خیالات کے مزاحیہ پہلوؤں کو سراہا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی بھی اپنی خودکشی پر عمل نہیں ہونے دے گا (وہ اندر ہی اندر اپنی اس خودکشی والی کیفیت پر ہنسا، میں اپنے اس گنجے پن کے ساتھ نہیں رہ سکوں گا، حد ان ہو) لیکن یہ کافی ہے کہ اس کے ان خیالات نے چاہے یہ کتنے افلاطونی ہی کیوں نہ تھے۔ اسے خوب لعنت ملامت کی۔ ہمیں اس کے اندر پنپتے ان خیالات کو سمجھنا چاہیے کہ وہ کو درمیان میں ہی ترک کر دینے کی اس کی بھرپور خواہش کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس طرح وہ خود کو ایسی میراتھن ریس میں شریک سمجھتا ہے، جس کے نزدیک کے درمیان میں پہنچنے پر اس پر کھلتا ہے کہ وہ نہایت شرمناک طور پر (اور خود اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے اپنی فاش غلطی کی وجہ سے) ہار رہا ہے۔ اور تب وہ اس کو ایک ہاری ہوئی ریس سمجھتے ہوئے مزید دوڑنا نہیں چاہتا۔

اور تب ایک چھوٹی میز پر بیٹھتے ہوئے، اس نے کاؤنٹر کے سامنے اس پرانی کاپی کو رکھا (اس کاغذ پر وہ جلد میں جیسی تھی یہ کاپی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا حقیقت میں عجیب قسم کی بدامنی ہے کہ وہ اس عورت سے مل رہا تھا کہ جس کی محبت میں وہ سر سے پاؤں تک گرفتار رہا تھا اور ان دنوں اس نے اس کو وہ جانے دیا (اپنی ایک بہت بڑی غلطی کی وجہ سے) ٹھیک طور پر، یہ وہ وقت تھا کہ جب اس کی ایسی حالت بنی تھی کہ اب کسی بھی چیز کو درست رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔

(۴)

وہ یہ مشکل یہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ اس کے سامنے ایسی عورت کے طور پر موجود تھی، جس نے اس سے طرح حاصل کیا تھا اور وہ وہ وقت اس رات کے بارے میں آگاہ رہی تھی، جو انھوں نے اکٹھے گزاری تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تب وہ کیسا دکھتا تھا۔ (وہ جس سال کا تھا اسے بہت پسند آتا تھا، وہ شرما جاتا تھا اور وہ اس کی طفلانہ حرکتوں سے محظوظ ہوتی تھی) اور اسے خود اپنے متعلق بھی یاد تھا (وہ پینتیس سال کی تھی اور خوب صورتی کو پانے کی ایک مخصوص خواہش اسے دوسرے مردوں کی باہوں میں لے جاتی تھی لیکن اسی وقت یہ اسے اس سے دور بھی لے جاتی تھی۔ اس نے ہمیشہ یہ تصور کیا کہ وہ ایک خوب صورت گیدی کی طرح تھی اور اسے ڈر تھا کہ اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی کرنا اسے ایک بھدی عادت میں نہ بدل دے)

ہاں وہ خوب صورتی کو اپنے لیے مشیت الٰہی سمجھتی تھی، جیسے کہ لوگ اپنے لیے اخلاقی فرمودات کو سمجھتے تھے۔ اگر اس نے اپنی رہائش میں کوئی بدصورتی دیکھی ہوتی تو شاید وہ مایوس ہو گئی ہوتی اور کیوں کہ وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ پندرہ سال بعد اپنے میدان کے ہر ایک بوڑھی لگ رہی ہوگی (اس تمام بدصورتی کے ساتھ جو کہ اس کے ساتھ ساتھ چلی آتی تھی)، وہ جلدی سے اپنے چہرے کے سامنے ایک تصویری پنکھا کھول دیا جاتی تھی اور اس مقصد سے، اس نے اسے اپنے جلدی سے کیے گئے سوالات میں ڈبو دیا۔ اس نے اس سے پوچھا کہ اس کا اس قصبے میں کیسے آنا ہوا تھا۔ اس نے اس کے کام کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اس کے بیچلر اپارٹمنٹ میں موجود آرام دہ برآمدے اور کھڑکی میں سے قصبے کے مکانوں کی چھتوں سے نظر آنے والے نظارے کی تعریف کی۔ (اس نے یہ کوئی خصوصی نظارہ نہیں تھا لیکن وہاں ایک خلا پن تھا اور آزادی تھی)۔ اس نے تاثر پسند مصوروں کی فریم شدہ خصوصی تصویروں کی نقلوں کے اصلی مصوروں کے نام سے (ایسا کچھ غریب چیک دانشوروں کے لیے عام سی بات تھی۔ آپ اپنے گھر پر بہت آسانی سے ان کے پاس رکھ سکتے تھے۔) تب وہ کافی کے اس کپ کو ہاتھ میں لیے ہوئے تھی جو کہ ابھی اس نے پورا نہیں پیا تھا اور وہ اس رائٹنگ ڈیسک پر جھک گئی جس پر چند فوٹو ایک سٹینڈ میں رکھے تھے (اس سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی کہ وہاں کسی نوجوان عورت کی فوٹو نہیں تھی)، اور اس نے پوچھا کہ اس میں ایک بوڑھی نظر آنے والی تصویر کیا اس کی والدہ کی تھی۔ مرد نے اس کی تصدیق کی۔

تب اس نے پوچھا کہ جب اس نے کہا تھا وہ یہاں کچھ "معاملات" کو نمٹانے آئی تھی تو اس سے اس کی مراد تھی۔ حقیقتاً وہ قبرستان کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی (اس پر خصوصی طور پر صرف وہ اپنے آپ کو چھتوں سے بہت اونچا محسوس کرتی تھی، بل کہ خوش کن طور پر اپنی رہائش بھی اوپر سمجھتی تھی)۔ جب اس نے اصرار کیا تو اس نے تسلیم کیا (لیکن نہایت اختصار کے ساتھ، کیوں کہ یہ ایک قسم کی فوری صاف گوئی ہمیشہ ہی اس کے لیے اجنبی سی رہتی تھی) کہ وہ بہت سالوں پہلے ادھر ہی رہتی تھی اور یہ کہ اس کا خاوند یہیں پر دفن تھا (وہ قدرتی منسوخی کے معاملے میں خاموش رہی تھی) اور یہ کہ پچھلے دس سالوں میں ہر یوم ارواح کے موقع پر وہ اور اس کا بیٹا یہاں آتے رہتے تھے۔

(۵)

"ہر سال؟" اس بیان نے اسے اداس کر دیا اور ایک بار پھر اس نے سوچا کہ ایک کینہ پرور دھوکا اس کے ساتھ کیا جاتا رہا تھا۔ جب وہ چھ سال پہلے آیا تھا تو اگر اس وقت وہ اس سے مل لیتا تو شاید اس کے لیے

ہر چیز کو چھپا محسوس ہوتا۔ تب اس پر عمر کی یہ چھاپ نہ ہوتی اور اس کے ظاہر کا پیٹا اس عورت سے مختلف نہ ہوتا، جس سے اس نے پندرہ سال پہلے محبت کی تھی۔ (ماضی اور حال) اس بعد کو اپنا نیا محسوس کرنا اس کے اختیار میں بالکل یک جیسا ہوتا لیکن اب وہ ایک ایسا انداز میں ایک دوسرے سے جدا معلوم ہوتے ہیں

اس نے اپنی کافی پی لی تو، تمیں کرنے لگی۔ اس نے اس جلے ہوئے رویے کا بالکل صحیح طور پر جائزہ لینے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے وہ اب دوسری بار اس سے دوچار ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں (جن کو اس نے پاؤڈر کی تہہ کے نیچے چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی) اس کی گردن پر بھی جھریاں تھیں (اونچا ہونے کی انھیں چھپانے سے قاصر تھی) اس کے کان بھی ڈھلکے ہوئے سے لگتے تھے۔ اس کے بال (لیکن یہ بھی خوب صورت ہی لگتے تھے) ان کا رنگ ہی بدلے ہوئے تھے تاہم اس کی توجہ زیادہ تر اس کے ہاتھوں نے اپنی طرف مبذول رکھی، (بدقسمتی سے ہاتھوں کو پاؤڈر کی تہہ یا کسی اور قسم کے میک اپ کے عمل سے چھپانا ناممکن تھا) جن پر نیلی رگوں کے گچھے یوں ابھرے ہوئے تھے کہ وہ کسی مرد کے ہاتھ لگ رہے تھے۔

اس کے اندر رحم اور غصے کے ملے جلے جذبات ابھرے اور اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ایک مدت سے متوقع ہوئی ہوئی اس کی اس ملاقات کو شراب میں ڈوبتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اس سے پوچھا کیا وہ کونیاک (ایک قسم کی فرانسیسی شراب) میں چوری چھپی رکھتی ہے۔ (پردے کے پیچھے موجود الماری میں اس کے پاس ایک کھلی بوتل رکھی ہوئی تھی۔) اس نے اسے جواب دیا کہ نہیں اور اسے یاد آیا سالوں پہلے بھی وہ شراب بالکل نہیں پیتی تھی کہ کتنی شراب اس سے توقع کیے جانے والے، اچھے آداب اور دوسروں کے ساتھ اچھے سلوک کو برقرار رکھنے اور جب اس نے اس کے ہاتھ کی اس موجودہ حالت کو دیکھا، جس کے ذریعے اس نے کونیاک کی چند گھونٹ منگوائی تھی، تو اس نے محسوس کیا کہ وہ حسن و جمال، جادو اور وقار جو اسے محظوظ کیا کرتا تھا، اس میں ویسے کا ویسا موجود تھا۔ اگرچہ وہ اب بڑھاپے کے نقاب کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور وہ ابھی تک من موہنا تھا، حتیٰ کہ وہ خود اس سے دوگنا طور پر دور جا چکا تھا

جب اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے اس سے دور ہو چکی تھی تو اسے وہ بہت قابل رحم محسوس ہوئی اور اس رحم نے اسے اس کے نزدیک کر دیا (وہ عورت جو کبھی اتنی خوش شخصیت کی مالک تھی کہ اس کے سامنے وہ گنگ ہو جاتا تھا) اور وہ اس کے ساتھ بھی گفتگو کرنا چاہتا تھا اور

اس شخص کی طرح، جس کی دل فریبی سے وہ نہیں بچنا چاہتا تھا، جو اپنے آپ کو پست محسوس کر رہا تھا اس نے بات شروع کی (اور یہ بے شک ایک لمبی گفتگو میں بدل گئی) اور آخر کار اسے ناامیدی کے ان حیوانات تک لے گئی، جو بعد میں اسے درپیش رہے تھے۔ فطری طور پر، وہ اس گہرے پن سے متعلق خاموش رہا جو کہ ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا (یا ایسے ہی تھا جیسے کہ اس (عورت) نے قبر کی منسوخی کے متعلق اختیار کر رکھی تھی) دوسری طرف، گہرے پن کی جگہ کے نظارے نے ظاہراً اس فلسفیانہ مقولے کے اثر کے تحت دیکھی قلب، میت کی صورت اختیار کر لی تھی کہ آدمی، جس انداز سے زندہ رہتا ہے، وقت اس سے زیادہ تیزی سے گزرتا ہے، اور یہ کہ زندگی بھی ایک ہے کیوں کہ اس کی ہر چیز لازمی طور پر اپنے انجام کی طرف گامزن رہتی ہے۔ اس نے ایسے ہی مقولوں کے متعلق صدا بلند کی، جن کے بارے میں وہ بھدروانہ جواب کا منتظر تھا لیکن وہ اسے نہیں ملا۔

"میں اس طرح کی گفتگو پسند نہیں کرتی۔" اس نے تقریباً جوشیلے انداز میں کہا: "جو کچھ تم اب تک کہتے رہے ہو خوف ناک حد تک سطحی ہے۔"

(۲)

وہ موت کے زیادہ ہو جانے یا مرنے کے متعلق باتیں پسند نہیں کرتی تھی کیوں کہ یہ جسمانی بدصورتی کے تصور کی حامل ہوتی تھیں اور اسے ناگوار گزرتی تھیں۔ نئی مواقع پر، مضطرب ہوتے ہوئے، اس نے اپنے میزبان کو بار بار کہا کہ اس کا غلط ظن تھا۔ بہرحال اس نے کہا کہ انسان محض ایک جسم ہونے سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے جو کہ ضائع ہو جاتا ہے، ایک شخص کا کام ہی حقیقت رکھتا ہے اور یہی وہ اپنے پیچھے دوسروں کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ اپنے اس خیال کی تائید اس کے لیے وہی کی چیز تھی اور یہ خیال سب سے پہلے اسے، آج سے پچیس سال پہلے اس وقت آیا تھا، جب اس نے اپنے سابقہ شوہر سے محبت کی تھی، جو کہ اس سے ایک سال بڑا تھا۔ اس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے اس کی عزت کرنا نہیں چھوڑا تھا (اس کی بے وفائیوں کے باوجود کہ جن کے متعلق وہ یا تو جانتی نہ تھی یا کچھ وہ جاننا ہی نہ چاہتا تھا) اور وہ اپنے آپ کو قائل کرنے کا جتن کرتی تھی کہ اس کے شوہر کی دانش اور راہبیت اس کے ماہ و سال کے بھاری بوجھ کو مکمل طور پر ختم کر دے گی۔

"کس قسم کا کام، میں تم سے پوچھتا ہوں؟ کس قسم کا کام ہم اپنے پیچھے چھوڑ کر جاتے ہیں؟" ایک تکلیف دہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے میزبان نے احتجاج کیا۔

وہ اپنے مرحوم شوہر کا ذکر کبھی نہیں کرتی تھی، اگرچہ اس چیز کی پابندی وہ پکا یقین رکھتی تھی، جس کی اس کے شوہر نے تکمیل کی تھی۔ اس لیے اس نے صرف اتنا کہا کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیتا ہے، جو کہ بجائے خود بہت معمولی ہو سکتا ہے، لیکن اس میں صرف اور صرف اس کی اہمیت ہی مدنظر ہوتی ہے۔ پھر وہ اپنی ذات کے متعلق باتیں کرنے لگی کہ کیسے وہ پراگ کے نواح میں ایک ثقافتی مرکز میں کام کرتی رہی تھی اور کیسے اس نے پوسٹ ریڈنگ اور لیکچرز کا اہتمام کیا تھا۔ اس نے (ایسے جوش کے ساتھ، جو اس کے "میدان" کے لیے غیر مناسب معلوم ہوتا تھا) لوگوں کے "شعور کو ارتقا دینے" کے متعلق "ذمہ داری" اور اس کے فوراً بعد اس نے تفصیل سے بیان کیا کہ ایک بیٹے کو پانا کتنا خوب صورت عمل تھا اور پھر اپنے حد درجہ خیال کو دیکھنا جو کہ ایک مرد کے (اس کا جیسا بالکل اسی کی طرح دکھائی دیتا تھا) جسم میں داخل ہوتے تھے اور یہ کہ ایک بیٹے کو ایک ماں سب کچھ دے سکتی ہے۔ یہ کتنی خوب صورت بات تھی اور پھر اسی ماں کا اپنی زندگی کے گوشۂ گمنامی میں چلے جانا۔

یہ پہلی تقریب نہیں تھی کہ اس نے اپنے بیٹے کے متعلق باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ یہ اس لیے تھا کہ اس کا جیسا سارا دن اس کے خیالوں میں رہا تھا۔ یہ قبرستان میں اس کی آج کی ناکامی کی ملامتی یاد آوری کی بنا پر تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ اس نے کسی مرد کو اپنے اوپر اپنی مرضی تھوپنے نہیں دی تھی لیکن اس کے اپنے بیٹے نے اسے مغلوب کر لیا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ کیسے قبرستان میں اس کی ناکامی نے آج سے سب سے بڑھ کر اتنا برہم کر دیا تھا کہ وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی اور اسے ڈر تھا کہ وہ اسے لعن طعن کرے گا۔ بے شک اسے بہت پہلے سے شبہ تھا کہ اس کا جیسا اپنے باپ کی یاد میں کوئی اس کی ماں قدر کرتی تھی، شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا (بہرحال یہ وہی تھا، جس نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ انھیں کسی بھی یوم روح پر قبرستان آنا نہیں بھولنا چاہیے) اور یہ عمل زیادہ تر اس کے مرحوم باپ کی محبت کی وجہ سے اتنا نہیں تھا جتنا کہ اس کی ماں کی، ان خواہشوں کو ضبط کرنے کی وجہ سے تھا، جو ایک بیوہ کے لیے ایک مناسب حد تجویز کرتی تھیں۔ یہ ایسا ہی تھا کہ جس کے متعلق اس نے کبھی کچھ کہا نہیں تھا اور اس نے (بغیر کامیابی کے) اسے جاننے کی کوشش نہیں کی، یہ خیال کہ اس کی ماں اب بھی جنسی زندگی کی حامل ہو سکتی ہے، اسے متنفر کرتا تھا۔ وہ ہر چیز، جو اس میں جنسی جذبے سے موجود تھی (کم سے کم وہ جو ممکنات اور موقع کی شکل میں موجود تھی) وہ اس کے لیے کراہت آمیز تھی۔ اس کے نزدیک جنسی خواہشیں جوانی کے خیالات سے منسلک تھیں۔ وہ اس بات کو ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا جو ابھی تک اس میں جوانی

کے حوالے سے موجود تھی۔ اب وہ بچہ نہیں رہا تھا اور اس کی ماں کی جوانی (یہ اس کی مادرانہ نگہداشت کی تھی سے مشترک تھی) غیر رضامندانہ طور پر اس کے لڑکیوں کے ساتھ تعلقات میں مزاحم تھی، جنھوں نے اب اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ وہ اپنی ماں کو پانا چاہتا تھا۔ اپنی ایسی ہی ماں کے پیار و محبت کے قدر کو کیا وہ ہے کا ور کیا ایسی ہی ماں کو وہ پسند کرے گا۔ اور بعض اوقات اس نے محسوس کیا کہ اس طرح وہ اسے قبر کی طرف دھکیل رہا تھا۔ آخر اس نے اس کے آگے ہار مان لی (اس کے ابھی تک تاب نہ لاتے ہوئے) اور یہ کہ اس نے شروع انداز میں مطیع ہو جانے کا تصور کیا کہ اب صحیح معنوں میں اس کی زندگی کی خوب صورتی، خاموشی سے ایک دوسری زندگی کے سائے میں داخل ہو جانے پر مشتمل تھی۔ اس تصور کے نام پر (جس کے بغیر، اس کے چہرے کی جھریوں نے بہرحال اسے کتنی زیادہ بے سکون کر دیا ہوتا) اس نے ایک غیر متوقع گرم جوشی کے ساتھ، اس جھگڑے کو اپنے میزبان کے ساتھ حل کرنے کا اہتمام کیا۔

لیکن وہ اچانک اس چھوٹی سی میز پر، جو ان کے درمیان حائل تھی، جھک گیا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور کہا "میں اپنی بک بک پر معافی چاہتا ہوں۔ تم جانتی ہو۔ میں ہمیشہ سے احمق ہی رہا ہوں۔"

(۷)

اس جھگڑے نے اسے مشتعل نہیں کیا جب کہ اس کے برعکس اس سے ملنے والی نے، اس کے متعلق اپنی شناخت کی دوبارہ سے تصدیق کی۔ اس کی قولی گفتگو کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے (سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ برے ذوق اور بدصورتی کے خلاف احتجاج نہیں تھا) اس نے تسلیم کیا کہ وہ ایک دیانتدار تھا، جس کو وہ پہلے سے جانتا تھا۔ پس اس کی سابقہ ظاہری صورت اور اس کی پرانی کہانی نے اس کے خیالات کو بیدار سے زیادہ بیدار کر دیا۔ اب وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ وہ شخص نہ ہو، جو اس کی گفتگو کے لیے موزوں تھا، تباہ نہ ہو (اس لیے، اس نے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا اور اپنے آپ کو ایک احمق کہا تھا) اور وہ اسے اس چیز کے متعلق بتانا چاہتا تھا، جو اس وقت اسے سب سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی یعنی اس کی مشکل کی بابت کیوں کہ وہ اس بات کا قائل تھا کہ اس کے ساتھ تعلق میں اس کے تجربے میں ایک بہت خاص چیز آ گئی تھی جس پر وہ شک نہیں کر سکتی تھی اور جس کو وہ اکیلا ہی (اگر وہ کوشش کرے تو) الفاظ کی شکل میں ڈھال سکتا تھا۔

اسے اب یاد نہیں تھا کہ وہ کب ملے تھے۔ ظاہری طور پر، وہ بعض اوقات اس کے طلب علم

داستوں کے توسط سے ملتی تھی، لیکن اسے صحیح طور پر، پرانگ کا دوراستے سے بہت مختلف موجود کیسے یاد تھی
جہاں وہ پہلے پہل اکیلے میں ہم ملے تھے۔ وہ اس کے سامنے ایک مخملی وشع والے صوفے میں بیٹھی تھی، وہ
اداس اور خاموش تھی، لیکن ساتھ ہی وہ اس کے اپنے متعلق موافق رویے پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا
اس نے بمشکل یہ تصور کرنے کی کوشش کی (ان خیالات کو پورا کرنے کی امید کی جرأت کے بغیر) کہ
جب وہ اسے چومے گا، اسے پیار کرے گا اور اس کے ساتھ محبت کے عمل میں مصروف ہوگا تو وہ
اسے کیسی لگے گی؟ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یہاں وہاں پر تھوڑی سی تاثر تھی۔ وہ متواتر اسے خاموشی اور
شرافت سے دیکھے جا رہی تھی۔ اور وہ (حتیٰ کہ اس کی مستقل مزاجی کے ساتھ کی گئی کوششوں کے ساتھ)
جسمانی و ذہنی کے ظاہری پن کو محسوس کر رہا تھا۔ عورت نے مکمل طور پر اس کے تصور کا فائدہ لیا۔

وہ یہ وہ صورت حال تھی جو اس کی زندگی میں دہرائی نہیں گئی تھی۔ اس موقع پر وہ بے تصوری
کے آمنے سامنے موجود تھا۔ ظاہر اور وہ ایک ایسے مختصر وقت سے گزر رہا تھا (ایک جنتی وقت) جب تصور کے
تجربے سے یہ نہیں ہو جا سکتا۔ اس نے ایک راہ اختیار نہیں کی تھی، وہ بہت کم جانتا ہے لیکن یہ جانتا ہے
کہ اس تھوڑے کو کیسے کرنا ہے کہ لاتصوریت اب بھی موجود رہتی ہے اور اس قیاس کو حقیقت میں تبدیل ہونا
چاہیے (تصور کی کمی کے بغیر، قیاسات پر غور کے بغیر) ایک شخص خوف اور سر کے چکر میں مبتلا ہو سکتا
ہے۔ یہ سر کا چکر حقیقتاً اس پر حاوی ہو سکتا ہے جب کہ آئندہ دن کی ملاقاتوں کے بعد، جن کے دوران
میں اس نے کچھ بھی حل نہ کیا۔ اس نے اس تفصیل کے ساتھ اس کی خواب گاہ میں موجود سنوڈن رہ کے
متعلق بے مطلب تجسس کے ساتھ پوچھا کیوں کہ جلد ہی وہ اسے خود وہاں مدعو کرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔

وہ اس خواب گاہ میں ایک طالب علم کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے کا حصے دار تھا جس
نے رم کے ایک کلاس کے عوض آدھی رات کے بعد تک واپس نہ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ آج اس کے بستر
پر نہیں تھا۔ تھوڑی گنجائش رکھتا تھا۔ وہاں پر دو دھاتی چارپائیاں، دو کرسیاں، ایک الماری، ایک لیمپ
بغیر شیڈ کے بغیر روشنی والا بلب اور ایک خوف میں مبتلا کرنے والی بے ترتیبی تھی۔ اس نے کمرے کی صفائی
کی ورسا ہے (یہ اس کی شائستگی تھی کہ وہ حسب عادت وقت پر پہنچی تھی) اس نے دروازے پر دستک
دی۔ یہ ستمبر کا مہینہ تھا اور بتدریج اندھیرا ہونا شروع ہوا تھا۔ وہ ایک چارپائی کے کنارے پر ٹک گئے اور
انھوں نے ایک دوسرے کو چوما۔ اب اندھیرا کچھ مزید بڑھ گیا اور وہ کمرے میں روشنی کرنا چاہتا تھا
کیوں کہ وہ خوش تھا کہ اسے دیکھ جا سکتا تھا اور اسے امید تھی کہ اندھیرا اسے اس خواہش سے بچائے گا

جو کہ اس کے سامنے بے لباس ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی (اگر وہ جانتا ہوتا کہ کس طرح عورت کے بلاؤز کے بٹن کو کھولا جا سکتا تھا تو ایسے میں جذباتی طور پر جلد باری سے وہ شاید وہ بھی بے لباس ہو سکتا تھا) اس لمحے بہر حال اس نے اس کا پہلا بٹن کھولنے کی کافی دیر تک جرأت نہ کی تو اس کا ایسے کا جیسے بے لباس وغیرہ سے جدا کرنے کے شہوانی معاملے کا طریقہ کار کسی قدر زوق سے پر اور شاندار ہونا چاہیے اور اس کے متعلق وہی مراد جانتے تھے، جو تجربہ کار تھے اور وہ اپنی علمی کی بنا پر ناکام ہونے سے ڈرتا تھا کہ کہیں آخر میں وہ خود ہی خطرے ہو کر نہ کہہ دے "کیا مجھے اس زوجہ کا اتار نہیں دینا چاہیے؟" اس نے بے لباس ہونا شروع کیا۔ اس وقت اندھیرا تھا، تاہم اس نے صرف اس کی حرکات کے سایوں کو دیکھا تھا۔ اس نے جلدی سے خود کو بھی بے لباس کیا اور کسی حد تک اس وقت اتنا (یہ اس عورت کے جسم کی وجہ سے تھا) حاصل کیا جب انھوں نے محبت کے عمل میں خود کو مصروف کر لیا تھا۔ اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن اندھیرے میں اس کے اظہار کے حصے کے پن نے اس سے مکمل طور پر مرکز پانی لقیاری ورتی کہ وہ اس کے خدوخال وغیرہ کوئی شکل نہ دے سکا۔ اسے افسوس ہوا کہ اس وقت اندھیرا تھا لیکن یہ ممکن محسوس ہوا کہ وہ اس کے پاس سے اٹھ کر دروازے کے قریب نصب بجلی کے سوئچ کو آن کرے۔ جس وہ بے سوچے سمجھے اپنی آنکھوں پر بوجھ ڈالتا رہا لیکن وہ اسے نہ پہچان سکا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی اور سے، کسی نقلی وجود سے، کسی بالکل غیر حقیقی اور غیر وجودی، وجود سے محبت کرنے کے عمل میں مصروف رہا تھا۔

تب وہ اس کے اوپر آ گئی (لیکن اس وقت ہی اس نے اس کے اونچے سائے کو دیکھا) اور اس نے اپنے کو بچے کو سمجھاتے ہوئے دبے لہجے میں، سرگوشی کے انداز میں چھو کہا۔ اور یہ واضح نہ تھا کہ وہ اپنے آپ سے کچھ کہہ رہی تھی یا اس سے کوئی بات کر رہی تھی۔ وہ الفاظ کو نہ سمجھ سکا اور نہ یہ اس نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ وہ اس سے دوبارہ مکمل کیف ہوا تو وہ مسلسل سرگوشیاں کرتی رہی تھی۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔

(۸)

وہ اپنے میزبان کو سنتی رہی اور ان تمام تفاصیل میں ڈوبی رہی جن کو وہ ایک عرصے سے بھول چکی تھی۔ مثال کے طور پر، وہ ان دنوں ایک زرد پیلا سرسوٹ پہنا کرتی تھی، جس میں لوگوں کے نزدیک وہ ایک لازوال فرشتہ لگتی تھی (ہاں، اس کو وہ سوٹ یاد آ گیا) وہ اپنے بالوں میں ایک بڑی سی ماتھی

وانت کی بنی ہوئی کنگھی اس کے رکھتی تھی جو لوگوں کے درمیان اسے پرانے فیشن کی رعب دار چھب میں
کرتی تھی۔ پینے میں وہ ہمیشہ چائے کے ساتھ رم کا آرڈر دیتی تھی (یہ اس کا واحد الحلک متبادل تھا) اور
یہ خیالات اسے خوش کر رہے تھے۔ قبرستان سے دور لے گئے۔ اس کے دکھتے ہوئے پاؤں اور اس بیٹے
کی ملامت بھری آنکھوں سے بھی دور لے گئے۔ اس نے سوچا، اس کے ذہن میں چمک سی پیدا ہوئی،
اس کو مدنظر رکھے بغیر کہ آج وہ بیٹی تھی مگر اس کی جوانی کا تھوڑا سا حصہ بھی اس شخص میں ابھی تک قائم
ہے تو اس نے بے سود زندگی نہیں گزاری تھی۔ فوری طور پر اس کے اثبات کی دوبارہ تائید کے طور پر ایک
خیال اس کے ذہن میں آیا کہ ایک آدمی کی قدر و قیمت اس میں ہے کہ وہ کہاں تک اپنی قابلیت خود اپنی
ذات سے آگے بڑھا سکتا ہے، وہ کہاں تک اپنی حد سے ماورا جا سکتا ہے اور وہ کہاں تک اپنے وجود کو اپنے
لیے اور دوسروں کے لیے برقرار رکھ سکتا ہے۔

اس نے اسے سنا اور وقتاً فوقتاً اس نے اس کے ہاتھ کو تھپکا تو اس نے اسے ایسا کرنے سے
نہیں روکا۔ یہ تھپکنا گفتگو کے سنوں دینے والے انداز میں مدغم ہو گیا اور اس کے متعلق ایک ناممکن ضبط
میں داخل ہو گیا۔ (یہ اشارہ کس کی طرف تھا) عورت کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ وہ کس کے متعلق بات کر رہا تھا
اور کس وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ بہر حال وہ اس آدمی کو پسند کرتی تھی، جو اس کی ناز برداری کر رہا تھا، حتیٰ کہ اس
نے اپنے آپ سے کہا کہ وہ اسے، اس کے پندرہ سال پہلے کی جوانی سے زیادہ بہتر طور پر پسند کرتی ہے۔
جس کا لڑکپن اگر اسے صحیح طور پر یاد تھا تو وہ کسی حد تک تکلیف دہ تھا۔

جب وہ اپنے حساب سے اس مقام تک جا پہنچا، جہاں اس کا متحرک سایہ اس کے اوپر اٹھا
ہوا تھا اور اس نے اس کی سرگوشی کو سمجھنے کی ناکام کوشش کی تھی، تو ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گیا اور
(ممکن ہے طور پر جب وہ حافظہ جان لے گا تو کئی سالوں کے بعد انھیں ایک بھولے ہوئے راز کی طرح
اسے یاد دلائے گا) اس نے نرمی سے پوچھا "اور تب میں کیا کر رہی تھی؟"

(۹)

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے جواب دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ اس لمحے اس نے نہ صرف یہ کہ
اس کے تصورات سے بچنے کی کوشش کی تھی بل کہ اس کے ادراک سے بھی گریز کیا۔ اس نے اس کی آواز
اور شکل کو دیکھنے سے بھی گریز کیا۔ جب اس نے خواب گاہ کا سوئچ دبا کر روشنی کی تو وہ پہلے ہی لباس پہن
چکی تھی۔ اس کے متعلق ہر چیز ایک بار پھر پہلی جیسی، کسی اور مکمل تھی اور اس نے بے سود طور پر روشنی میں

موجود اس کے چہرے اور اندھیرے میں موجود اس کے چہرے کے درمیان فرق کرنے کی کوشش کی۔ وہ ابھی حد نہیں ہوئے تھے لیکن اس نے اسے ابھی سے پہچاننے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس نے قیاس کرنا شروع کیا کہ اس کا (دھانی دیے ہوئے) چہرہ اور (دھانی دیے ہوئے) جسم کیسے دکھتا ہوگا جب کہ وہ آپس میں کچھ دیر پہلے محبت میں الجھے ہوئے تھے لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ وہ اب بھی اس کے تصور کو دماغ میں نہیں لا رہی تھی۔

اس نے سوچا کہ اسے، گلی کی روشنی میں، اس کے ساتھ محبت کرنی چاہیے لیکن وہاں اگلی ورتھی ہی نہیں۔ اس دن کے بعد سے عورت نے چاہے کتنی ہی مرتبہ اسے نظر انداز کیا۔ وہ بالکل ناکام رہا لیکن یہ واضح نہیں تھا کہ کیوں۔ انھوں نے یقینی طور پر خوب صورتی سے محبت کی تھی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے لیے یہ کام مشکل ہی تھا اور اسے اس پر شرمندگی تھی۔ وہ اب اس کی نظر اندازی کے حوالے سے خود کو مستحق شدہ سمجھ رہا تھا اور اس نے اس کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"مجھے بتاؤ کہ اس وقت تم نے مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

"میں تم سے معذرت چاہتی ہوں۔" اس نے نرم ترین لہجے میں کہا "یہ سب کچھ اتنا عرصہ پہلے ہوا تھا کہ میں نہیں جانتی۔ اور جب اس نے اس پر مزید دباؤ ڈالا تو اس نے احتجاجاً کہا "ہمیں ہمیشہ ماضی میں واپس نہیں جانا چاہیے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ ہم کو اپنی مرضی کے بغیر اتنا بہت سا وقت قربان کرنا پڑتا ہے"۔ اس نے یہ صرف اس کی ضد کو پورا کرنے کے لیے کہا۔ (اور شاید اس کی قوت بیان والی صبح کی ملاقات کے حوالے سے ایک ہلکی سی آہ کے ساتھ اس کا ادا کیا یہ آخری جملہ تھا) لیکن اس نے اس کے بیان کو مختلف انداز سے سمجھا۔ اس کے لیے یہ حقیقت ایک شدید اور بے مقصد وضاحت کے طور پر (یہ خاص چیز) تھی کہ یہ دو عورتیں نہیں تھیں (ایک ماضی اور ایک حال کی) بلکہ یہ صرف ایک تھی اور وہی عورت تھی اور جس نے اسے آج سے پندرہ سال پہلے نظر انداز کیا تھا وہ اب یہاں موجود تھی اور اس سے ایک ہاتھ کی دوری پر تھی۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ حال زیادہ اہم ہے۔" اس نے ایک بامعنی انداز میں کہا اور دل و جان سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے اوپر کھلے منہ کے ساتھ مسکرا رہی تھی اور اس نے اس کے دانتوں کی جھلک دیکھی۔ عین اس وقت ایک یاد اس کے ذہن میں در آئی، جب خواب گاہ میں اس نے اپنی انگلیاں اس کے منہ میں ڈال دی تھیں تو اس نے اسے اس وقت تک کاٹا تھا جب تک کہ اسے

درد محسوس نہیں ہو رہا تھا اور وہ اب یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے اوپر کے دو دانتوں کی چوٹیاں اوپری طرف کے تمام دانت موجود نہیں تھے (اس بات نے اسے اس وقت افسردہ کیا تھا کیوں کہ اس کا یہ معمولی عیب عمر کی علامت تھا جو اسے پرجوش انداز میں اپنی طرف کھینچتی تھی) لیکن اب اس کے دانتوں کے درمیان کے خلا کو دیکھتے ہوئے اور اس کے منہ کے کونے میں جھانکتے ہوئے اسے لگا کہ اس کے دانت تیز نکیلے طور پر سفید تھے اور کوئی بھی نہیں تھا اس نے اس پر قبضہ جاری کر دیا۔ دونوں تصورات دوبارہ جمع ہو گئے لیکن وہ اس کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ وہ ان دونوں کو طاقت اور سختی سے باہر کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے کہا "کیا تم حقیقت میں کوئی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کر رہیں؟" جب اس نے خوش کن مسکراہٹ اور تھوڑی سی اوپر اٹھی ہوئی بھنوؤں کے ساتھ اپنے سر کو حرکت دی تو وہ پردے کے پیچھے تھک گیا۔ اس نے بوتل اٹھائی۔ اپنے ہونٹوں سے لگائی اور اسے غٹ غٹ پینے لگا۔ جب اس پر پتہ چلا کہ وہ اس کے اس حصہ عمل کو اس کی سانسوں کے ساتھ چاٹ گئی ہے۔ پھر اس نے دو چھوٹے گلاس اور بوتل اٹھائی اور انہیں کمرے میں لے آیا۔ ایک بار عورت نے اپنا سر ہلایا "کم از کم علامتی طور پر سہی" اس نے کہا اور دونوں گلاسوں کو بھر دیا۔ اس نے اس کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ "ماں کے حوالے سے تم سے باتیں کرتے ہوئے" اس نے اپنے جام کو گھونٹ سے کم کیا۔ عورت نے اپنے ہونٹوں کو چاٹ لیا۔ اس نے عورت کی کرسی کے بازو پر اپنے کو جما دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

(۱۰)

جب وہ اس کے پیچھے اپارٹمنٹ میں گئی تھی تو اسے شبہ نہیں تھا کہ وہ وہاں اس قسم کی دوستی کو پالے گی اور تقریباً وہ خوف زدہ ہو گئی تھی جیسے کہ یہ سب کچھ، جو پیش آیا تھا، وہ اس کے لیے تیار تھی۔ (وہ مسلسل تیاری جس سے ایک پختہ کار عورت واقف ہوتی ہے، وہ بہت پہلے کھو چکی تھی) (شاید ہمیں اس خوف کے رشتے کو ایک نوجوان لڑکی کے خوف میں ڈھونڈنا چاہیے، جس کو پہلی بار چھوا گیا ہو اور جس کے لیے ڈرتی بھی تو توقع کرتی ہو اور وہ اس کے لیے تیار تھی یعنی یہ کہ "اب نہیں اور ابھی نہیں" یہ پراسرار طور پر آپس میں جڑے ہوئے تھے، جیسے کہ بڑھاپے کے تجسس اور بچپن کا آپس میں تعلق ہوتا ہے) جب اس نے اسے کرسی کے بازو سے کاؤچ پر منتقل کیا، اس کے ساتھ بعض گیر ہوا اور اس کے پورے جسم پر ہاتھ پھیرا اور اس کے بازوؤں میں عورت نے خود کو عاشقانہ طور پر نرم محسوس کیا (ہاں، نرم، کیوں کہ اس کے جسم نے لمحوں پہلے اس شہوت کو کھو دیا تھا جو کہ ایک وقت میں اس پر غالب تھی، وہ

شہوت جو فوری طور پر اس کے پٹھوں کے سکڑنے اور پھیلنے کے سرور کو مستقل کر دیتی تھی اور اسے سینکڑوں نازک تحریکات کی مستی سے بھر دیتی تھی۔

بہر حال خوف کے لمحات جلد ہی اس کی باہوں میں آ کر پگھل گئے تھے اور حالاں کہ اب وہ ایک پختہ کار خوب صورت خاتون کے طور پر جیسے کہ وہ لگ رہی تھی، بہت دور جا چکی تھی اور اب اس وقت اس نے تقریباً فوراً اپنی اس سابقہ شخصیت کو پا لیا تھا۔ اس نے اپنے محسوسات کو دوبارہ پا لیا۔ اس نے اپنی جوش مندی کی پھر سے پوری اور ایک بار پھر اس نے ایک عاشق مزاج عورت کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور یہ وہ اعتماد تھا، جس کو وہ ایک عرصے سے محسوس نہیں کر سکی تھی۔ اس لیے اس نے اسے پہلے والے اعتماد سے بہت بڑھ کر پایا۔ اس کا جسم جو تھوڑی دیر پہلے دام میں آیا ہوا، خطرے میں گھرا ہوا، بے مزاحمت تھا، اب پھر سے زندہ ہو گیا تھا اور اب وہ خود بار بار داری سے جواب دے رہی تھی اور اس نے اس چوما چاٹی کی مہارت اور گرمی کو محسوس کر لیا تھا اور اس نے اسے تسکین بخشی تھی۔ یہ پیار، جیسا کہ اس نے اپنا چاہا اس کے جسم میں سمو دیا تھا، وہ بارک جوش، جس کے ساتھ اس کے جسم نے اس کی نقل گیری کا جواب دیا تھا اس کو اس سب کو سی لیکی چیز کی طرح محسوس نہیں ہوا تھا کہ جیسے وہ محض متاثر کر رہی تھی بل کہ یہ ایسا تھا کہ جیسے وہ جانتی تھی کہ اسے کیسے کرنا چاہیے اور جیسے کہ وہ اب اس کی انکساری سے سراہا جا رہی تھی۔ لیکن ایک ضروری چیز کے طور پر، جس کا وہ مسرت اور جوش کے ساتھ خود ایک حصہ تھی جیسے وہ اس کا وطن ہو (وہ ایک خوب صورتی کی حامل سرزمین) اور جہاں سے اسے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور جہاں وہ اب کامیابی کے ساتھ لوٹ آئی تھی۔

اس کا بیٹا اب بے تحاشا دوڑی پر تھا۔ جب اس کے میزبان نے اسے، اس کے ذہن کے ایک کونے سے، چپ لیا تھا تو اس نے اپنے بیٹے کو دیکھا تھا، جو اسے خطرے سے آگاہ کر رہا تھا لیکن پھر وہ جلد ہی غائب ہو گیا۔ اب وہاں صرف وہ تھی اور وہ مرد تھا، جو اسے سہلا رہا تھا اور اسے گلے لگا رہا تھا۔ لیکن جب اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھے اور اپنی زبان کی مدد سے اس کا منہ کھولنا چاہا تھا تو ہر چیز اچانک ختم ہو گئی، وہ جاگ پڑی۔ اس نے سختی سے اپنے دانتوں کو جکڑ لیا (اس نے سوادکی تلخ اجنبیت کا تصور کیا، جو اس کے منہ کے اوپری حصے پر باؤلے والے تھا اور اس کے منہ کو بھر دیے والا تھا) اور اس نے خود کو اس کے سپرد نہ کیا۔ جب اس نے نرمی سے اسے پرے کیا اور کہا: "نہیں، بالکل نہیں تمھاری مہربانی، میں یہ نہیں کر سکوں گی۔" جب اس نے اصرار کیا تو اس نے اسے، اس کے دونوں

ہاتھوں کی کلائیوں سے پکڑ لیا اور اپنے انکار کو دہرایا۔ پھر اس نے کہا (اس کے لیے بولنا مشکل تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اسے بولنا چاہیے کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ جو اس کو وہ دے رہی تھی اسے ماننا چاہیے) کیوں کہ اب تمھیں محبت کرنے کے حوالے سے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے اسے اپنی مرضی دے دی، اگر انھوں نے محبت کا عمل کیا تو وہ اس سے نہ محبت محسوس کرے گا اور وہ اس کے لیے خود کو بدبخت محسوس کرے گی کیوں کہ جو کچھ اس نے ان دونوں کے تعلق بتایا تھا وہ اس کے لیے زیادہ خوب صورت اور اہم تھا۔ اس کا جسم ویران اور فنا پذیر تھا لیکن وہ اب جانتی تھی اس میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جو کہ غیر مادی تھی، اس وقت کی طرح جو ایک ستارے کے جل جانے کے بعد بھی خود کو قائم رکھتی ہے۔ اگر وہ بوڑھی ہو رہی ہے تو اس میں کیا حرج ہے کہ اس کی جوانی کسی کے اندر اس طرح بالکل محفوظ ہے۔ "تم نے خود ہی اپنے آپ میں مجھ سے یہ ایک یادگار تخلیق کرنی ہے۔ میں اسے تباہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گی، مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ اسے خود سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ "نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے۔ نہیں، یہ نہ کرو۔"

(II)

اس نے اسے یقین دلایا کہ وہ اب بھی خوب صورت ہے اور یہ کہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں بدلا، کہ ایک انسان ہمیشہ ویسا ہی رہتا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اسے دھوکہ دے رہا ہے اور عورت کا موقف صحیح تھا۔ بہر حال وہ اپنی عمر اور جسمانی حساسیت اور عورت کے جسم کے یہ ان محبوب کے متعلق اپنی بڑھتی ہوئی مارک پسندی سے بہ خوبی آگاہ تھا، جس نے اس جیسے سالوں میں اسے سدا بہار نوجوان بنا دیا تھا اور اسی سے، یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ اس نے ہمیشہ عورتوں کو جانا اور احمق محسوس کیا تھا۔ ہاں، اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اگر اس نے اسے محبت کرنے پر آمادہ کیا تو اس کا انتقام فطرت پر ہوگا اور یہ فطرت نہ صرف یہ کہ اس کے حال پر کیچڑ اچھالے گی بل کہ گزرے وقت میں اس کی اس محبوبہ عورت کے تصور کو بھی داغ دار کر دے گی، ایک ایسا تصور جو کہ اس کی یادداشت میں ایک موتی کی طرح موجود تھا۔

یہ سب کچھ صحیح تھا لیکن یہ محض دانش مندی تھی اور یہ دانش خواہش کے سامنے کچھ نہیں تھی۔ خواہش جو صرف اس عورت کو جانتی تھی جو اس کے لیے پورے پندرہ سال تک ناقابل حصول اور گریز پا رہی تھی اور یہاں موجود تھی۔ آخر کار وہ اسے دن کی روشنی میں دیکھ سکتا تھا اور جس کے آج کے جسم کے بارے میں وہ ادراک کر سکتا تھا کہ وہ جسم کیسا رہا تھا اور اس کے چہرے سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کا چہرہ پہلے کیسا لگتا تھا۔ بالآخر وہ اس کے (غیر تصوراتی) محبت کرنے کے انداز کو شناخت کر سکتا تھا،

اس کی حرکات وسکنات اور پھر اس شہوت کو بھی۔

اس نے اس کے کندھوں کے گرد اپنے بازو گزار دیے اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میرے ساتھ مزاحمت نہ کرو۔ مجھے رونا نہیں چاہیے۔"

(۱۴)

اس نے انکار میں سر ہلایا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اسے انکار کرنا حماقت نہیں ہے۔ وہ مردوں کو جانتی تھی اور عورت کے جسم تک ان کی رسائی کو بھی سمجھتی تھی۔ وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ محبت کے عمل میں، جسمانی سطح کی خوفناک بیادبی ہمیت کے تیش نظر، پرجوش اصول پرستی سے بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ سچ ہے کہ وہ اب بھی ایک خوب صورت جسم کی مالک تھی جو ابھی تک اپنی اصل خوش اندامی کے ساتھ محفوظ تھا اور خاص طور پر وہ اپنے پیروں میں بالکل جوان لگتی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بے باس ہوئی تو اس طرح اس کی کمر کی جھریاں عیاں ہو جائیں گی، اس کے سامنے پھیلے ہوئے گوشت کی وجہ سے اس کے پیٹ پر موجود زخم کا نشان بھی دکھائی دے گا اور اس کے جھورے بال بھی نظر آئیں گے۔ وہ اپنے سر کے جھورے بالوں کی وجہ سے شرمندہ نہیں تھی لیکن وہ اپنے جسم کے مرکزی حصے کے بالوں کی وجہ سے شرم سار تھی، یہ اس کے ساتھ ایک معقول امتیازی نشان کے طور پر موجود تھے۔

اور اپنی موجودہ جسمانی ظاہری حالت کے شعوری بنا پر، جسے اس نے تھوڑی دیر پہلے جلا دیا تھا وہ اپنے آپ میں واپس آ گئی، تب اس کے لہجے نے (اب تک یہ کمزور سے اس کی زندگی سے بھی زیادہ محفوظ محسوس ہوتا تھا) نیچے گلی میں موجود صبح کی پریشانیوں نے اپنا سر ابھارا۔ انھوں نے سارے کمرے کو بھر دیا تھا، وہ شیشے کے پیچھے اس کے نقوش کو روشن کر رہے تھے، کرسی کے بازوؤں پر، میز پر، کافی کے خالی کپ پر اور اس کے بیٹے کے چہرے پر اس کے جلوس کا تسلط تھا۔ جب اس نے انھیں دیکھا تو اسے شرم آ گئی اور اپنے آپ میں نہیں جا چھپی۔ اتفاقاً انداز میں، وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی، جہاں سے وہ اس راستے کو، جسے اس نے چنا تھا، نیچے کی خواہش کر رہی تھی، جس پر وہ اب تک مسکراہٹ اور پرجوش انداز کے ساتھ محو سفر رہی تھی۔ وہ وہاں پر تھی (کم از کم ایک لمحے کے لیے) جہاں وہ چھپنا چاہتی تھی اور اب ذمہ داری ہے، اسے واپس ہو جانا چاہیے تھا، یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ صرف یہی راستہ اس کے لیے مناسب تھا۔ اس کے لیے کافی واضح تھا۔ آمیز تھا کہ شرم سے اس نے اس وقت اس کے سامنے خود کو چھوٹا اور چھوٹا ہوتے ہوئے حالت میں تھا۔ جو محسوس کیا، وہ اپنے پیٹ پر موجود زخم کے نشان

میں تبدیل ہو گئی

اس کے میزبان نے اسے کندھوں سے پکڑا ہوا تھا اور اس نے ایک بار پھر کہا "یہ تمہارے لیے نامعقول بات ہے کہ تم میرے ساتھ مزاحمت کرو" اور اس نے اپنا سر ہلایا۔ لیکن بالکل ایک مشکل طریقے سے، جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی، وہ اس کا میزبان نہیں تھا، بل کہ یہ اس کے اٹھن بیٹھے کے چہرے پر نظر آنے والے اس کی پتی جوانی کے حدوخال تھے، جس کے بہت ہی چھوٹے پن سے اسے نفرت تھی اور اس نے خود کو بہت ریدہ دل ہوتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے اسے تسلسل شدہ قہر کے متعلق، اس پر الزام لگاتے ہوئے پایا اور اب اس کی یادداشت کے منتشار کے ذریعے، ایک جملہ اس کے منہ سے نکلا جو غصے میں آ کر اس نے اس کے منہ پر مارا۔ "تمہیں سچے ہوا نے مردوں کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے۔"

(۱۴)

اسے ابھی شک نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اصل میں ایک خواب کے ساتھ ختم ہو گا۔ تاہم وہ کچھ بھی (ایک تلاش کرتی اور تھکی ہوئی نظر) ایک یقینی خواب محسوس کرانے لگے اس کو اپنی شکل نہیں دکھا سکتا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کے برعکس، اس نے اسے جوش دلایا اور اس پر اسے کسی کو جیسے وہ کسی ہی نفرت کی خواہش رکھتا تھا۔ آخر کار، اس کے جسم پر حملے کی خواہش، جس کو جاننے کی اسے ایک عرصے سے اجازت نہیں دی گئی تھی، فوری طور پر اسے پر حملے کی سلسلہ وار خواہش میں گھل مل گئی تھی۔

یہ کیسے ہوا تھا؟ کیا اس نے اسے محسوس کیا تھا یا نہیں کہ ایک منفرد موقع وہاں موجود تھا۔ اس کی ملاقاتی جس چیز کے لیے تیار تھی، جو اس کے پاس نہیں تھی۔ اس نے وہ سب کچھ نظر انداز کر دیا تھا، جس کی غیر موجودگی کی وجہ سے جو کچھ کہ ناقابل برداشت تھا، وہ اس کی نفرت سے بچ نکلا تھا یعنی اس کی موجودہ عمر، اس کے گرتے بال اور اس ہوس ناک انداز کا کمتر میزان۔ اور وہ، پتا نہیں اس نے اس کو محسوس کیا تھا یا محض مبہم طور پر، اس کو مشکوک سمجھا تھا، اب اپنی ان خوشیوں کو برہنہ کر سکتا تھا (صحیح طور پر وہ کیفیات ہی تھیں کہ جنھوں نے اس کی زندگی کو تاریک تھیں اور بے رونق بنا رکھا تھا) وہ یہ ظاہر کر سکتا تھا کہ وہ بے قیمت نہیں یعنی یہ کہ صرف وہ اظہارات تھے، جن کا انجام تباہی تھا کہ وہ بجائے خود دھول کے مانند تھے وہ انتقام لے سکتا تھا، ان کی تذلیل کر کے۔

"مزاحمت مت کرو" اس نے کچھ کہا اور اسے اپنے قریب کرنے کی کوشش کی۔

اس نے اب بھی اپنے سامنے اپنے بیٹے کا تمسخر اڑانے والا چہرہ دیکھا اور اب جب اس کے میزبان نے اسے زور سے اپنی طرف کھینچا تو اس نے کہا "مہربانی کر کے مجھے ایک لمحے کے لیے تنہا چھوڑ دو۔" اور اس نے اپنے آپ کو اس کی مضبوط گیری سے آزاد کیا۔ جو کچھ اس کے دماغ میں چل رہا تھا، وہ اس کو بیان نہیں کر سکتی تھی۔ پرانے مردوں کو نئے مردوں کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے اور یہ بات اچھی نہیں ہوتی۔ اور اس کی یاد، جو اس کے پہلو میں موجود اس آدمی نے اسے پندرہ سال پہلے اپنے خیالات میں عزت دی تھی، اچھی نہیں تھی اور اس کے شوہر کی یاد اچھی نہیں تھی اور یہاں میرے بیٹے۔ یہ تمام یادیں اچھی نہیں تھیں۔ اس نے اپنے من میں اپنے بیٹے سے کہا۔ اس نے استقامت سے بھرپور خوشی کے ساتھ اس کے کھلے ہوئے خوش والے چہرے کی طرف دیکھا اور اسے چیختے ہوئے سنا "اوہ، تم نے پہلے کبھی اس طرح میں بات نہیں کی۔" بے شک وہ جانتی تھی کہ وہ اس طرح کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن یہ لمحہ ایک مکمل روشن لمحہ تھا، جس میں ہر چیز بالکل مختلف ہو کر سامنے آئی تھی۔

کوئی وجہ نہیں تھی کہ اسے کیوں رہنی پر اپنی یادوں کو ترجیح دینی چاہیے تھی۔ اس کی اپنی یاد کا اس کے لیے ایک ہی مطلب تھا کہ اس لمحے وہ اپنے اس کمزور رہنے والے شخص کی خاطر اسے برا سمجھے۔ وہ شخص جو اس کے قریب بیٹھا تھا، اس نے اس کی خاطر قربانی کے لیے کہا۔ وہ جوان تھا اور ممکنہ طور پر (تقریباً یقینی طور پر) وہ آخری آدمی تھا، جو اس سے پیار کر سکتا تھا اور ساتھ ہی یہ وہی تھا، جس کو وہ پا سکتی تھی اور صرف یہ ایک بات ہی بہت اہم تھی۔ مرد وہ اس سے مختلف تھا اور اگر اس نے اس کی یادداشت کو اپنے خیالات سے ختم کر دیا تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیوں کہ اس کی یاد، اس کے باہر تھی، بالکل اسی طرح جیسے کہ اس (مرد) کے خیالات اور یاد، اس کے باہر تھی اور ہر وہ چیز جو اس کے باہر تھی، اس سے اسے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ "ہاں، تم آج تک اس طرح نہیں ہوئیں۔" اس کا بیٹا چلایا لیکن اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی، وہ مسکرا رہی تھی۔

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔ مجھے مزاحمت نہیں کرنی چاہیے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جب اس نے اپنے لباس کے بٹن کھولنے شروع کر دیے۔ شام ابھی بہت دور تھی۔ اس بار کمرہ روشنی سے بھرا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

اِوُسیہ نگ

آچوان نے سکول جانا چھوڑ دیا

جب کوئی دیہاتی لڑکا آٹھ یا نو سال کا ہو جاتا تو اس کے ساتھ ہی یہ آس بھی بندھ جاتی کہ اب وہ تقریباً آدھے نوجوان آدمی کے برابر کارآمد ہو گیا ہے۔ اس سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ موسم بہار میں فصلوں کی کاشت کرے اور گرمیوں میں کٹائی کے کام میں ہاتھ بٹائے اور جب کوئی فارم ہاؤس تیار ہو رہا ہو تو اس کے لیے اینٹیں ڈھونے کا کام پہنچائے اور ساتھ ہی جب فصلوں کو پانی دینے کا وقت ہو تو اس کے لیے پانی کو صحیح کھیتوں میں لے جانا کرنا پڑے۔ کوئی دیہاتی آدمی ایسے کارآمد بچے کو سکول بھیجنا کرنا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ایک دن شہر میں ایک نوٹس چسپاں کیا پایا گیا، جس میں درج تھا کہ وہ والدین جن کے بچے چھ سال سے زیادہ عمر کے ہو چکے ہوں اگر وہ ایسے بچوں کو سکول نہیں بھیجیں گے تو انھیں جیل بھیج دیا جائے گا۔ تو اس طرح آچوان کو سکول جانا پڑا۔

پہلے دن سکول سے واپسی پر آچوان اپنے ساتھ آٹھ کتابیں لایا۔ اس کے تمام گھر والے، جن میں اس کی دادی اور دادا بھی شامل تھے، ان کتابوں کو دیکھنے کے لیے اس کے گرد جمع ہو گئے اور ان کتابوں میں تصویروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

"خدا بھلا کرے" اس کا دادا بولا "جب میں سکول جایا کرتا تھا تو ہماری کتابوں میں ایسی تصویریں نہیں ہوا کرتی تھیں۔"

اس کا باپ بولا "لیکن دیکھو..... ان تصویروں میں چینی لوگ تو بالکل نہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی چینی کپڑے نہیں پہنے۔ ذرا غور کرو..... یہ غیر ملکی جوتے ہیں اور یہ غیر ملکی ہیٹ اور چھڑی تو کتے کو مارنے کے لیے ہے۔ ان سب نے تو غیر ملکی پادریوں جیسے لباس پہن رکھے ہیں۔"

آچوان کی دادی نے کہا "اس جولاہے کو دیکھو..... یہ بھی غیر ملکی ہی دکھائی دیتا ہے۔ ہم پہیے کو دائیں ہاتھ سے چلاتے ہیں اور یہ بائیں ہاتھ سے اسے گھما رہا ہے۔"

اس کے دادا نے مزید کہا "اس گاڑی بان کو چینی ہی ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اگر تم لوگوں نے

گاڑی بان کو ایک طرف اپنی گاڑی پر کھڑے ہوئے دیکھا ہے یا سانڈنی پر یوں پکڑے ہوئے دیکھا ہے تو یقیناً یہ چھٹی ہی ہوگا۔"

جب آچون نے دیکھا کہ ہر کوئی اس کی کتابوں میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا "ٹیچر نے کہا ہے کہ مجھے ان کتابوں کے لیے پانچ روپے ادا کرنا ہوں گے۔"

اس کا یہ اچانک اعلان اس کے خاندان پر بجلی بن کر گرا۔ ایک لمحے کے لیے تو کچھ بول ہی نہ سکے اور پھر یہ اس کی دادی تھی، جس نے آخر کار خاموشی کو توڑا۔

اس نے کہا

"لو اور سنو..... پہلے تو انھوں نے زبردستی ہم سے چاہا کہ ہم اپنے بچے سکول بھیجیں اور اب وہ توقع کرتے ہیں کہ ہم ان کتابوں کی قیمت ادا کریں اور یہ سب کچھ پہلے ہی ہو گیا۔ بھلا ہم ایسے سکول کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ حتیٰ کہ اگر ہم اگلے چھ دن گھر میں بغیر روشنی کے گزارہ کریں تو بھی ہم اتنے پیسے نہیں نکال سکتے۔ اب بھلا کوئی ان بھلے مانسوں سے پوچھے کہ انھوں نے ان کتابوں کی قیمت آدھے من مکئی کے برابر کیوں رکھی۔"

اب اس کا دادا گویا ہوا

"میرے خیال سے چوں کہ لڑکے کا ابھی سکول میں آغاز ہے، اس لیے اس دوران میں اسے صرف ایک کتاب کی ہی ضرورت پڑے گی۔ اسے پہلے صرف ایک کتاب ختم کرنی چاہیے اور پھر دوسری حاصل کرنی چاہیے۔"

اس کی دادی بولی

"اب اس کتاب کی طرف دیکھو..... اس کے ہر صفحے پر تین یا چار سے زیادہ بڑے حروف نہیں۔ اب اسے میں یا اس کی قیمت زیادہ نہیں۔ اس کے برعکس جتنا ہی صرف چند گھنٹوں میں مل جاتی ہے اور اس کا ہر صفحہ چھوٹے اور بڑے بہت سے حروف سے بھرا ہوتا ہے۔"

بہت دیر تک وہ سب ان کتابوں کے متعلق کوئی واضح لائحہ عمل نہ بنا سکے اور بحث و مباحثہ رات گئے تک جاری رہا۔ لیکن آخر میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ چوں کہ اس بدقسمتی سے، جس نے کہ انھیں اچانک آ گھیرا ہے، چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں، اس لیے انھیں سکول والوں کا مطالبہ پورا کر دینا چاہیے۔ ان سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ پیسے اکٹھے کرنے کے لیے لڑکے کی ماں اپنے کانوں کی

بالیاں بیچ دے گی اور آچوان کے باپ نے اس سے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"تمھیں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تمھارے سکول جانے کی وجہ سے ہمیں پہلے ہی یہ نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے کہ اب تم گھر پر ہمارے لیے کام نہیں کر سکتے اور یہی ایک بات ہمارے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر سکتی ہے اور ہم حقیقت میں یہ مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ اب ہم تم سے یہی توقع کر سکتے ہیں کہ تم سکول میں محنت سے پڑھو گے۔"

آچوان نے اپنے باپ کی بات کی سچائی کو محسوس کیا اور فیصلہ کیا کہ وہ خوب محنت کرے گا تاکہ اس کے خاندان والوں کو محسوس ہو کہ وہ ان کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ اگلے دن جوں ہی روشنی ہوئی وہ سکول روانہ ہو گیا۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو اس وقت وہاں صرف چوکیدار تھا جس نے آچوان کو بتایا کہ وہ وقت سے بہت پہلے آ گیا ہے۔

چوکیدار نے کہا:

"کلاسیں نو بجے سے پہلے شروع نہیں ہوتیں..... اور اس وقت تو ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ سکول کے دروازے بند ہیں اور نیچے بھی سو رہا ہے۔ تمھیں ابھی گھر واپس چلے جانا چاہیے۔"

آچوان نے ارادہ کیا کہ وہ یہاں کوئی طالب علم نہ تھا وہ ایک لمحے کے لیے نیچے کے کمرے کی کھڑکی کے قریب کھڑا رہا۔ لیکن وہاں سے صرف اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر اس نے سکول کی عمارت کو دیکھا تو سب دروازے بند تھے۔ اب اس کے لیے چوکیدار کی نصیحت پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا..... وہ گھر واپس لوٹ آیا۔

اس کا باپ صحن میں جھاڑو دے رہا تھا، جب اس نے دیکھا کہ آچوان واپس آ گیا ہے تو وہ اسے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور جھاڑو پھینک کر چلایا:

"تم بدمعاش..... تمھارے جیسے بچے کو سکول بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں..... سکول میں آج تمھارا دوسرا دن ہے اور تم وہاں سے بھاگنے بھی لگے ہو۔"

اس سے پہلے کہ آچوان کوئی وضاحت پیش کرتا، اس کی ماں نے اس کے سر پر تھپڑ مارا اور اسے کہا کہ وہ اندر جائے اور ناشتہ تیار کرنے میں اس کی مدد کرے۔ یہاں یہ کہنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ ان سب کے غصے کی وجہ صرف وہ رقم تھی، جو انھیں اس کی تنخواہ کو خرچ کرنے پر خرچ کرنا پڑی تھی۔

ناشتے کے بعد آچوان دوبارہ سکول کی طرف چل پڑا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو سکول پہلے ہی

کھل چکا تھا اور شاگردوں کو پابندی وقت کی اہمیت پر لیکچر دے رہا تھا۔ اس نے اس پری کی کہانی سناتے ہوئے اپنے لیکچر کو ختم کیا، جو ہمیشہ سکول میں سب سے پہلے آنے والے کی منتظر رہتی ہے تاکہ وہ اسے سونے سے بھرا ہوا تھیلا انعام کے طور پر دے سکے۔ آچوان نے اس پری کی کہانی کو بہت پسند کیا اور خاص طور پر سونے کے تھیلے والی بات کو۔ وہ "سب سے پہلے آنے والے" کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکا۔

آچوان سہ پہر کو ساڑھے تین بجے کے قریب گھر واپس آیا۔ اس وقت اس کا باپ قیلولے کے بعد دوبارہ کام پر واپس جا رہا تھا۔ آچوان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے باپ نے اس کے پیچھے کتے کو مارنے والی چھڑی کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس لیے اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کا بیٹا دوبارہ سکول سے بھاگ گیا ہے۔ البتہ اس کا باپ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ان غیر ملکیوں کے اوقات کار بہت عجیب و غریب تھے۔

سکول میں پہلے چوان سبق کو پڑھنے اور اسے یاد کرنے میں لگے۔ یہ سبق چار لفظوں پر مشتمل تھا "یہ ماما (ماں) ہے۔" آچوان نے سبق کو یاد کرنے کے لیے بہت محنت کی اور شام کو وہ اس سبق کو دوہرانے کے قابل ہو گیا۔ وہ مضبوطی سے کتاب کو پکڑ لیتا اور ہر حرف پر باری باری انگلی رکھتا۔ بہت مرتبہ آچوان کی ماں نے اسے کہتے سنا "یہ ماما (ماں) ہے" تو وہ یہ سن کر غمگین ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چوانوں کے بعد اسے برداشت کرنا مشکل ہو گیا اور اس نے آچوان کی طرف جھکتے ہوئے اس کی کتاب چھین لی۔ وہ چیخی "مجھے دکھاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کون تمھاری ماں ہے؟" آچوان نے حیران ہو کر سوچا کہ شاید اس کی ماں کو واقعی اس کی پڑھائی میں دلچسپی ہے۔ اس لیے اس نے خوش ہو کر تصویر میں موجود ایک عورت کی طرف اشارہ کیا، جس نے وہی بڑی کے جوتے پہن رکھے تھے۔ جس کے بال گھنگھریالے تھے اور جس نے ایک لمبا سا لباس پہن رکھا تھا۔

"یہ دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے کہا "یہ ماما ہے۔"

اس کی ماں نے ایک نظر اس تصویر پر ڈالی اور پھر بری طرح رو پڑی۔ باقی گھر والے بھی اس کے ہمدرد ہو گئے۔ وہ کسی قدر یہ سمجھے ہوئے تھے کہ شاید کسی بدروح نے اسے اپنے چنگل میں جکڑ لیا ہے۔ انھیں کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا چکر ہے۔ پھر آچوان کی ماں آنسوؤں سے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بولی

"میں اس لیے روتی ہوں کہ میرا بیٹا اس چڑیل کو اپنی ماں کہتا ہے۔" جب انھیں معلوم ہوا کہ کس بات نے اسے یوں رنجیدہ کر دیا ہے تو وہ بھی سکول کی کتاب کی طرف متوجہ ہوئے۔ آچوان کے

باپ نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا "یہ کتاب یہ نہیں بتاتی کہ یہ کس کی ماں ہے؟ کل آچوان سکول میں پوچھ سکتا ہے۔

"میرے خیال میں یہ ٹیچر کی اپنی ماں ہے۔"

آچوان کی ماں ابھی تک بہت پریشان تھی۔ وہ ساری رات نہ سو سکی اور سب سے پہلا کام جو اس نے صبح کیا وہ یہ تھا کہ اس نے آچوان کو بگھی پر اس ہدایت کے ساتھ سکول بھیجا کہ وہ ٹیچر سے پوچھ کر آئے کہ اصل جواب کیا ہے۔

لیکن سب گھر والے اس سے بے خبر تھے کہ آج اتوار تھا۔ سکول بند تھا اور ٹیچر، جس نے کہ پچھلی شب بہت شراب پی لی تھی، اس وقت کسی سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نہ تھا۔

جب سکول سوموار کو دوبارہ کھلا تو استاد نے شاگردوں سے سوال پوچھنے کی ضرورت پر لیکچر دیا۔

"اگر تم سکول میں بہتر نظر آنا چاہتے ہو تو تمھیں اپنے استاد اور ماں باپ سے ان چیزوں کے متعلق سوالات کرنے چاہئیں جو تمھیں سمجھ نہ آسکیں۔"

آچوان فوراً کھڑا ہو گیا۔

ہماری کتاب میں درج ہے ..... "یہ ماما ہے۔" حقیقت میں یہ کس کی ماں ہے جناب؟

استاد نے پرمزاح انداز میں جواب دیا۔

"یہ اس بچے کی ماں ہو سکتی ہے جو کہ اس کتاب کو پڑھتا ہے۔ یہ بات تمھاری سمجھ میں آگئی؟"

"نہیں جناب" ..... آچوان نے جواب دیا۔

"اس میں ایسی کیا بات ہے جو تمھاری سمجھ میں نہیں آرہی۔" استاد نے پوچھا۔

آچوان نے کہا۔

"جناب ہماری بھی یہ کتاب پڑھ رہا ہے اور اس کی ماں ہرگز ہرگز اس تصویر جیسی نہیں ہے۔"

"بالڈی کی ماں کی صرف ایک آنکھ ہے اور اس کا بازو بھی ٹیڑھا ہے۔" ایک اور شاگرد بولا۔

اس پر بالڈی بول پڑا "یہ اس سے بہتر ہے کہ کسی کی ماں ہی نہ ہو ..... جیسے کہ تمھاری نہیں۔"

بلیک بورڈ پر اپنی چھڑی مارتے ہوئے استاد بولا "خاموش ..... کوئی کچھ نہ بولے۔" اب ہم دوسرا سبق شروع کر رہے ہیں جو ہے "یہ پاپا ہے۔" اس تصویر کی طرف دیکھو۔ یہ پاپا ہے۔ منتشر بالوں والا ..... اور جس نے عینک لگا رکھی ہے۔

جب آچوں گھر گیا تو اس کی ماں یہ جاننے کے لیے بے قرار تھی کہ کتاب والی عورت اصل میں کون ہے۔ لیکن جب اس نے اپنے بیٹے کو یہ دہراتے سنا "یہ پاپا ہے" تو وہ اس بات سے ڈر گئی کہ کہیں اس کے خاوند نے سن لیا کہ اس کے بیٹے کا کوئی اور باپ ہے تو وہ بہت ناراض ہوگا..... پس وہ خاموش ہو رہی مگر وہ اپنے آپ سے کہنے لگی "کہ جب لڑکوں کے اپنے ماں باپ ہیں تو یہ کتاب دوسرے لوگوں کو ان کے ماں باپ کیوں بناتی ہے؟"

چند دنوں کے بعد آچوں کو پڑھنے کے لیے ایک اور سبق ملا، جو یہ تھا "بھینس کھانا تیار کرتی ہے"۔ "گھوڑا گڑھی کھاتا ہے۔" جوں جوں وہ سبق پڑھتا جاتا بتدریج نڈھال ہوتا جاتا۔ فارم پر ایک بھینس اور گھوڑا بھی تھا اور بعض اوقات ماں نے ان کی دیکھ بھال بھی کی تھی لیکن اس نے کبھی گھوڑے کو گڑھی کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور یہ بھی اسے یقین تھا کہ بھینس کبھی کھانا نہیں پکا سکتی۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ کتاب غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس کے استاد نے یہ کہا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے پوچھا، اس کے باپ نے کہا "جب میں شہر میں تھا تو میں نے ایک فلم سرکس دیکھا تھا وہاں ایک ایسا گھوڑا تھا جو گھنٹی بجا سکتا تھا اور بندوق چلا سکتا تھا۔ اس کتاب میں غالباً سرکس کے جانوروں کے بارے میں باتیں درج ہیں۔"

آچوں کی دادی کتاب کی تصویروں کی طرف دیکھ رہی تھی وہ فوراً بول پڑی "میرے خیال میں یہ بدروحیں ہیں، دیکھو..... ان دونوں نے انسانوں جیسے لباس پہن رکھے ہیں۔ اگلی چند صدیوں میں شاید یہ سب بن جائیں۔" پھر وہ انھیں شیطانوں کے متعلق کہانیاں سنانے لگی، جو عناصر کو اپنے قابو میں رکھنے پر قادر ہوتے ہیں اور نتیجے کے طور پر آچوان آدھی رات کو چیختا چلاتا ہوا یہ کہتے ہوئے بیدار ہوا کہ مجھے ہوا میں اڑنے والا ایک بھینسا یا کوئی شیطان مار رہا ہے۔

اگلے دن آچوں نے اپنے ٹیچر سے پوچھا۔

جناب ..... "یہ بھینس جو کھانا پکاتی ہے یا فرضی ہے؟"

"بے وقوف لڑکے" اس نے کہا "کتاب میں صرف تمھیں خوش کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ بے شک بھینس کھانا نہیں پکا سکتی۔"

اب تک آچوں پر تقریباً واضح ہو چکی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ کتاب کچھ ایسی چیزوں کے بارے میں بیان کرتی ہے جیسے روٹی، دودھ، پارک اور گیند، جن کے متعلق اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا

اب اس نے محسوس کیا کہ کتاب نے ان سب چیزوں کو سکوں کے بدلے خوش کرنے کے لیے یوں ہی گھڑ لیا ہے۔ ایک دن ایک ٹی پارٹی کے بارے میں سبق پڑھنے کے بعد آچوان اور اس کے دوستوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسی ہی چائے کی پارٹی کریں گے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ان میں سے ہر ایک آٹھ آنے دے گا تاکہ اس پارٹی کے لیے کچھ چیزیں مثلاً نارنگیاں، سیب اور چاکلیٹ خریدا جا سکے۔ آچوان کو معلوم تھا کہ جب وہ ان چیزوں کو خریدنے کے لیے گھر سے پیسے مانگے گا تو کیا ہوگا لیکن کتاب میں ٹی پارٹی والی تصویر کچھ ایسی دلکش تھی کہ وہ اپنی ماں سے مدد لینے پر مجبور ہو گیا۔ اور پھر یوں ہوا کہ اس کی ماں نے اس رقم میں سے جو اس نے بچوں کو خریدنے کے لیے رکھی تھی اس کی ضرورت کے مطابق پیسے دے دیے۔

کئی کئی آچوان کے دادا کھانسی کی بہت تکلیف ہو جاتی تھی اور اس کے ایک دوست نے اسے بتایا تھا کہ نارنگی کا چھلکا استعمال کرنے سے آرام ملے گا۔ بوڑھا جب گھر آیا تو اس نے پوچھا کہ نارنگی کا چھلکا کیسا ہوتا ہے اور یہ کہ اسے کہاں سے مل سکے گا۔ آچوان نے محسوس کیا کہ دادا کو خوش کرنے کا اس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ سکول میں انھیں کچھ نارنگیاں ملنے والی ہیں۔

بوڑھے نے پوچھا "مگر تم یہ نارنگیاں کس طرح حاصل کرو گے؟"

"ہم ایک ٹی پارٹی میں حصہ لے رہے ہیں۔" آچوان نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کھٹے میٹھے اور کھائیں پئیں۔ اس چیز کا علم ہمیں کتاب کے ذریعے حاصل ہوا۔"

"یہ عجیب کتاب ہے۔ پہلے یہ جانوروں کو آدمیوں کی طرح عمل کرتے دکھاتی ہے اور پھر یہ لڑکوں کو سکھاتی ہے کہ وہ کھائیں اور کھیلیں کودیں۔"

دادا بڑبڑانے لگا "اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لڑکا سکول جاتے رہتا ہے وہ دوست اور ذہین ہو جاتا ہے۔"

دادا نے مزید کہا "اور پھر طرہ یہ تماشا یہ ہے کہ ہمیشہ غیر ملکی غذا کھاتے ہیں اور کبھی بھی پیاز کے ساتھ دی پھلیاں استعمال نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی اچھی چینی غذا۔"

اس کی ماں نے کہا "اپنے دادا کی کھانسی کے لیے نارنگی کا چھلکا گھر پر لانا نہ بھولنا۔"

باپ نے پوچھا "تم نے ان نارنگیوں کے لیے پیسے کہاں سے لیے؟"

دراصل ٹیچر۔ آچوان نے کہنا شروع کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی کہانی گھڑ سکے۔

ساتھ وہ اپنے گھر میں ہنسی نے چیخنا شروع کر دیا اور پھر ان سب نے سنا کہ اس کا باپ اسے برا بھلا کہتے ہوئے کہہ رہا تھا "ہمارے پاس تو زندہ رہنے کے لیے بھی پیسے نہیں اور تم مفت میں کے لیے پیسے مانگ رہے ہو۔"

اور پھر دوسری طرف کے ایک گھر میں بھی ایک اور لڑکے کا چیخنا دیا۔

"میرے خون پسینے کی کمائی سے، جو رقم تم نے مجھ سے سکول کی کتابیں خریدنے کے لیے لی وہ تو گئی تھی مگر اب تم چاکلیٹوں کے لیے مجھ سے پیسے مانگنے کی جرأت کر رہے ہو اور تمہارے دوست کوئی پارٹی کرنا چاہتے ہیں تو انھیں ادائیگی بھی کرنی چاہیے۔"

پس اس کے بعد کچھ بات سامنے آ گئی۔ آچوان کے باپ نے اسے تھپڑ مار دیا۔ اب یہ آچوان کی خوش قسمتی تھی کہ درمیان میں ایک میز پڑی تھی جو کہ اس تھپڑ سے نیچے گر گئی اور اس پر پڑے چاولوں سے بھرے پلیٹ چھ پیالے گر کر ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئے۔ دادا نے مشورہ دیا کہ ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس کے فوری طور پر سکول سے اٹھا لیا جائے۔ دادی نے جھرک کر کہا اگر یہ یونہی کرتا رہا تو یہ آخر کار جیل میں ہو گا۔

اس بات پر خاندان میں ایک لمبی بحث چھڑ گئی لیکن آخر میں یہی فیصلہ ہوا کہ آچوان کو فی الحال تھوڑے عرصے کے لیے سکول میں رہنے دیا جائے۔

اس واقعے کے بعد آچوان نے فیصلہ کیا کہ وہ بہت محنت سے پڑھے گا اور دوبارہ اپنے خاندان والوں کی نظروں میں ایک اچھا لڑکا بن جائے گا۔ وہ روزانہ اندھیرا ہونے تک بہت مستعدی اور انہماک کے ساتھ اپنی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتا۔ البتہ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ بہت جلد یہی کتابیں اس کی آخری ناکامی کا باعث بن جائیں گی۔

بعض اوقات آچوان کی دادی سوچتی تھی کہ پیسے کی شادی کر دینے کے بعد اب گھر میں اس کی پہلے والی حیثیت نہیں رہی تھی یعنی اب اس کی ویسے عزت نہیں کی جاتی تھی جیسے کہ پہلے کی جاتی تھی ایک دن اس نے سنا، اس کا پوتا آچوان اپنا تازہ سبق پڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا "میرا خاندان میری ماں، میرا باپ اور میرے بہن بھائیوں پر مشتمل ہے اور اس میں اس نے دادا، دادی کا تذکرہ بالکل نہیں کیا۔" جب بڑھیا نے اس فقرے کی پوری ماہیت کو محسوس کیا تو وہ بہت غصے میں آ گئی اس نے چلاتے ہوئے کہا

"میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ تمھیں میری بالکل پرواہ نہیں ہے کہ اب تم مجھے اپنے خاندان ہی میں شمار نہیں کرتے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک اینٹ اٹھا کر دے ماری، جس سے ایک کھانا پکانے والا برتن ٹوٹ گیا۔

"ماں تم ناراض مت ہو۔" آچوان کے باپ نے کہا۔

"اپنے بیٹے کو ایسی بے ہودہ کتاب پڑھنے کی اجازت دینے سے بہتر ہے کہ میں جیل چلا جاؤں۔"

گلے اس آچوان کے باپ نے وہ جا تو ملازم، جو اسے دارم پر رکھنا پڑا تھا، الگ کر دیا۔ سکوں کے بچے نے آچوان کے نام کے آگے برا سا نشان بنایا، جس کا مطلب تھا کہ آچوان سکوں سے خیانت ہے۔"

☆☆☆☆

لیو ٹالسٹائی

بچے بڑوں سے زیادہ سیانے ہوتے ہیں

اس سال موسم کا تہوار وقت سے کچھ پہلے ہی آ گیا تھا۔ برف گاڑیوں کے ذریعے سفر کرنے کا موسم ابھی ختم ہی ہوا تھا۔ کچھ برف تو ابھی صحنوں میں پڑی ہوئی تھی اور باقی گندے پانی کی صورت میں پگھل چکی تھی جو گاؤں کی گلی میں بہہ نکلی تھی۔

دو چھوٹی لڑکیاں، جن کا تعلق دو مختلف گھرانوں سے تھا، دو رویہ بنے ہوئے مکانوں کے درمیان والی گلی میں ان کی ملاقات ہوئی، جہاں پانی نے بڑے اور گندے جوہڑ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک لڑکی تو بہت چھوٹی تھی اور دوسری قدرے بڑی۔ انھوں نے بہت صاف ستھرا لباس پہن رکھا تھا کیوں کہ وہ ابھی ابھی گرجا گھر سے واپس آئی تھیں۔ ایک نے نیلا فراک پہن رکھا تھا اور دوسری نے سرخ پھولوں والا اور دونوں کے سروں پر سرخ رومال بندھے تھے۔ انھوں نے کھیلنا شروع کیا اور بہت مصروف ہو کر میں سوچ کر پانی کے چھینٹے اڑانا چاہیں۔ چھوٹی لڑکی اپنے جوتوں اور دوسری چیزوں سمیت جمع شدہ پانی میں کودنے جا رہی تھی کہ بڑی نے اسے روک دیا۔

"ملاشا۔ پانی میں مت جاؤ۔" اس نے کہا "تمھاری امی ناراض ہوں گی۔ دیکھو میں اپنے جوتے اور جرابیں اتار رہی ہوں تم بھی ایسے ہی کرو۔"

دونوں نے یہی کیا پھر اپنے فراکوں کو اپنے ہاتھوں سے گھٹنوں سے اوپر تک کر کے وہ جمع شدہ پانی میں ایک دوسرے کی طرف چلنے لگیں۔ پانی ملاشا کے ٹخنوں تک پہنچتا تھا۔ وہ بولی۔ "دیکھو آکولیا! یہ کتنا گہرا ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" "ارے ڈرو نہیں۔" دوسری بولی "یہ اس سے زیادہ گہرا نہیں ہے۔"

جب وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئیں تو آکولیا نے کہا "ملاشا ذرا احتیاط سے! چھینٹے مت اڑاؤ، احتیاط سے چلو۔"

وہ مشکل سے تھامی کہ پانی تھی کہ ملاشا نے پانی میں بے تحاشا کودنا شروع کر دیا اور اس طرح

پانی کے چھینٹے سیدھے کویا کے صاف ستھرے فراک پر پڑے۔ فراک پر گندے پانی کے دھبے پڑ گئے اور کویا کی آنکھیں اور ناک بھی ان گندے چھینٹوں کی چپیٹ میں آ گئے۔ جب اس نے اپنے فراک پر یہ گندے دھبے دیکھے تو وہ غصے میں آ گئی اور وہ ملاشا کو مارنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑی۔ ملاشا ایک دم سے ڈر گئی اور جب اس نے اپنے آپ کو مصیبت میں گھرا دیکھا تو وہ گندے پانی سے نکل کر گھر کی طرف بھاگی۔ لیکن اس وقت کویا کی امی بھی وہاں سے گزر رہی تھیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی بیٹی کے صاف ستھرے فراک کا ستیاناس ہو گیا ہے اور اس کے چہرے اور ہاتھوں پر بھی کیچڑ ہے تو اس نے کہا:

"تم نے یہ گندی حرکت کیوں کی؟ یہ تم کیا کر رہی تھیں؟"

"ملاشا نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی کویا کی امی نے ملاشا کو پکڑ کر اس کے سر ایک چپت رسید کر دی۔ ملاشا نے چیخنا شروع کر دیا اور اس کے اس شور کو ساری گلی میں سنا گیا۔ اس کی امی اس کی آواز سن کر اپنے گھر سے باہر دوڑ پڑی۔

"تم نے میری بیٹی کو مارنے کی جرأت کیسے کی؟" وہ بولی اور اس نے اپنی ہمسائی کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ بات سے بات بڑھی اور انھوں نے بہت بری طرح لڑنا شروع کر دیا۔ سارے محلے کے لوگ بھی اس جھگڑے میں شامل ہو گئے اور یوں گلی میں ایک اچھا خاصا ہجوم ہو گیا۔ وہ تمام کے تمام چیخ رہے تھے اور چلا رہے تھے۔ جب کسی شخص نے دوسرے کو دھکا دے دیا اور پھر تقریباً تھانے پر اترنے والے تھے کہ کویا کی بوڑھی دادی نے مداخلت کی اور ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"دوستو! تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو؟ کیا اس طرح کرنا ٹھیک ہے؟ اور وہ بھی اس بڑے دن کے موقع پر۔ یہ تو خوش ہونے کا وقت ہے لڑنے کا وقت نہیں۔"

لیکن کسی نے بوڑھی عورت کی بات نہ سنی اور انھوں نے تقریباً لڑتے لڑتے اسے گرا ہی دیا۔ اسی دوران میں جب تمام عورتیں ایک دوسرے کو گالیاں دے رہی تھیں، کویا اور ملاشا ایک بار پھر ایک دوسرے کی دوست بن گئی تھیں۔ کویا نے اپنے فراک اور چہرے سے کیچڑ صاف کرنی تھی اور پھر جمع شدہ پانی میں کھیلنے کے لیے واپس آ گئی تھی۔

اس نے ایک پتھر لیا اور اس کی مدد سے اس نے جمع شدہ پانی کے کنارے سے زمین کو گہرا کھود کر ایک چھوٹی سی نہر کی شکل دے دی تاکہ پانی گلی میں بہہ کر نکل سکے۔ اس کام میں ملاشا بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ اس نے لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی مدد سے اس نہر کی کھدائی میں اس کا

ہاتھ بٹایا اور جس وقت مردوں نے بھی بھرپور انداز میں جھگڑنا شروع کر دیا تو ان دونوں لڑکیوں کی بنائی گئی سہ رکنی کمیٹی اس جگہ پر آ گئی، جہاں وہ بوڑھی عورت ابھی تک لوگوں کو اس دریا سے رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ لڑکیاں اس سہ رکنی کمیٹی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

"پکڑو۔ ملاشا اسے پکڑو۔" کولیا چلائی۔ اس وقت ملاشا اتنے زور سے ہنس رہی تھی کہ کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

خوشی سے مغلوب ہو کر اور اس لکڑی کے ٹکڑے کو پانی کے ساتھ ساتھ بہتا دیکھتے ہوئے دونوں لڑکیاں ٹھیک اس جگہ پہنچ گئیں جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بوڑھی عورت نے لڑکیوں کی طرف دیکھ کر لوگوں کو مخاطب کیا۔

"یہ لڑکیاں اب اپنے اوپر شرمندہ نہیں آ رہی۔ تم نے انہیں بچیوں کی وجہ سے لڑنا شروع کیا تھا جنہوں نے اس واقعے کو بھلا کر پھر سے دوستی کر لی ہے اور بڑی خوشی محسوس کر رہی ہیں۔ یہ معصوم بچیاں۔ یہ تم سے زیادہ عقلمند ہیں۔"

مردوں نے ان لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے شرمندہ ہو کر لڑنا جھگڑنا بند کر دیا پھر وہ سب ہنستے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔!!!!

☆☆☆☆

فواد تیکرلی

تنور

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ شروع میں، میں نے سچ نہیں بولا۔ اگرچہ میں بے گناہ تھا مگر میں نے ایک راز سے پردہ اٹھانے سے چھپائے رکھا۔ یہ بہت قیمتی چیز ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کب سچ کو ظاہر کر دینا چاہیے۔

جناب والا میں بے گناہ ہوں۔۔۔۔ میں نے اپنے بھائی عبدل حمزہ کی بیوی فرح کو قتل کر دیا کیوں کہ وہ بدکار تھی۔ میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اور پھر عرب روایات سے مغلوب ہو کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ پاک دامنی بہت قیمتی چیز ہے اور اس پر کئے جانے والے حملے کا رواج ہے۔ اس لیے میں نے اپنی شکاری بندوق اٹھائی، جس کو آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور اسے فوراً گولی مار دی۔ اگر آپ اس کے آشنا کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو مجھے شروع سے اس کہانی کو بیان کرنے کی اجازت دی جائے۔؟

جیسا کہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، میں نے ان دونوں کو اکٹھے نہیں دیکھا۔ وہ صبح سویرے سرخ اور سفید رنگ کا چوغہ پہنے، ناشتہ تیار کرنے کے لیے اپنے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ روٹی پکانے کی غرض سے تنور کو آگ لگانے کے لیے اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے اطلاع مجھے کہا کہ چوں کہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوئی ہے، اس لیے وہ خود کو مار دینا چاہتی ہے۔ اس نے تنور میں آگ جلانی شروع کی اور پھر خودکشی کرنے کے لیے، اس نے اس میں چند گولیاں پھینکنے کی تیاری کی۔ خون میری رگوں میں جوش مارنے لگا۔ میں نے رائفل اٹھائی، اس کا نشانہ لیا اور فائر کر کے اسے مار دیا۔ عزت بہت انمول ہوتی ہے۔ ہم سچے عرب ہیں اور ہم بے شرمی کا داغ اپنے اوپر نہیں لگنے دیتے۔ بدکاروں کو عموماً قتل کر دیا جاتا ہے کیوں کہ گناہ گار یک گندگی ہوتا ہے۔ اس لیے اس گندگی کو دور کرنا ہی چاہیے۔ فرح نے خود تسلیم کیا تھا کہ اس نے اپنے شوہر کی گرفتاری کے بعد اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رات کی تاریک میں اپنے آشنا کو اپنے ساتھ سونے کے لیے کہا تھا۔ میں نے صرف اپنے خاندان کے

ناموس کی حفاظت کی تھی۔ اس کا شوہر میرا بھائی ہے اور وہ میری بھابھی ہے۔ اس نے اس برے کام کے لیے اپنے آشنا کو وقت دے کر اپنی جوانی اور خوب صورتی کا ناجائز استعمال کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ شہد رنگ آنکھوں اور خوب صورت چہرے والی صرف انیس سالہ عورت ہے۔ اس طرح یہ چیز ختم ہو گئی

میری بہن حلیمہ نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں خدا کی مقدس کتاب کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں ـــــ کہ وہ اس وقت میرے ساتھ تھی اور شریک جرم نہیں تھی۔ وہ گھر کے ایک دوسرے حصے میں تھی۔ میں اس معزز عدالت کی وضاحت کے لیے اپنے خاندانی معیار کے متعلق یہ کہنا چاہوں گا کہ ہم غریب لوگ ہیں اور کئی کمروں پر مشتمل ایک کچے مکان میں اکٹھے رہتے ہیں۔ میرے بھائی محمد دین کا کمرہ مشرقی حصے میں ہے اور اس سے ملحق میری والدہ اور خاندان کے دوسرے لوگوں کے کمرے ہیں۔ میری شادی ہوئے دس سال ہو چکے ہیں اور میں چار بچوں کا باپ ہوں۔ میں فوج میں تھا اور وہاں میں نے سرحدت کے عہدے تک ترقی پائی۔ میرے خلاف کبھی کوئی مقدمہ درج نہیں ہوا۔ تو میری بہن حلیمہ کے کچے کمرے کے بالکل ساتھ صحن کے وسط میں واقع ہے۔ میں عدالت کے سامنے اس چیز کی وضاحت کرنا بھول گیا تھا۔

قتل کے روز صبح کے وقت میری بہن نے مجھے جگایا۔ میں یقینی طور پر جاگا ہوا تھا اور مجھے اس بات پر بھی یقین ہے کہ میری خالہ نور بانو نے جو میرے بھائی کی بیوی کے پاس تھی، گولیوں کے چلنے کی آواز دریافت کی تھی۔ میں معلوم کرنے گیا تو میں نے فرخ کو تنور کے پاس گرے ہوئے پڑا اور گولیاں آتش دان میں دھماکے سے پھٹ رہی تھیں۔ جناب والا یہ میرے اس شہادتی بیان کی مختصر سی روداد ہے، جو آپ خود محسوس کر رہے ہیں کہ سچائی سے بہت دور ہے۔ میں نے ایسا جھوٹ کیا ہے جناب عالی کہ مجھے معاف کر دیجیے۔ ہم نے اپنے حواس کھو دیے تھے، اس لیے ہر طرح سے چشم پوشی برتی۔ بدقسمتی سے سچائی کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ اس رات، جب میں سویا ہوا تھا تو چار بجے کے قریب جب صبح ہونے والی تھی تو میری بہن حلیمہ نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے مجھے جگا دیا کہ اس نے صحن میں کسی کو تیزی سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اٹھ بیٹھا اور اپنے والدین کے کمرے کی طرف گیا۔ وہ بھی سو رہے تھے، پھر میں فرخ کے کمرے کی جانب گیا۔ میں نے اسے اکیلا پایا۔ یہ بات بعد میں سامنے آئی کہ حلیمہ نے، جو سترہ برس کی ایک بے حد حساس لڑکی ہے" آپ کے سامنے حلف اٹھا کر کہا کہ اس نے فرخ کو ایک اجنبی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے دیکھا تھا اور اس لیے وہ مجھے

جگانے آئی تھی اور میں معاملے کی چھان بین کے لیے چل پڑا تھا۔ اس صبح میں نے فرح کو تنور روشن کرتے ہوئے پایا تھا۔ یہ وہ حقائق ہیں۔ آسمان روشن ہو رہا تھا اور تنور سرخ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ فرح نے میری طرف مڑے بغیر مجھے مخاطب کرتے ہوئے گناہ، عزت اور خودکشی کے بارے میں بات کی۔ میں الجھن میں مبتلا ہو گیا اور سخت طیش میں آ گیا۔ تیزی کے ساتھ میں نے رائفل جلیمہ کے ہاتھ سے چھینی اس کا رخ فرح کی طرف کیا اور فائر کر دیا۔ اس کی لاش کے قریب پڑی پائی گئی۔ اس شکاری رائفل سے صرف ایک فائر کیا گیا تھا۔ رائفل میں صرف ایک ہی گولی بھری تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہی ایک گولی اس کے سر میں جا گھسی تھی۔ میں نے یہ محض خاندانی عزت کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ جناب والا میری درخواست ہے کہ میری صورت حال کو سمجھتے ہوئے میرے خاندان کی عزت پر رحم کیا جائے۔ میں ایک کم پڑھا لکھا مسلمان شخص ہوں اور ایک سابقہ سپاہی ہوں۔ میں نے اسے صرف اس لیے قتل کیا کہ وہ گناہ کر رہی تھی۔

آپ نے جان لیا ہے کہ اپنے اس گناہ کا اس نے میرے سامنے اعتراف کر لیا تھا۔ وہ تنور کے سامنے کھڑی اس کا حساب کر رہی تھی اور ہم سب کی عزت پامال کر رہی تھی۔ ثوریا کا یہ بیان کہ وہ ساری رات ہی کمرے میں فرح کے ساتھ رہی تھی، کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ غیر متوازن شخصیت کی حامل ایک عورت ہے۔ اور پھر یہ کہ مرنے والی نے اپنے گناہ کا اعتراف میرے سامنے کر لیا تھا۔ مزید یہ کہ میری بہن جلیمہ نے اسے ایسی شرمناک حالت میں دیکھ لیا تھا، جو قاعدوں اور وقار کے منافی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس رات اپنے آشنا کے ساتھ یہ قبیح فعل سرانجام دیا۔ اس رات جب کہ ہم سب اپنے بھائی عبدل حمزہ کی نظر بندی کے متعلق متفکر تھے، اس نے اس مجرم کے ساتھ ملاقات کرنے کا منصوبہ بنانے کی جرأت کی۔ میں کوئی اتنا زیادہ مہذب شخص نہیں ہوں لیکن کسی حد تک ایک کھرا رویہ رکھنے والا آدمی ہوں۔ میں اپنے مقام سے اچھی طرح واقف ہوں، حالانکہ میں صرف تیس سال کا ہوں۔ میں نے فرح سے اچھی طرح سے اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ ایسی بدکاری کا یہ جرم ہمارے اہل خانہ میں سے کسی سے سرزد نہیں ہو سکتا۔ ہم قابل عزت اور قدامت پسند لوگ ہیں جو اس بے عزتی کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ میں نے ہر طرح سے اسے باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے خیالات اور تصورات سے دور رہتے ہوئے ایسی گناہ آلود منصوبے بنانے سے باز رہے۔ لیکن وہ ایک دیوانے شخص کی طرح بے حس ہو چکی تھی۔ میں نے اسے اس امید کے ساتھ اس کے کمرے میں جانے

دیا کہ شاید وہ اپنے رویے میں نرمی پیدا کر لے گی۔ جو کچھ ہوا تھا، میں نے اس کے متعلق حمیرہ کو بتا دیا اور اس واقعے کو اپنے ذہن سے مٹا دیا۔ ابھی میں نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ میں نے ایک گولی چلنے کی آواز سنی۔ میں مدھم روشنی میں نہائے ہوئے صحن کی طرف گیا، جہاں آتش دان سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ خالہ نوریا نے مجھ سے گولی کی آواز اور فرح کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے اسے ایک طرف دھکیلا اور بھاگ کر اپنے بھائی کے کمرے کی طرف گیا، جہاں میں نے ان دونوں کو کھیلتے دیکھا۔ وہ تو قتل کر دی گئی تھی یا اس نے خودکشی کر لی تھی۔ میں نے ریوالور لیا اور حمیرہ کے ساتھ اس کے کمرے میں واپس آیا۔ میں ایک مارچ پیچھے سے سن رہا ہوں۔ جناب والا، یہ ہماری فطرت ہے ایسی فطرت، جس کے آپ عادی نہیں اور نہ ہی اسے برداشت کر سکتے ہیں۔ ہم ایک نقطے پر مرتکز رہنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ ہم ایک موضوع کا شروع کرتے ہیں اور پھر درمیان ہی میں ہم کسی اور دلچسپ اور پرجوش واقعے کی طرف ہو لیتے ہیں اور پھر کسی ایسے تیسرے موضوع کی طرف رجوع کر لیتے ہیں جو ہمارے دل کو بھاتا ہو۔ ہم تنی خو اور کھردرے پن کے حامل، ایسے لوگ ہیں، جو امن کے ساتھ رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ہمارے متعلق بیان کی جانے والی اکثر کہانیوں سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ میں ایسا بے گناہ شخص ہوں، جیسا کہ میں نے کئی بار کہا ہے۔ میں نے کسی ایسے عزت دار شخص کی طرح اپنے وقار کو بچایا، جس کے میری طرح چار بچے ہوں اور اس پر ایک بڑے خاندان کا بوجھ ہو۔ وقار کا قائل تقسیم ہے، چاہے اس کا تعلق بدکاری سے ہو یا کسی کیفیت سے۔ اپنی پاک دامنی و برقرار رکھنا ہی ہمارا مقصد ہے اور ہم اپنے خون سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ آپ کے سامنے اس پیچیدہ صورتحال کی وضاحت کرنا مشکل ہے کیوں کہ میں ایک جاہل بدو ہوں۔ بہرحال یہ سب کچھ بہت سادہ ہے اور میں آپ کے سامنے حقیقت بیان کروں گا۔

ہمارا ایک خاندان ہے۔ میرا بھائی عبدل حمزہ اور اس کی مرحومہ بیوی گھر کے ایک حصے میں رہتے ہیں۔ اس سے اگلے حصے میں میری ماں باپ، میں خود، میری بیوی اور چار بچے رہتے ہیں اور پھر کنواری کے ساتھ والے کمرے میں، میری ماں کی بیٹی حمیرہ رہتی ہے۔ تخورکس کے درمیان میں واقع ہے۔ اس حادثے کے روز میرا بھائی "رفتار ہو" گیا تھا۔ اس نے میری نصیحت کے برعکس زرعی اصلاحات کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی، جس کے نتیجے میں وہ "رفتار ہو" گیا تھا۔ خالہ نوریا میری بھابھی کے ساتھ سونے کے لیے آئی۔ سادہ و واضح حقائق۔ پھر مرنے والی عورت کا آشنا چوری چھپے گھر میں داخل

ہو صحیح وقت کا تو ہمیں علم نہیں، شاید آدھی رات کے وقت یا اس سے بھی بعد، بہر حال خاندانی وقار داؤ پر لگا دیا۔ صبح ناشتے کے لیے روٹی وغیرہ پکانے تک حالات نارمل تھے۔ پھر وہ شرمناک حقائق اچانک سامنے آ گئے۔ فرح نے رات کو اپنے شوہر سے دھوکا کیا تھا۔ صبح اٹھنے پر اس نے دوسروں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے، اپنے آپ کو یوں ظاہر کیا، جیسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنے جرم کو چھپا نہ سکی اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں اور بکھرے ہوئے بالوں کے ذریعے، اس نے عندیہ ظاہر کیا کہ وہ اس گھر کی عزت کو بچانے کے لیے، اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر لے گی۔ حلیمہ نے نہایت صاف جوابی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ اس نے اسے اپنے آشنا کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے بالکل برہنہ حالت میں دیکھا تھا۔ تلخ سچائی کو سامنے پا کر اور شرمندگی سے مغلوب ہو کر وہ اپنے منہ کو اپنے ہاتھ سے بند کیے ہوئے دیوانگی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ میرے لیے اس بے عزتی کے داغ کو اس کے خون سے دھونے کے علاوہ چارہ کار نہ تھا۔ جناب والا ہم ایسی حالتوں میں کیسی کچھ کرتے ہیں۔ میں نے لباس پہنا اپنی شکاری رائفل اٹھائی اور اس کے پیچھے چلا آیا۔ جیسے کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ابھی صبح ہوئی ہی تھی اور وہ تنور میں آگ جلا رہی تھی۔ ہم وہاں اکیلے تھے اور اس نے واضح طور پر اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا کیوں کہ وہ اس بدکاری کی سزا سے بچنے کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے پاس اسے اس رائفل سے قتل کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ بعد میں حلیمہ نے نہایت عیاری سے کچھ گولیاں (رائفل کی گولیاں) تنور میں ڈال دیں جن کے پے در پے دھماکوں نے سارے گھر کو ہلا دیا۔ جناب والا یہی سچائی ہے۔ حلیمہ کے خلاف لگائے گئے الزامات غلط اور بے بنیاد ہیں۔

نوریا نے ساری رات فرح کے ساتھ رہنے سے متعلق جھوٹ بولا تھا اور یہ بھی جھوٹ کہا تھا کہ اس رات گھر میں کوئی داخل نہیں ہوا تھا اور کسی نے فرح کے ساتھ محبت بھرے لمحات نہیں گزارے تھے۔ اس سے پوچھا جائے کہ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس نے صبح سویرے فرح کو بے دار ہوتے اور پاک دامن لوگوں کی طرف اسے بغور دیکھتے ہوئے پایا؟ کس نے اسے ناشتہ تیار کرنے، روٹی پکانے یا تنور گرم کرنے کو کہا تھا؟ اگر اس نے کسی دوسرے محرک کے بغیر اپنے شوہر کی غیر حاضری میں اپنے آپ یہ سب کچھ کیا تھا تو پھر وہ حلیمہ کے کمرے میں کیوں داخل ہوئی؟ جب کہ ہمیشہ ہی ناشتہ تیار کرنے میں اس کی مدد کیا کرتی تھی۔

نوریا کا یہ الزام کہ اس نے فرح کو ہماری طرف، میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے

دیکھا تھا جھوٹ ہے اور یہ کہ اس نے مرتے وقت کچھ غیر واضح سے لفظ ادا کیے تھے
سراسر جھوٹ ہے یہ دونوں باتیں جھوٹی ہیں یہ سب کچھ نہایت احمقانہ ہے میں نے
فرخ کو تور کے پاس سے، جہاں اس نے اپنے آپ کو ہلاک کیا تھا، گھسیٹا اور گھسیٹ کر اس کے کمرے
میں لایا اور اس کے بعد اس کے ساتھ پہلی والی پوزیشن پر واپس آ گیا یہ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ وہ
کہاں گری تھی اور کہاں مری تھی۔

میڈیکل رپورٹ میں جو کچھ بتایا گیا ہے کہ فرخ ریوالور کی ایک گولی سے مرا تھا غلط ہے
میں نے ٹریگر دبایا تھا اور اس لمحے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہتھیار کے بارے میں میں پوری
طرح آگاہ تھا۔

خیر اس واقعے میں جھوٹ نہیں ہے۔ جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا غلط ہے۔ میں استدعا
کرتا ہوں کہ مجھے اس جرم سے علاحدہ رکھا جائے۔ وہ اس چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مجرم
میں ہوں۔ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو یہ میں ہوں، جس نے اپنی عزت بچانے کے لیے اس بدکار کو ہمیشہ
کے لیے خاموش کر دیا تھا۔ جناب والا میں بے گناہ ہوں۔ آپ اپنا فیصلہ سناتے ہوئے مجھ پر رحم کریں۔
میں نے یہ جرم ایک ایک ورثاں اور مقصد کے تحت کیا ہے۔ اس لیے انصاف کے کام میں اور میری سزا
کو نرم کر دیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو میری غیر حاضری پر افسوس کریں گے۔ یقین کریں۔۔۔۔ یہ
میری شامت اعمال ہے۔

یہ سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے!!!"

☆☆☆☆

این وی ایم گونزیلز

نمک کی روٹی

عموماً میں رات اس بے تک سوچتا ہوں اور اپنی چودہ سالہ تنہا کا ایک اور دن گزارنے کے لیے صبح پانچ بجے اٹھ بیٹھتا ہوں۔ اگر کبھی دادی اماں جوں جائیں تو مجھے پندرہ سینٹاوس کے سکوں کے ساتھ پرائمر سیکنڈ ہینڈ میں بابلی کی دکان پر پہنچنا ہوتا ہے، اپنی جیب میں پرانے سکوں کی کھنک مجھے بہت بھاتی ہے۔ دادی اماں چوں کہ اپنی تیس بھدو زنجیں کھو چکی ہیں، اس لیے مجھے یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ روٹیاں کس معیار کی ہوں۔ میرے اور میرے کزنوں جیسی عمر کے نوجوانوں کے لیے ان کے نزدیک Pande sal قسم کی روٹیاں عموماً ٹھیک رہتی ہیں۔

نمک کی روٹی! اس کا نام کیسے پڑا؟ کون سے آٹے اور سفوف خمیر کے ذریعے اس روٹی نے یہ خوشبو پائی؟ بچے آپ سے پہلے آنے والے خریداروں کی بھیڑ سے بچنے کے لیے مجھے وہاں میں جلد پہنچنا ہوتا تھا تاکہ میں جلتے ہوئے تنور کے منہ میں، اپنے لمبے چوڑے لکڑی کے پھاوڑے سے ہتھیاروں سمیت، ان آدمیوں کو آدھے دھڑ تک تنور کے اندر اور باہر آتے جاتے دیکھوں۔ پتہ نہیں کیسے تنور میں سے وہ میری چھوٹی سی تلاش کے بعد اونی ملگی براؤن رنگ کی روٹیاں برآمد کر دیتے تھے؟ تنور سے برآمد ہونے والی روٹی پتا نہیں کیسے ارد گرد سے سورج کے دو ہونٹوں جیسا تاثر لیے ہوئے ہوتی تھی؟ گلی کی مدھم روشنی میں تیزی سے واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے، جب میں روٹیوں کا لفافہ اپنے سینے سے چمٹا لیتا تھا تو تنور سے نکلی ہوئی تازہ روٹیوں کی گرمی مجھے ایسی فرحت بخشتی کہ میں ہمیشہ پرغرور انداز میں گھر کی طرف لوٹتا۔

میں یہ بات کبھی طے نہیں کر پایا تھا کہ گھر میں روٹی کا ایک آدھا ٹکڑا توڑ کر راستے میں کھا لینا تو شاید دادی اماں اس بات کا برا نہ مناتیں۔ ہو سکتا تھا کہ میں ایک سے زیادہ یعنی دو ٹکڑے کھا لیتا جو کہ حد میں میرے حصے سے کم رہ جاتے لیکن یہ ایک دھوکہ دینے والی بات تھی اس لیے میں نے کبھی ایسی جرأت نہیں کی تھی۔ روٹی کی حفاظت کے لیے میں قدم نہایت احتیاط سے اٹھاتا تھا اور گلی کے

اندھیرے حصوں سے بچ کر چلتا تھا۔

اس سفر کے دوران میں اپنی لطف اندوزی کے لیے میں حفاظتی بند کی طرف پچاس گز یا اس سے کچھ زیادہ آگے دریائی گزرگاہ کے پرے موجود ایک بوڑھے پیپل کے گھر کی طرف دیکھا کرتا تھا جب پانی کم ہوتا اور دریائی گزرگاہ تقریباً خشک ہوتی اور وہاں پر کی ٹوٹی ہوئی بوتلوں سے چنگاریاں چمک رہی ہوتیں تو اس علاقے کے گھر کے تنہا کی پتھریلی دیوار ایک قلعے کا منظر پیش کرتی تھی۔ یہ دیوار کے قریب کم اونچائی میں تھیں۔ پانی کے شیشے اور ناندوری کی چھت سورج کی روشنی میں چاندی کی طرح چمکتی تھی۔ دھندلی صبحوں کو رات سے چار پانچ گز اوپر تک بنی ہوئی باسوں کی مدد سے بنائی گئی سکرین سے جو برآمدے کو ڈھانپے ہوئی ہوتی تھی روشنی جھلملاتی تھی۔ البتہ اگست کے مہینے میں ٹھاں شرق سے آنے والی ہوا سوندھی سوندھی سی ہوا ہوں سے کمروں کو بچانے کے لیے سارے چھپے سے پہلے پہلے تین ملازم تیزی کے ساتھ اس سکرین کو اوپر اٹھا دیتے تھے اور یوں برآمدہ اس کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔ ان چرخیوں کے گھومنے کی آواز سنتے ہی میں جان لیتا کہ سکول جانے کا وقت ہو گیا ہے۔

میرے دادا نے ناریل کاشت کرنے والے ایک اور سفر کی حیثیت سے تیس سال تک ملازمت کی تھی۔ تیس سال پہلے میری دادی اماں بیوہ ہو گئی تھیں۔ میں اکثر تنہائی کے ساتھ یہ سوچا کرتا تھا کہ یہاں آنے والے دنوں کو اس عظیم گھر کی خدمت کرتے ہوئے ہی گزاروں گا۔ ایک دن مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہائی سکول میں پڑھنے والی میری تلاش نیو ایرا اس بوڑھے انسان کی بھتیجی تھی۔ میرے تمام شکوک و شبہات جاتے رہے۔ کیوں کہ میرے دادا نے اپنی موت سے پہلے اس معاملے کی نزاکت کے قطع نظر، مذاق کے انداز میں اس کے متعلق یہ بات بتائی تھی اور اس کے مطابق بالکل یہی وقت ہوتا تھا، جب وہ اپنے بچے کو حفاظت کہنے کے لیے اپنے بیدروم سے باہر نکلتی تھی۔ حالاں کہ میں حقیقت کو جانتا تھا کہ اس طرح اس وقت، اس کے باہر آنے کا مقصد میری آنکھوں کی پیاس بجھانا ہوتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ یہ وہ محض اس لیے کرتی تھی کہ لوگوں کو میرے اور اس کے باہم تعلق کے متعلق حقیقت کا واضح طور پر پتا نہ چل سکے۔ بعد میں کئی سالوں بعد مجھے پتا چلا کہ اس کے نام کے حوالے سے میرے حافظے میں محفوظ رہنے والی کئی یادیں جنم لینے والی تھیں اور جنہیں موضوع بحث بھی بننا تھا لیکن ان دنوں تو یہ یقین اس کا نام ایک زندہ حقیقت تھا۔ مجھے سرگوشی سی سنائی دیتی۔ اس کا نام مجھ سے کہتا "تمہیں مجھے دہرانے کا اعزاز حاصل رہے گا۔۔۔شاید؟" اور بعد میں، میں نے

کوشش کی کہ میں اس بات کی لاج رکھ سکوں۔ سکول میں ان دنوں چند ہی لڑکیوں کا بہت چرچا تھا اور جب بھی میں کوئی گیت گاتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میرا جسم سورج کی روشنی میں یوں چمک اٹھتا تھا جیسے کہ یہ تانبے کا بنا ہو۔ میں اپنے خیالات کو بے راہ روی کا شکار نہ ہونے دیتا۔ کلاس میں بھی میں اپنا سبق دھیان سے پڑھتا تھا۔ ہمارے گھر پر ہی ماسٹر جو بھی سوال کرتا، میں فوراً اس کا جواب دیتا تھا۔ ایک دن اس نے ہمیں رومانوی سٹیون سن کی کہانی ''The Sire de Maletroie,s Door'' پڑھائی۔ یہ ہمیں اتنی اچھی لگی کہ ہماری سانسیں تیزی سے چلنے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ مستقبل میں شاید کسی دن کسی وقت بھی کوئی مہ وش بوڑھا مجھے خاموشی سے ایک کمرے میں لے جائے گا اور اس کے ہاتھ میں بتیاں پکڑی ہوئی ہوں گی اور رات بھر وہ مجھے اس کمرے میں رہ کے رکھے گا اور پھر صبح کے وقت اچانک مکمل یقین مجھ پر یہ انکشاف ہوگا کہ ایڈا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔

اور شاید یہ میرا واہمہ تھا کہ جس پیانو کے نام کا چرچا چل گیا تھا۔ میسز واٹرسٹن نے میری موٹی انگلیوں کی چابک دستی کی تعریف کی تھی۔ جلد ہی میں نے موسیقی کی کتاب کا وہ تیسرا حصہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ میرے چھوٹے سے بارہ نے صحیح مدار میں حرکت کرنا سیکھ لیا تھا۔ بعض اوقات جب میں صبح موسیقی کا ریاض کر رہا ہوتا تھا تو مجھے لگتا کہ دریا کے پار میری انگلیوں سے برآمد ہونے اور بکھرتی دھنیں ابھی اتنی پختہ نہیں ہوئی تھیں۔

آخر کار ہمارے سکول کے آرکیسٹرا کا انچارج مسٹر سموئیل میری لکن سے آگاہ ہوئیں۔ وہ مجھے وائلن کے دوسرے گروپ سے نکال کر پہلے گروپ میں لے آیا۔ اظہار تشکر کے دن کے پروگرام میں اس نے مجھے وائلن پر ایک مکمل دھن بجانے کی اجازت دے دی۔

سب سے اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کہا: ''یہ تو ایک دوسرا وائلن ہے۔۔۔۔ یہ ہمارا پنالبرٹ سپالڈنگ ہے۔''

میرا خیال تھا کہ ایڈا بھی سامعین میں ہوگی۔ میں نے جلدی سے ادھر ادھر دیکھا، مگر مجھے وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ جب میں آرکیسٹرا سے فارغ ہوا تو میں نے ملی سائڈ ایک نامور موسیقار کو اپنا نام پکارتے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''تمہیں میرے بینڈ میں شامل ہو جانا چاہیے کیوں کہ جلدی چھٹیاں ہونے والی ہیں، اس لیے ہمیں جلدی بہت کام مل جائے گا۔''

چچی نے میرا بازو دبایا۔ وہ خاصی دیر تک مجھے اپنے پرائیویٹ بینڈ "منوئیلز آرکیسٹرا" میں شامل ہونے کے لیے کہتا رہا۔ میں اس سے یہی کہتا رہا کہ میرے ذہن میں ابھی سکول کا کام ہی رہتا ہے۔ وہ بیس سال کا آدمی تھا۔ میں اس کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتا تھا کہ ابھی میں بہت کم سن تھا۔ وہ مہینے میں تین چار روز اپنے بینڈ کا کام کر کے سکول کی فیس وغیرہ کا بندوبست کر لیتا تھا اور اس طرح وہ اپنی ماں کی مدد بھی کر رہا تھا۔

اس نے مزید کہا "کل ہم ایک چینی شخص کے جنازے میں بھی بجائیں گے۔ یہی کوئی شام چار بجے تک۔ شام کو ہی ہم رولان کی شادی کی چھبیسویں سالگرہ کے موقع پر پرفارم کریں گے ..... اور تو رومیو نیل ڈانس میں شرکت کریں گے۔"

میں سوچنے لگا۔ ہمارے سامنے سٹیج پر پنیل نے امریکہ کے بارے میں تقریر شروع کر دی تھی۔ امریکہ کی مختلف رسوم و رواج وغیرہ۔ یا بچوں کے موقع پر مرغی کی ہلاکت کے متعلق وہ جو کچھ کہہ رہا تھا تو مجھے اس کی قطعی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں اس کی باتوں میں دلچسپی ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں ان چیزوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو مجھے آئندہ دکھانے تھے۔ کئی دنوں سے میری ایک ہی خواہش تھی کہ میں کسی طرح سے سینیٹرنی کا ریشمی بکس خریدوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب رات گھر میں سناٹا چھا رہا ہو گا تو میں سفید کے سفید پیوند کرتے ہوئے اس پر بیٹھ کے اظہار محبت کرتے ہوئے لکھوں گا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ چھٹیوں کے یہ دن بند ہونے سے پہلے کسی دن میں اسے اپنی کتاب پڑھنے کے لیے دوں گا اور اس کتاب کے ورق میں چپکے سے اپنا محبت نامہ رکھ دوں گا۔ وہ شاید میرے رقعے کا جواب تو نہیں دے گی نہ ہی ڈاک سے بھیجے گئے اور نہ ہی ہاتھ سے لکھے ہوئے کسی رقعے کا جواب آئے گا لیکن کوئی بات نہیں ..... یہ آرزوؤں سے لبالب بھرا ایک خاموش جواب ہو گا۔

رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں دنیا کے بہت سے موسیقی کے مراکز کا دورہ کر کے لوٹا ہوں اور فیڈ کے جبارت میری تعریف سے بھرے پڑے ہیں۔ میں نے رسالوں کے ٹائٹل پر اپنی تصویریں دیکھیں۔ ایک تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ میں چند سال پیشتر بوناونتا کی گلیوں میں کالے رنگ کے گتے کے بکس میں اپنا وائلن چھپائے آوارہ پھرتا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ نیویارک کے ایک لکھ پتی نے مجھے ایک نہایت قیمتی وائلن دینے کی پیشکش کی تھی۔ جس پر یہ الفاظ کندہ تھے "ایک ایسے بڑے فنکار کے لیے جو اپنے ملک کے لیے یقیناً ایک قابل فخر اثاثہ ہے" میں نے اپنے خواب میں اپنے

آپ کو، ہی لکھ پتی کے، ان بڈھن میں، اس کے گھر پر ایک ایند گزار تے دیکھی سفید بلاؤز اور نیلے رنگ کے سکرٹ میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی اپنے دو بھیے سفید ہاتھوں سے تالیاں بجا رہی تھی اور اپنی کانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی "شاباش"

اب لوگ جو محسوس کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ میں اپنے والدین کے اسباق میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ میری خالہ جو دور سے اپنے بچوں سے ملنے کے لیے ان دنوں ہمارے ہاں آئی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ جو نوکرانی آئی ہوئی تھی وہی آج کل صبح کا ناشتا کی دکان سے Pan De Sal کا روٹی لا رہی تھی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب صبح روٹی لانے کی ذمہ داری نبھانے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنی خالہ کا صحیح معنوں میں شکریہ نہیں ادا کر سکتا تھا۔

میں گھر کا سودا سلف لانے کے وقت بھی اب لال پیلا ہونے لگتا تھا۔ میرے والدین کو کام سے ہی چھٹنے کا بہانہ سمجھتے ہوئے، خالہ نے مجھ پر حملہ چست کیا "تم ایک موسیقار ہی کیوں بننا چاہتے ہو؟ پارٹیوں میں آخر میں موسیقار کھانے پینے میں ہی لگ جاتے ہیں۔"

میں نے اپنے آپ سے کہا، شاید باورچی خانے میں کام کرنے والی کسی نوکرانی کی عظمت سے یہ وفادار دیور کے ساتھ پھیلی گئی بدبوں پر نے والے کتوں کے غول کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ تھی ہی اس قسم کی عورت کہ اس کے متعلق یہی باتیں سوچی جا سکتی تھیں۔ اس لیے میں نے سمجھا کہ اس کی باتوں کا زیادہ خوش نہیں لینا چاہیے۔ بہرحال اس کے رویہ کس نے مجھے تکلیف ضرور پہنچائی تھی۔ دادی اماں نے بہتر مجھے دھمکیوں سے اپنے سکولوں کی پڑھائی کی طرف توجہ دینے کی تاکید کی تھی۔ میں ہر سوموں کے لیے بار بار رجنی سائنز کے گھر جاتا رہا۔

دادی کا مطالبہ تھا کہ میں اپنی ساری کمائی اسے دے دوں۔ اور میں انکار نہ کر سکا۔ علاحدگی میں، میں نے اپنی رقم کو گنا اور فیصلہ کیا کہ میں اس وقت تک اس کو واپس نہیں لوں گا، جب تک یہ اتنی نہ ہو جائے کہ میں اس سے ایک بروچ خرید سکوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں ایدا کو بروچ خرید کر کیوں دینا چاہتا تھا۔ بہرحال یہ بات میرے ذہن میں گھر کر گئی تھی۔ میں دکانوں میں بروچ تلاش کرتا رہتا تھا۔ چینی نسل کے سیلز مین مجھے کم سن جان کر بروچ کی قیمتیں پوچھنے پر بہت چڑچڑے ہوتے تھے۔

آخر کار کرسمس کا موسم آ گیا۔ میں نے ایدا کے گھر چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ اس کے والدین تو بیدا جور میں رہتے ہیں، میرے دل میں ہول سا اٹھنے لگا۔ میں نے اس پر اپنی

محبت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ میرے خطوط ان کھلے رہ گئے تھے اور اجنبی کی کتاب بھی میں اسے پڑھنے کے لیے نہیں دے سکا تھا۔ پورٹو ریکو کی تلاش بھی ابھی جاری تھی اور جس قسم کا پورٹو ریکو میں چاہتا تھا وہ مجھے مل نہیں رہا تھا۔ ہماری رقم تو وہ بھی دادی اماں کے اس پرس میں تھی جس میں سے "ناتیجہ باہر" کی بو آتی تھی۔ میں بہت بے چین ہو رہا تھا کہ ہماری تلاش کا کرسمس پروگرام دیکھ آ رہا تھا اور پھر آخر وہ دن آ ہی گیا۔ یہ اپریل کی ایک سرد شام تھی۔ جب ہمارے انگلش کے ٹیچر نے یہ اعلان کیا کہ ہم لوگ آپس میں تحفے کا تبادلہ کریں تو اس وقت میں نے کلاس روم چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اسی وقت بیٹی دروازے پر پہنچ گیا۔ وہ مجھے بلا رہا تھا۔ جب ہم پورٹو میں پہنچے تو بیٹی بولا "میں تمھیں ایک راز کی بات بتانے لگا ہوں۔"

اس نے مجھے بتایا کہ اگلے اتوار کو فیلا سے صبح کے سینسر کے ذریعے ڈان اسٹیبن (Dan Esteban) کی دو بیویاں جورجی اور ایلسیا آ رہی تھیں اور بوناورنا کے دو مرد طلب کی طرف سے ان کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ ماتھا عورتوں کو دوسری عورتیں بہت پسند کرتی تھیں۔ سالوں پہلے جب وہ نوجوان تھیں تو ان عورتوں نے جورجی کے ساتھ پیانو اور ایلسیا کے ساتھ مرد بجانے کی تربیت حاصل کی تھی۔ جب بیٹی مجھے یہ سب کچھ بتا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ صبح سے بگل بجانے کی مشق کرنے کی وجہ سے اس کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے تصور میں شام کو چرچ کی دعا کے وقت میں ان بہنوں کے ریشمی لباس کی سرسراہٹ کو سنا۔ چونکہ وہ بہت عبادت گزار تھیں، اس لیے عورتوں نے ان کی بہت تعریف کی۔ میں یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ وہ جڑواں تھیں اور مرد زیادہ ہونے کے باوجود وہ ایک جیسا لباس پہنتی تھیں۔ ان کی دادی نے بتی جیسی اور موسم گرما کے ہیٹ دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ اس جورجی نے بوڑھے ڈان اسٹیبن کی ہدایت پر میرے دادا کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ میں حیران ہوا کہ پچھلے تیس سال سے فیلا میں رہتے ہوئے وہ اپنے لیے مناسب شوہر تلاش کرنے میں کتنی کامیاب رہی تھیں۔

بیٹی نے کہا "یہ تو ان کی پارٹی ہوگی۔" پھر اس نے پورٹو میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بہت رازداری کے انداز میں کہا "انھوں نے ہمارے بینڈ کی خدمات حاصل کی ہیں۔"

میں کلاس روم میں واپس پہنچا اور میں نے ہر ایک کو کرسمس کی مبارکباد دی۔ جب میں نے ایک کونے میں ایوا کو دو لڑکیوں کی طرف سے دیے گئے تحفے کے ڈبے کھولتے ہوئے دیکھا تو مجھ میں بھی

اسے مبارک باد دینے کی جرأت پیدا ہو گئی۔

جس وقت اس تحفے والے ڈبے سے پاؤڈر کا ڈبہ اور عطر برآمد ہوا تو میں نے اسے گھریلو میں "نیوی بر کس" کہا۔ میں نے اس وقت جانا کہ وہ واقعی ایسے تحفوں کی حق دار تھی۔ پہلے ہی سے کئی لڑکیاں یہ کے گرد جمع تھیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ چوں کہ ایسا جیسے سفید گالوں اور گہرے براؤن رنگ کے سنورے ہوئے بالوں سے محروم تھیں، اس لیے ان کی آنکھوں میں حسد کی چمک تھی۔

میں خود بھی دم بخود سا تھا اور نہیں جان سکا کہ جواب میں مجھے ایدا نے کیا کہا تھا۔ بہر حال میں نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا اور پوچھا "کیا تم چھٹیوں میں یہاں نہیں رہو گی؟"

اس نے کہا "نہیں۔۔۔۔ میں یہیں رہوں گی۔"

جب اس نے بتایا کہ اس کی کزنز آنے والی تھیں اور ان کے اعزاز میں ایک زبردست پارٹی کا انتظام کیا جانے والا تھا تو میں نے خود سے کہا "اچھا تو تمہیں پہلے ہی سے سب کچھ معلوم ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ مجھے پارٹی کی اصل نوعیت کے بارے میں اسے بتانا چاہیے تھا۔

لیکن جب کہ وہ جانتی تھی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ پارٹی کس قسم کی تھی۔ وہ سن کلب کی کرتا دھرتا عورتیں ادھر ادھر دوڑتی بھاگتی یوں ظاہر کریں گی جیسے وہ چشمہ یا کسی اور قسم کی پارٹی میں نیکوں اور مہمانوں کے لیے دوڑ دھوپ کر رہی ہوں۔ آخر میں ریوا اس فیملی کی سنیئر ہونے کے لحاظ سے ان سے بڑھ کر کارکردگی دکھائیں گی۔ مختلف قسم کی مٹھائیوں اور خاص طور پر سوئس (Swiss) چاکلیٹ کی بنی ہوئی مختلف قسم کی چیزیں کے بکس پیشیاں کے ہمراہ آئے ہوں گے۔ میں تصور میں ایک خوش نما جگہ ہوئی بھی میز کو دیکھ رہا تھا، جس کے درمیان سرخ پتھر کا چمک دار پیالہ پڑا تھا، جس میں پرے سے پھول پتی بہار دکھا رہے تھے۔ مقامی انتظامیہ سے متعلق عورتیں کو کہ بہت مخلصانہ طور پر ہاسکی مہارت دکھائیں گی اور بھرپور طریقے سے اپنا معیار برقرار رکھنے کی کوشش کریں گی، مگر پھر بھی وہ ان لڑکیوں کی بیبیوں کے معیار سے آگے بڑھ نہ پائیں گی اور شاید میرے خیال میں ایدا کو اس بات کا علم تھا اور یوں میں اور یہ دونوں بے چاری مقامی عورتوں کی امیدوں کو بھی بے کار ہوتے محسوس کر سکتے تھے۔ ایدا اور میں بھی اس صورت حال کو محسوس کر کے قہقہے لگا سکتے تھے۔

مقررہ شام کو سات بجے ہمارا چھوٹا سا جیپ ڈان لتھیان کے گھر کے دروازے پر خاموشی سے آن رکا۔ وہ جب عورتیں، جنہوں نے بھاری شالیں اوڑھ رکھی تھیں اور جن کا دوسرا لباس بھی زرق

برقی قمقموں کا تھا، پر جوش انداز میں چلنے لگیں تو ہمیں "شام اور سماں" کے عنوان سے ابتدا یہ کی دھن بجانے کا حکم دیا۔ جب چینی نے بینڈ کو ہدایت دینی شروع کی تو اس کی آنکھیں خود کو اس بڑی دعوت کا حصہ محسوس کرتے ہوئے چمکنے لگیں۔ بوڑھے چینی کے باغبانوں نے رنگ برنگی روشنیاں منڈیر پر سجا رکھی تھیں اور جب یہ روشنیاں جل اٹھیں تو عورتیں فوراً بولیں کہ ان لڑکیوں کی بیویوں نے بھی آخر کار کچھ تیاریوں کی ہوئی ہیں۔ چینی نے روشنی کی چمک سے نیچے کے لیے سر نیچے کر لیا تھا۔ اگر عورتیں اپنی تکلیف محسوس کریں تو وہ اس کا اظہار نہیں کرتیں۔

ابتدا یہ جب اپنے عروج پر پہنچا تو اسی دوران سفید قمیصوں میں ملبوس پانچ آدمی کھانے پینے کی چیزوں کے بڑے بڑے بکس لیے گھر میں داخل ہوئے۔ میں نے یونی فارم والے کو ان میں سے ایک ماہی گیر پہچان لیا تھا۔ مبارک بادیوں کا سلسلہ تھا۔ عورتوں کے ہجوم نے گھر پر یلغار کر دی اور اس سے پہلے کہ ہم "کلابوں کا کلمہ" یا "ماہی" جیسی بجانا شروع کرتے، دور کمرے کے آخر میں کھچے بھاری پردے اٹھا دیے گئے اور چھت سے لٹتے خوب صورت فانوس کی روشنی میں ایک لمبی سجی سجائی میز دکھائی دی۔ مجھے یاد ہے کہ گیت کی دھن بجانے کے سلسلے میں بے ترتیبی سے جلدی جلدی ہاتھ چلانے والے بینڈ کے ممبران کو ہم نے کھانا کھانے کی فوری خواہش کو دبائے رکھنے کو کہا تھا۔ جو ان بہنوں میں سے ایک جو زیادہ خوب صورت تھی اس نے کہا۔ "خواتین۔۔۔۔ آپ کے آنے کا بے حد شکریہ!"

عورتوں نے کورس کے انداز میں جواب دیا "لیکن تم نے ہمیں تیار ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا۔"

عورتوں کے خوب صورت ملبوسات کی سرسراہٹ اور ان کے کانوں میں لہراتے چمک دار بندوں کے درمیان ان کا احتجاج جس میں آہیں شامل تھیں سنا جا سکتا تھا۔ میں نے ایدا کو ایک لمبا سفید گاؤن پہنے دروازوں میں پھولوں کا گجرا سجائے ہوئے دیکھا۔ اس کے حکم پر وہ ملازمین موسیقی والے کمرے سے ایک چمک دار بریط اٹھا لائے۔ چینی کے ملازمین ننگے پاؤں چل کر آ رہے تھے اس لیے وہاں ہونے والی ہلکی سے ہلکی آہٹ بھی سنی جا سکتی تھی۔ جب ایدا نے بریط کو ہمارے قریب رکھنے کا اشارہ کیا تو میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آ گیا۔ جلدی وہ ہجوم میں گم ہو گئی اور ہم نے "گلکوہاں" نامی دھن بجانی شروع کی۔ میں جب تک اپنی آنکھوں کو بند رکھ سکتا تھا انھیں بند رکھا کیوں کہ ایسے میں اس کی یعنی ایدا کی روشن شخصیت میرے سامنے رہی۔

ویلیسیا نے بربط بجایا اور بے پناہ تالیوں کے شور میں، اس نے، اس کی فرمائش پھر پوری کی۔
بعد میں جوزیفا نے گیت گایا۔ اگرچہ اس کی آواز قدرے بھاری تھی، مگر اس نے بھرپور داد پائی۔ دوبارہ
فرمائش پر، اس نے "موسم گرما کا آخری گلاب" گایا اور یوں اس کے گیت سے گزرے دنوں کی یاد میں
لوٹ آئیں۔ موسیقی کے اسباق کی یادوں میں گھرے ہم نے محسوس کیا، جیسے سارے جہاں میں درختوں
کے سبز پتے بہار دے رہے ہوں۔ اس وقت ڈان دمیتیان آ گیا۔ شروع میں، اس نے بازاری عورتوں سے
فطری انداز میں شرماتے ہوئے پی سوچھوں کو مسترد کر دیا تھا اور ویلیسیا نے خوب صورت انداز میں مہمانوں کو
خوش آمدید کہا تھا۔

وہ بہت دیر تک بربط پر چھیڑی گئی دھن کو سنتا رہا اور سرگوشی کے انداز میں اپنے آپ سے
کہتا رہا:

"یہ خدا تو خود گا رہا ہے۔۔۔۔ خدا خود گا رہا ہے۔"

آدھی رات کے وقت یہ جشن کا ختم ہوا۔ جب لوگ کھانے کے لیے بڑی میز کے گرد جمع ہوئے
ہم اس وقت تک دھن بجاتے رہے۔ میرا ذہن سمندر پار موجود، دور دراز کے ان ملکوں کے سفر پر رہا،
جن کے میں خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ دونوں بہنیں ان ساری عورتوں میں بہت ممتاز اور منفرد دکھائی دے
رہی تھیں۔ پھر جیسے کسی کو ہماری خبر آ گئی تھی اور آخر کار چینی سائے نے ہمیں موسیقی کے ساتھ ایک طرف
رکھ دیا۔ ہم ننگے پاؤں والے ملازموں میں سے ایک کی رہنمائی میں باغ میں ایک قطار میں چلتے
ہوئے داخل ہوئے۔ ہمارے پیچھے چمن میں بلند ترین زنانہ آواز میں چند لوگ کسی رسالے میں مرد
کی محبت میں "La Palomg" گاتے ہوئے لیٹے تھے۔ میں نے پیچھے مڑ کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ
کون تھے۔ چینی کے برتنوں اور چاندی کی چمک نے ہمیں چندھیا دیا۔ وہاں ہماری توقع سے بڑھ کر
خورد و نوش کی اشیا موجود تھیں۔ میں نے مختلف کھانوں کے نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا
میں تو بس یہ جانتا تھا کہ وہ کھانے پینے کی اشیا کے ذائقے کہاں گئے جو وہ تاتاری عورتوں نے پہلے ہی سے بھجوا
دیے تھے۔ میرے سامنے جو چاندی کا پیالہ رکھا تھا، اس میں، میں نے دیکھا کہ وہاں سمرقند کی
زردی کے مانند کوئی چیز تھی، جس کو شاید شہد اور روغن پودینہ میں ڈبویا گیا تھا۔ آرمینیا کے گروپ میں موجود
ہم ساتھیوں کے خیالات اس دعوت کے بارے میں ایک جیسے تھے اور اس یقین کے ساتھ کہ میں دوستوں
کے درمیان موجود تھا، میں اپنے آپ کو لالچ سے نہ بچا سکا اور یہ حال یہ کہ میں نے خوب جی بھر کر کھانا

کھلا مل کر ان انڈوں کی زردی نما چیز کی ایک کافی بڑی مقدار میں نے کاغذ سے بنے کئی ٹکڑوں میں لپیٹ لی تھی۔ میرے ساتھیوں کے گمان میں بھی نہ تھا کہ میں ایسی حرکت کروں گا، اس لیے میں نے آسانی کے ساتھ ان کی نظروں میں آنے بغیر اس پیکٹ کو اپنی قمیص کے اندر چھپا لیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ پیکٹ کسی کو نظر نہ آئے گا۔

"کیا تم نے کھانا کھا لیا ہے؟"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ ایوا تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری روانی میری گردن پر تنگ ہونے لگی تھی۔ میں کچھ بڑبڑانے لگا پتا نہیں میں کیا بک رہا تھا۔

"اگر تم سب لوگوں کے چلے جانے تک رک جاؤ اور میرا انتظار کرو تو میں تمھارے لیے ان چیزوں کا ایک سا پیکٹ بنا لاؤں گی۔۔۔۔" اس نے کہا۔ میں نے رومال اپنے منہ پر رکھ لیا تاکہ میں اپنے منہ پر لگے غذائی ذرات کو صاف کر سکوں۔۔۔۔ حالاں کہ وہاں غذائی باقیات موجود ہی نہ تھیں۔ اب اگر ایسے میں میرے منہ سے ایوا کے جواب میں "نہیں۔۔۔۔ شکریہ" کے الفاظ برآمد ہوتے تو یقیناً میں نے اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لیے ہوتے۔ میں یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا مگر پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ جو کچھ میں نے کیا تھا، وہ اس کے بارے میں جانتی تھی۔ اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بارے میں میری ساری گرم جوشی جاتی رہی تھی۔

میں قریبی دروازے کی طرف بڑھا اور چاہتا تھا کہ میں ان بڑے بڑے پردوں کے پیچھے اپنی شرمندگی کو چھپا لوں۔ دروازہ برآمدے کی طرف کھلتا تھا، جہاں کبھی میری محبت سورج کی روشنی میں چھلتی پھولتی رہی تھی۔ اور اس وقت اندھیرا تھا اور دریا کے کنارے کے قریب ہوا ہولے سے گنگنا رہی تھی۔

میں نے نیپکن ہاتھ میں لیا اور اندھیرے میں ان انڈوں کی زردی نما اشیا کو پھینک دیا۔ میں نے باغ میں بنے شیڈ کی چھت پر ان اشیا کے گرنے کی آواز کو سننے کا انتظار کیا۔ اس کے بجائے میں نے حلق تک بندھے پرسے پانی کے چھینٹوں کی آواز سنی اور اس سے پرے دادی اماں کے کمرے کی کھڑکی سے برآمد ہوتی روشنی تھی، جو مجھے گھر بلا رہی تھی۔

لیمن پارٹی کوئی رات کے ایک بجے یا اس کے قریب قریب ختم ہوئی۔ جب اتنی مہمان نواز والی عورتوں نے ہمیں خدا حافظ کہا تو ہم اپنی موسیقی کے آلات سمیت وہاں سے چل پڑے۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے جب ہم نے "دنیا کے لیے خوشی" کی دھن چھیڑی تو پروگریسو سٹریٹ کے دکان دار

اپنے بستروں میں لیٹ کر بیٹھ گئے۔ چچی نے جو خاص طور پر ریاد دشوقیں [illegible] ہوئے جب چچی نے ہمارے [illegible] جتنا کو ایک سٹریٹ لیمپ کے نیچے منتشر ہونے کے لیے کہا تو اس وقت تقریباً صبح ہونے والی تھی

گھر کا [illegible] نے میرے ساتھ طے کیا [illegible] ہانی کی دکان پر رک گئے میں نے بتایا کہ میں اپنے پیسوں سے روٹی خرید کر دریا کے کنارے کنارے بنی ہوئی دیوار کے ساتھ ساتھ دادی اماں کے گھر کی طرف چلتے ہوئے اسے کھانا چاہتا ہوں [illegible] اس کے ساتھ ایک یہ بڑی عجیب بات تھی کہ شاید میں ابھی تک بھوکا تھا [illegible] کیے کھڑے تھے تمہارے کے کارکنوں کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے حتیٰ کہ ہمارے جسم دروازے کے پار ہو جو اگر مخوری حدت میں آپ اٹھے تھے۔۔۔ ہی صبح کے پانچ بجے تھے۔۔۔ اور روٹی ابھی پک کر تیار نہیں ہوئی تھی۔۔۔"

☆☆☆☆

زین العابدین الحسینی

خمیس پہلے مرجاتا ہے

۱۔ تعاقب

وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گلی میں مڑا اور عین اسی وقت گولیوں کی بوچھاڑ سے وہ بہ مشکل بچا اور اسی لمحے اس سے ذرا دور خشک مٹی کا ایک مرغولہ سا بن گیا۔

صرف پانچ سیکنڈ۔۔۔۔ اسے بس اتنی ہی مہلت چاہیے۔۔۔۔ ایک قدم۔۔۔۔ وہ۔۔۔"

اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ گلی ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اس بار وہ اپنے تعاقب میں آنے والوں کی زد سے نکل کر سنگتروں کے اس باغ میں پہنچ جائے؟

جب اس نے تیسرا قدم اٹھایا تو اسی وقت اسے ایک کچی مٹی سے بنی کھڑکی کے فریم سے لگ کر کھڑی ایک نوجوان لڑکی کے چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ اسے لڑکی کی آنکھوں میں صاف ایسی چمک نظر آئی جیسے وہ بھی اسے تعاقب کرنے والوں کی گولیوں سے بچ کر نکل آنے کے لیے اسرار ہی ہو۔ اس کی آواز بہ کم سنائی دے رہی تھی اور پرندوں اور درختوں کی گونج میں گم ہو رہی تھی۔ رمین کا یہ فقرہ بھی اس کی مخالفت میں اتر آیا تھا۔ اسے محفوظ جگہ تک پہنچنے کے لیے صرف چھوٹی سی دو چھلانگوں کی ضرورت تھی۔ اس کے اسکول کے ہم جولیوں کے چہرے قطار بنا کر ایک دیوار کی شکل میں اس کے سامنے آ گئے تھے۔ وہ ان کی پروا کیے بغیر اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے بھاگا۔

چوتھے قدم پر اس نے ریوالور کا چہرہ دیکھا، جس کے دونوں طرف زخم کا سوراخ تھا۔ "انقلابیوں کو کبھی ایک ساتھ یوں کتے کی موت مرنا چاہیے۔" اس کو ایک دم دکھ اور شرم کے احساس نے گھیر لیا کہ ابھی تک وہ موت کا یہ ریوالور نہیں برسا تھا۔ آخری قدم اٹھانے سے پہلے جو قدم اس نے اٹھایا تو اس کے ساتھیوں کی آنکھوں نے اس کو آخر تک پہنچنے میں مدد دی۔ اس کو اپنی ماں کا چہرہ نظر آیا، جو سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اسے صحرا کی جانب بڑھتی ہوئی ٹرین کی وسل سنائی دی۔ ہر سوئی ہوئی چیز جاگ اٹھی تھی، لیکن کیا وہ موت کو اس بار شکست دے سکے گا؟ جب اس نے آخری قدم اٹھایا (آغاز اور اختتام کے

درمیان) تو وہ اپنے پیاروں کی آنکھوں کے سامنے میں آ گیا۔ اس نے تیزی سے پیچھوں کا جائزہ لیا۔ پرانی روایت کا حصہ مقرر کر دی جا چکی تھیں۔ اسے اپنے تعاقب میں آنے والوں اور اپنے ساتھیوں دونوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ آخری قدم کے درمیان میں (وسط اور اختتام کے درمیان) اس نے تعاقب کرنے والوں کا شور سنا۔ بندوقوں کی گولیاں مٹی کے ذرات کی طرح اس کے اردگرد دھاڑیں۔ جیسے کے شور میں بہت سے رنگوں کا ملاپ ہو رہا تھا جیسے کہ سبز وغیرہ ..... زیادہ کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا (اس کی آنکھیں ایک بھاری غم سے بھر گئی تھیں کیوں کہ وہ معصوم لوگوں کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا) بہت سے رنگ اس کے سر اور تھے اور دریا کا خون بہہ رہا تھا۔ ..... اور ایک سبز رنگ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر جا رہا تھا۔ زمین کا رنگ اس کے سامنے نئے درخت سے آئی تھی۔ اس نے درختوں کی باتیں اپنی طرف پھیلی ہوئی محسوس کیں وہ اسے چھونا چاہتے تھے، اس لیے اس نے اپنے بازو، جہاں تک وہ انھیں پھیلا سکتا تھا، پھیلا دیے۔ اس وقت اس کی ران ایک پرندے جیسی تھی۔

۲۔ چورلہا

اس نے درخت کے ساتھ ٹیک لگائی اور کچھ سننے کی کوشش کی۔ اس نے بہت غور سے سنا اور درختوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے (درختوں) نے حرکت کی تو اس نے کہا لو بھئی اب تمھاری باری بھی آ گئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ درخت انسانوں کی طرح ایسی مخلوق ہیں جو محسوس کرتے ہیں، سنتے ہیں، روتے ہیں اور بات کا جواب دیتے ہیں لیکن وہ دھوکا نہیں دیتے۔ درخت درختوں کو دھوکا نہیں دیتے۔ اس نے گھاس کو روندتے ہوئے، پیچھا کرنے والوں کے قدموں کی آواز سنی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ان کی تعداد کے بارے میں جان گیا ہے۔ وہ غصے میں تھے اور ان کا ایک ساتھی چھوٹے دائرے میں پیچھے جا رہا تھا۔ وہ اب خوفزدہ تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اب وہ اسے ڈھونڈ نہیں رہے بل کہ ایک دوسرے سے اسے ڈھونڈنے کا بہانہ کر رہے تھے۔ اسے اس بات کا یقین گولیوں کی مسلسل بوچھاڑ سے ہوا۔ گولیاں وحشیانہ طور پر چلائی جا رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اتنی زیادہ اور پھر بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ وہ درخت کے ساتھ بہت شدت سے چمٹ گیا۔ اس نے اپنے اندر ایک تپاک سا جنم لیتا محسوس کیا اور درخت کو اس نے گوشت پوست کا ایک وجود سمجھا۔

یہودیوں کی تیز آوازیں اس کے قریب ہی سے آ رہی تھیں اور اس کے سامنے ہی اچانک دو

آنکھوں سمیت یک چہرہ موجود تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ چیزیں اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔ مگر اس کے سامنے موجود چہرے کے منہ سے دوبارہ بھی آواز نکل پڑی، جو ایک درخت کی طرح ایستادہ تھا تو اس کا بچ نکلنا محال ہو جاتا۔

وہ اس کے سامنے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھی کہ اس کے ذہن سے اس کا چہرہ محو ہونے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس آواز کو نہیں روک سکے گا، جو ابھی حلق میں ابھرنے والی تھی تاہم ایسی کوئی نوبت نہ ہوئی۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ ایک کے بعد ایک کیسے واقعات رونما ہو رہے تھے اور اس خوف کی شدت کو یہ تمام باتیں کیسے انوکھے انداز میں کم کر رہی تھیں۔ اس سب کچھ کو جو اس کے ساتھ پیش آ رہا تھا، اتنی تیزی کے ساتھ کیسے سمجھا جا سکتا تھا۔ بہرحال ایسے ہی ماحول میں لڑکی نے پُراسرار سے رازدارانہ لہجے میں، آہستہ سے اسے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔

۳۔ مکالمہ

"میں جانتی ہوں تم ان میں سے ایک ہو۔"

یہ سن کر اس کی آنکھیں بچوں جیسی خوشی سے جگمگا گئیں۔ لڑکی کے چہرے پر کئی طرح کے رنگ لہریں لینے لگے تھے۔

"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں ایک مدت سے تمہاری منتظر تھی۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب چلی تھیں۔

"انھوں نے زیاد کو مار دیا ہے۔ انھوں نے اسے سوتے ہوئے مار دیا۔"

"درخت تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں۔۔۔۔ اس لیے تمھیں آنا ہی تھا۔"

۴۔ سہیلہ خمیس سے محبت کرتی ہے

جیسے بلی اپنے مدرقطر سے کو چھپا لیتی ہے، ایسے ہی سہیلہ نے خمیس کو چھپا لیا۔ وہ اسے ایک کیموفلیج خندق میں لے گئی۔ وہ یہ خندق دیکھ کر حیران رہ گیا مگر اس نے اسے بتایا کہ اس نے اسے اس کے آنے سے پہلے تیار کر لیا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اس نے آنا ہے۔ وہ خاموش ہو رہی اور اس کی آنکھوں میں در آنے والے آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کے رنگ تبدیل کر دیے۔ اس نے سرگوشی کے

انداز میں کہا "میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں تمہارے انتظار میں روتی رہتی تھی۔"

وہ دونوں دو مختلف پتھروں پر بیٹھ گئے۔ خمیس نے سہیلہ سے پوچھا۔

"اس سنگتروں کے باغ کا مالک کون ہے؟"

اس نے بتایا

"میرا باپ ایک ماشکی ہے۔" پھر ہنستے ہوئے کہنے لگی "اور میں اس کی بیٹی ہوں۔"

اس نے انتظار کیا کہ شاید وہ کچھ جواب میں کہے لیکن جب وہ خاموش رہا تو وہ کہنے لگی۔

"میں درختوں کو اپنے دل کی گہرائی سے جانتی ہوں۔ میں ان کی عمریں بھی جانتی ہوں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مالک گرمیوں کے موسم میں اپنے خاندان کے ساتھ یہاں تفریح کرنے اور پھلوں پر سواری کرنے کے لیے آتا ہے۔ لیکن جب وہ یہاں آتے ہیں تو میں سمجھتی ہوں کہ وہ میرے اور میرے باپ کے مہمانوں کی طرح ہوتے ہیں۔"

اس نے خمیس کی آنکھوں میں جھانکا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"یقیناً جو نوزمین دار کی بیٹی یہ بھی نہیں جانتی کہ درخت چوتھے سال پھل دینے لگتے ہیں۔"

خمیس مسکرایا اور بولا

"کیا واقعی؟" پھر اس نے اسے بتایا کہ وہ اس پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہے جتنا کہ پتے اپنی جڑوں پر کرتے ہیں۔ اس پر سہیلہ نے اس سے کہا "تو پھر تم مجھے قلعے کے وقت کے حادثے سے آگاہ کرو۔"

اس نے دروازے پر دوبارہ دستک دی اور رک گئی۔ اس نے اس عمل کو دہرایا۔ دروازہ کھل گیا اور ایک بوڑھے فلسطینی کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کی جانب دیکھا، پھر آہستہ سے اس کا بازو کھینچتے ہوئے، اس نے دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ اس نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا

"وہ کیسا ہے؟"

اس نے اپنے سیاہ لباس میں سے ایک تہ کیا ہوا خط برآمد کر کے اسے دیا۔ اس کے واپس جانے سے پہلے اس کے باپ نے اس کا سفید ماتھا چوما۔

اس نے ایک نئی بندوق وہاں سے لی اور کہا "مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح ـــــ"

وہ چند لمحوں کے لیے ہچکچایا لیکن بالآخر اس نے اسے بندوق کا استعمال سمجھایا۔

بڑی گلی کے بالکل درمیان میں خون کا ایک دھبا موجود تھا اور بارود کی بو رچی ہوئی تھی۔

وہاں جنوبی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں سے ایک خون کا دھبا صاف کر رہا تھا اور دوسرا لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اعلان کر رہا تھا "کرفیو" کسی کو معلوم نہ تھا کہ جب ہم پہنچے تو سپیکر وہاں موجود تھی۔

اس نے اپنے ناراض باپ کو بتایا "میں جانتی ہوں کہ مجھے اپنے آپ کو ان سے کیسے بچانا ہے۔" اور اس نے خمیس کو بتایا "میں نے تمھیں اپنا شوہر تسلیم کر لیا ہے۔"

۵۔ عہدوپیمان

وطن کے لیے زندگی کے آخری لمحے تک ایک دوسرے سے محبت کرنا۔

۶۔ جنگ

افق نیلا ہو رہا تھا۔ مغرب میں ختم ہوتی رات کے جلو میں آہستہ آہستہ صبح نمودار ہو رہی تھی۔ خمیس سویا نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں خندق کے داخلے کے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔

خمیس نے اس کے ہموار سانس کی آواز سنی۔ اس نے اس کے بچوں جیسے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "ملک پر قبضے کے وقت بچے اتنی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟"

سیدی خیندہ رحمت میں ڈوبی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی "خمیس"

وہ اس کے نزدیک آتے ہوئے بولا "سوچاو ... ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔"

وہ بولی "اب نگرانی کرنے کی باری میری ہے۔"

وہ ہنسا اور اس کے گھنے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگا "کمانڈر تمھیں اس ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔"

وہ اٹھی اور اس نے گن اٹھاتے ہوئے کہا "کمانڈر کی بیوی کو کوئی رعایت حاصل نہیں ہوتی۔"

کافی دیر تک وہاں خاموشی چھائی رہی پھر وہ بولی۔

"کیا تمھیں صبح سے پہلے سونے کی توقع ہے؟"

خمیس نے ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کیں اور کہا۔

"کیا میں نے تمھیں بتایا تھا کہ میں نے اپنی ماں کو پچھلے تین سال سے نہیں دیکھا۔ اس کا وہ کیمپ ہی میں رہتی ہے۔"

سہیلہ نے خمیس کے ہاتھ کو اس وقت آہستہ سے چھوڑا، جب وہ مشین گن پکڑ رہا تھا۔ خمیس نے درختوں کی رہنمائی بخش کر کے اپنے اندر محسوس کیا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے لیے اندھیرے کی دیوار کو عبور کرنا چاہا۔ وہ اس کی طرف جانے والے راستے کی طرف گیا۔ اس کی آواز میں دکھ بھرا ہوا تھا۔

"انھیں ہم سے زیادہ تیزی کے ساتھ حرکت نہیں کرنی چاہیے۔۔۔۔ انھوں نے اسلحے کے کئی ڈپو دیکھ لیے ہیں اور انھیں تباہ کر دیا ہے وہ روزانہ معمولی سے شبے پر انھیں موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔"

پیاری بھندک اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی چلی گئی۔ وہ اسے احتیاط کے ساتھ کھڑے ہوئے پاکر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پہلی بار انھوں نے ایک ہی قسم کے خطرے کو اکٹھے محسوس کیا۔ اس نے خواہش کی کہ کاش وہ دونوں اس لمحے یک وجود میں سما جائیں۔ اس کے اندر خمیس کے لیے بے پناہ محبت کا جذبہ امڈ پڑا۔

خمیس کی آواز میں تلخی تھی، جب اس نے یہ کہا کہ "ہم جنگ کرنے جا رہے ہیں۔"

سہیلہ کو محسوس ہوا کہ اگرچہ موت ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے لیکن اسے اس وقت کی ہوئی فکر تھی۔ بہت سی خواہش تھی کہ ان دونوں کو اکٹھے موت آئے۔ اس نے بندوق کی نالی ایک دوسرے کھلے مقام پر رکھ دی۔

خمیس کی آواز سینکڑوں بوسوں کے اثر سے لبریز تھی، جب اس نے کہا "سہیلہ ہم اکٹھے لڑنے جا رہے ہیں۔" وہ رک گیا اور سہیلہ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنے والا تھا۔ سہیلہ نے اسے کہتے ہوئے سنا

"لیلیٰ"

سہیلہ کی خواہش تھی کہ وہ آگے کچھ نہ کہے بس یہ کہے کہ "ہم اکٹھے لڑنے جا رہے ہیں۔" بس یہی وہ سننا چاہتی تھی۔ سوائے اس کے کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔

خمیس اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہتا تھا۔ کیا وہ سہیلہ کے چہرے کو خاک میں لتھڑا ہوا یا کسی گولی کے سوراخ سے مسخ شدہ حالت میں دیکھنے کی جرأت کر سکے گا؟

خمیس نے اس کی دھیمی آواز سنی "میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

ایک پریشان کن خیال خمیس کے ذہن میں آیا "کیا وہ یہاں اس کی موجودگی کے بارے میں جان گئے ہیں یا وہ کچھ اور تلاش کر رہے ہیں؟" سہیلہ کی فیصلہ کن آواز کانوں میں پڑی "وہ جانتے ہیں کہ ہم یہاں ہیں۔"

اس کی گفتگو میں اس لاؤڈ سپیکر کی آواز سے خلل پڑ گیا، جو خمیس کو ہتھیار پھینکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

خمیس نے سہیلہ کی طرف دیکھا۔ سہیلہ نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے اپنے دل میں جنم لینے والے اس خیال کو جھٹکنے کے لیے اپنی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹا لیں۔ "کیا میری موجودگی اس کے ہتھیار نہ پھینکنے کے جذبے کو متاثر کر سکتی ہے؟"

"میں تباہ ہو جاؤں گی، مگر خمیس نے کہا کہ میں تمہاری ذات کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا۔ اس انوکھی صورت حال کے ڈر سے آنسو اس کی آنکھوں سے امڈ پڑے۔

خمیس کی محبت بھری آواز اس کو سنائی دی "کیا تم رو رہی ہو؟"

اس نے جواب دیا "میں تمہارے قریب رہنا چاہتی ہوں۔ تمہاری قربت مجھے بہت عزیز ہے۔"

لاؤڈ سپیکر کی آواز، اس کی آواز پر حاوی ہوتی چلی گئی اور وہ اس کے ادا کیے گئے الفاظ پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بولا "تم اگر یہاں سے چلی جاؤ تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔" خمیس نے مزید کہا۔

"وہ نہیں جانتے کہ تم یہاں ہو۔۔۔۔ تمہیں صرف میں درکار ہوں۔"

وہ چلائی

"خمیس ہم کہتے ہیں۔۔۔۔ ہم کہتے ہیں۔"

وہ اسلحے کے صندوق کی طرف بڑھا اور اس نے بندوق کے لیے گولیوں کے دو زائد بکس اٹھا لیے۔ اس طرح وہ بھی اسلحے کی طرف بڑھی اور اسی لمحے لاؤڈ سپیکر چنگھاڑا "ہم تمہیں صرف دو منٹ کی مہلت دیتے ہیں۔"

وہ اس سخت وارننگ کو سن کر سخت برہم ہوا۔ وہ فائر کھولنے ہی والا تھا۔ اس نے سہیلہ کو گولیوں کے دو بکس اور ایک بم ہاتھ میں پکڑے ہوئے دیکھا۔

وہ سینہ تان کر کھڑی ہوگئی

"کمانڈر۔۔۔۔ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ کسی کو کوئی رعایت حاصل نہیں ہوتی؟"

خمیس نے محسوس کیا کہ ایسا کہتے ہوئے، اس کے لہجے میں بچگانہ پن نمایاں تھا۔ وہ تقریباً سسکیاں لیتی ہوئی کہتی رہی

"یا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم مجھ پر ایسے اعتماد کرتے ہو، جیسے بچے اپنی جڑواں پر کرتے ہیں؟"

وہ فائر کرنے والی جگہ پر آ گئی۔ اس نے بہت پرجوش انداز میں پوچھا

"کمانڈر۔۔۔۔ پہلی گولی کون چلائے گا؟"

خمیس نے اس کے وجود کو، دور بہت دور، اپنے اندر اترتے ہوئے محسوس کیا۔ جب سہیلہ نے پہلی گولی چلائی تو وہ یہ سوچ کر دکھی ہوا کہ اس سارے وقت میں، وہ اس کے اور اپنے بارے میں سوچنے کے بجائے اپنے سر پر منڈلانے والی موت کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس لمحے وہ سہیلہ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسی وقت باہر سے گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہوئی۔

۷۔ خمیس پہلے مرجاتا ہے

جب خمیس کو پہلی گولی لگی تو سہیلہ کو اس کا علم نہیں ہوا۔ اس لمحے اس نے خمیس کو صرف یہ کہتے ہوئے سنا "وہ درختوں کو بھی مار دیتے ہیں۔"

لیکن سہیلہ نے اس کی آواز میں کوئی گڑبڑ اور محسوس کر لی تھی۔ (خمیس نے خود اس بات کو محسوس نہیں کیا تھا) سہیلہ نے خمیس کی طرف دیکھنے سے پہلے بہت ساری گولیاں چلا دیں۔ اس نے خمیس کے کندھے پر خون کا ایک گول دھبہ دیکھ کر کچھ کہنے (یا سوچنے) کی ضرورت نہ سمجھی کہ یہ خواہش کی کہ کاش وہ اس کے جسم میں سما جائے اور خون بہنے کا احساس یا مرنے کی خوشی کو اکٹھے اس کے ساتھ محسوس کرے۔ اس نے اپنے جسم میں کوئی چیز رینگتی ہوئی محسوس کی

وہ اس بات پر یقین کرنے پر تیار تھی کہ گولیاں کوئی تکلیف نہیں پہنچاتیں۔

"اس وقت خمیس کیا سوچ رہا تھا؟" اس نے اس کی طرف مڑنے سے پیشتر کئی اور گولیاں چلائیں۔ خمیس کا جسم کئی سرخ سوراخوں سے بھر چکا تھا۔ بہرحال اس کے مرنے سے پہلے تک اسے کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔

وہ تو بس اس بات پر ضرور حیران تھی "کہ کیا بہادروں کو ہمیشہ ایک سے زیادہ گولیاں لگنے کے بعد مرنا ہوتا ہے؟"

خمیس مر رہا ہے۔۔۔۔ خمیس کے ہاتھ نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ اب اس کا ہاتھ اس کا حکم نہیں مان رہا۔ اس نے اپنی شہادت کی انگلی ٹرائیگر پر جمانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس نے اپنے ہاتھ پر تھوک دیا۔ گیت گانے والوں کی آوازیں خمیس کے چاروں طرف پھیل گئیں "ہم سچائی پر ہیں۔" آوازیں اور رنگ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

میگزین کی تمام گولیاں سینے میں دور تک دھنس گئیں۔ "رفتوں" اب اس کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے۔" اس وقت جب خمیس نے پہلی بار اسے اپنے سامنے دیکھا تھا تو اسے ایک درخت ہی سمجھا تھا۔ خمیس نے سعیدہ کی طرف اپنی نگاہیں جما دیں۔ وہ اپنی گن پر جھکی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کے دل میں خواہش جاگی کہ کاش وہ اس کی طرف صرف ایک بار، ایک لمحے کے لیے مڑے تاکہ وہ ان غم اور موت سے بے نیاز تاثرات کے حامل اس کے چہرے کو دیکھ سکے۔

"اپنے وطن پر قبضے کے وقت بچے کتنی تیزی سے کیوں جوان ہو جاتے ہیں؟"

خمیس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر اس نے محسوس کیا کہ کوئی انھیں بند کیے جا رہا ہے۔۔۔۔ سہیلہ کے ہاتھ اس کی آنکھوں کو آہستہ سے بند کر رہے تھے۔ اب وہ سنتا ہے۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر طور پر سن سکتا ہے۔ وہ سہیلہ کے لباس کی سرسراہٹ، اس کے دامن کے ملنے اور ٹرائیگر پر اس کی انگلیوں کے دباؤ کو بھی سن سکتا ہے۔ وہ حیران تھا کہ اندر کی یہ چھوٹی چھوٹی آوازیں، دھماکے کے شور پر کیسے غالب آ رہی تھیں۔ دھماکا چیخ، ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ وہ اپنی بند آنکھوں سے بھی زیادہ کو اپنے سامنے پا رہا تھا۔

اس نے دو ہونٹوں کو اپنے گال پر چپکتے ہوئے محسوس کیا اور یوں وہ میٹرے کے ایک بے کنار سمندر میں تیرنے لگا۔

سہیلہ کے پیٹ میں چھوٹی چھوٹی اور عجیب سی چیزیں حرکت کر رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ابھی

مری نہیں لیکن وہ زندہ بھی تو نہیں۔ اس کی آنکھوں نے بہت سے زخموں کے سوراخ دیکھے تو وہ چلائی۔

"ایو رپر بے شمار گولیاں چلاؤ۔۔۔۔ جب کل بارش ہو گی تو ہمارا کمرہ پورے کا پورا دھو جائے گا۔۔۔۔ تم میری بات سن رہے ہو؟"

اس نے پنجوں کے بل جھکا۔ اس کا منہ خیس کے کان کے قریب آیا

"کیا تم میری بات سن رہے ہو؟۔۔۔۔ ہمیں ابھی بہت سے کام کرنے ہیں"

سہیلہ نے اس کا ہاتھ دبانے کی کوشش کی "کیا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں تمہاری ماں سے ملنے گئی تھی؟"

سہیلہ کی انگلی خیس کے سینے کے ایک گہرے شگاف سے ٹکرائی۔ سہیلہ نے اس زخم کے کنارے پر محبت سے اپنی انگلیاں پھیریں۔

سہیلہ نے دوسرے شگاف تلاش کرنا شروع کیے۔۔۔۔ "تین چار۔۔۔۔" یہ چار ہیں خیس

"سہیلہ نے خیس کا ہاتھ تھاما اور اپنے سینے پر بھی رکھنے کی کوشش کی۔۔۔۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔۔۔۔"

☆☆☆☆

چنگیز آتن توف

سپاہی کا بیٹا

وہ ابھی کوئی پانچ سال کا ہوگا جب اس نے اپنے باپ کو دیکھا اور وہ بھی فلم میں۔ یہ اس برس سے سفید بھیڑوں کے بارے کی بات ہے جہاں بھیڑوں کے گلے سارا دن اتروانی کے لیے لائے جاتے ہیں۔ یہ سہیلیت کی چھت والا بھیڑوں کا باڑہ آج بھی اسی طرح ریاستی فارم کی رہائشی سکیم سے تھوڑا دور سڑک کے قریب پہاڑی کے دامن میں موجود ہے۔

وہ اپنی ماں جیین گل کے ساتھ یہاں آیا تھا جو ریاستی فارم پوسٹ آفس میں ٹیلی فون آپریٹر تھی۔ ہر سال گرمیوں میں جب اون کترنے کا زمانہ ہوتا تو جیین گل ایک عارضی ملازمہ کی حیثیت سے اس باڑے میں آجاتی۔ بوتی ہر موسموں کی پیدائش کے دنوں میں سوچ بچار کر اور ہمت لگا کر جو کچھ تنخواہیں اس نے حاصل کی ہوتی تھیں وہ انھیں یہاں استعمال میں لاتی تھی۔ یہ ایک جز وقتی کام تھا اور اس کا معاوضہ بھی معقول تھا۔ سپاہی کی بیوہ جیین گل کے لیے یہ فاضل آمدنی بڑی بہت کارآمد تھی۔ اس کا کبھی کوئی رویہ ایسا نہیں تھا۔ بس وہ تھی اور اس کا بیٹا۔۔۔۔ لیکن بہرحال کنبہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اسے سردیوں میں ایندھن کی قیمتیں چڑھنے سے پہلے آنے والی ایک معقول مقدار کی ضرورت تو رہتی ہے اور پھر کپڑوں اور جوتوں کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے اور اسی طرح کی دوسری بے شمار ضرورتوں کا سامنا رہتا ہے۔

چوں کہ گھر پر اس کے بچے کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی اور نہیں تھا اس لیے وہ صبح باڑے میں اس کو اپنے ساتھ لے آتی تھی۔ جہاں وہ سارا دن میلا کچیلا ہوتے ہوئے بھی اون کترنے والوں کے ہاتھوں میں موٹے بھاری بوروں والے رکھوالی کے کتوں کے درمیان ہنستا کھیلتا اور روتا پھرتا تھا۔

اس دن یہ وہی تھا جس نے سب سے پہلے فلم کے ٹرک کو باڑے کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور سب سے پہلے اس نے یہ خوشخبری سنائی تھی

"ماما آیا ماما۔۔۔۔ ماما آیا ماما"

اس نے نہایت بے تابی سے شام ہونے کا انتظار کیا اور جب اندھیرا پھیل گیا۔۔۔ تو فلم

کا آغاز ہو بہر حال اسے اس کے صبر کا پھل مل گیا تھا۔ یہ فلم جنگ کے بارے میں تھی۔ بازے کے آخر میں دو ٹیموں کے سارے پھیلی ہوئی سفید سکرین جنگ کا میدان بن گئی۔ گولیاں چلنے لگیں۔ توپیں دغنے لگیں اور تاریکی کو چیرتے ہوئے ان کے گولے اور راکٹوں کے شعلے سپاہیوں کو زمین سے چپکے رہنے پر مجبور کر رہے تھے جوں ہی یہ شعلے بجھتے سپاہی ایک بار پھر آگے کی طرف بڑھنے لگتے۔ اور رات کے اندھیرے میں مشین گنیں یوں تڑ تڑ چل رہی تھیں کہ بچے کے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ ہاں جنگ ایسی ہی ہوتی ہے۔

وہ اور اس کی ماں اون کی کانٹوں پر جو بازے کے پچھلے حصے میں پڑی تھیں چڑھ کر بیٹھے یہاں سے سکرین بہتر طور پر دکھائی دیتی تھی۔ البتہ وہ وہاں فرش پر سکرین کے قریب اپنے مجولیوں کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا مگر ماں نے اسے وہاں نہیں بیٹھنے دیا۔

"تم سارا دن کافی اچھل کود کرتے رہتے ہو" وہ بولی۔ "صبح سے لے کر رات تک تمہارا یہی کام ہے۔ بس اب یہیں بیٹھو تم میرے قریب۔" یہ کہتے ہوئے ماں نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

پروجیکٹر چلتا رہا اور جنگ جاری رہی۔ بازے میں موجود لوگ بڑی شکر تا کے ساتھ جیسے فلم دیکھ رہے تھے۔ فلم دیکھنے کے دوران میں جیمز کل بعض اوقات گہرے گہرے سانس لینے لگتی اور جب وہی ٹینک سیدھا اپنی طرف ہی بڑھتا ہوا محسوس کرتی تو خوف اور دہشت میں اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ چمٹا لیتی۔ اس کے قریب ہی ایک عورت منہ سے عجیب طرح کی آوازیں نکالتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

"ہائے میرے اللہ ---- یہ سب کتنا خوفناک ہے۔"

لیکن لڑکا کچھ زیادہ خوف زدہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں کہ اس کے برعکس جب وہی ٹارزن سپاہی نیچے گرتا تو وہ ایک طرح کی خوشی محسوس کرتا۔ جب وہ اپنے سپاہیوں کو گرتا ہوا دیکھتا تو اسے لگتا کہ وہ ابھی اٹھ کھڑے ہوں گے۔

جنگ میں وہ اپنے مضحکہ خیز انداز میں گر رہے تھے جیسے لڑکے بالے جنگ کا کھیل کھیلتے ہوئے گرتے ہیں۔ اور گرتے ہوئے وہ بھی اسی انداز میں گر سکتے تھے جیسے کسی نے اسے ارا لگا دیا ہو۔ یوں تھوڑی سی چوٹ تو لگتی ہے مگر بھلا کتنی چوٹ سے کیا ہوتا ہے۔ ایک لمحے بعد ہی اسان سنبھل کر پھر حملے کی پوزیشن میں آ جاتا ہے اور یوں وہ معمولی سی چوٹ بے معنی ہو جاتی ہے۔ لیکن فلم میں لوگ گر کر دوبارہ اٹھ کھڑے نہیں ہوتے تھے بل کہ جہاں گرتے وہیں پڑے رہتے تھے چھوٹے چھوٹے سیاہ دھبوں کے

مانند ہے گرنے کا ایک اور مرحلہ بھی معلوم تھا یعنی جس طرح کوئی پیٹ میں گولی لگنے سے گرتا ہے ویسے میں لوگ فوراً ہی نہیں گر پڑتے پہلے وہ اپنا پیٹ پکڑ کر دہرے ہو جاتے پھر آہستہ سے اپنے اسلحے سمیت زمین پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ لیکن کے دوران میں تو گرنے کے بعد فوراً ہی کھڑے ہونے کے بعد اعلان کیا جا سکتا ہے کہ میں مرا نہیں ہوں لیکن یہاں فلم میں لوگ دوبارہ اٹھ ہی نہیں رہے تھے

جنگ جاری رہی۔ پر وجیدہ سے گھر گھر کی آواز آتی رہی۔ اب تو توپ خانہ میدان میں آ گیا تھا۔ خوف ناک آگ اگلتیں اور پھٹتے ہوئے گولوں کے درمیان تو پچی ایک نیک شکل توپ وہاں آ رہے تھے۔ گھاٹی کی ڈھلان پر وہ اسے اٹھاتے ہوئے پہاڑی کی چوٹی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ایک لمبی چوڑی ڈھلان جو آسمان کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور اس لمبی چوڑی ڈھلان پر گولوں سے چھلنی زمین کی مٹی کے سیاہ مرغولوں میں گھرے ہوئے توپچی آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی دشواری اور رکاوٹ وہاں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی کہ دیکھنے والوں کے دل ان کے سینوں میں کسی متوقع خوف اور عظمت کے جذبے سے خم اور فخر کے ساتھ ادھر ادھر کر رہے تھے۔ وہ تعداد میں چھ یا سات تھے ان کے پاس جل رہے تھے۔ ان میں سے ایک توپچی تو نظر ہی نہیں آتا تھا۔ وہ فارق تھا یا شاید بریت۔ لڑکے کو شاید اس بات کا پتہ نہ چلا لیکن اس کی ماں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"بیٹے، دیکھو۔۔۔۔ یہ تمہارا باپ ہے۔"

سکرین پر موجود وہ آدمی ایک دم سے اس لڑکے کا باپ بن گیا۔ ساری فلم اسی آدمی کی کہانی بن گئی۔ لڑکے کے باپ کی کہانی۔ ابھی ابھی دریافت شدہ یہ باپ ریاستی فارم کے لوگوں میں سے سب سے کم عمر نوجوان کی طرح کا ایک نوجوان شخص تھا۔ اس کا قد زیادہ لمبا نہ تھا، دونوں چہرے اور تیز آنکھوں والا تھا۔ کچھ مردہ خوفیں میں لت پت چہرے پر موجود اس کی آنکھوں میں غصے کی چمک تھی وہ ایک ٹی کی طرح پھرتیلا اور تند خو لگتا تھا۔ توپ کے پہیے پر اپنے کندھے کا زور لگاتے ہوئے اس نے مڑ کر نیچے ڈھلان میں موجود کسی سے چلا کر کہا "جلدی سے گولے لاؤ"

لیکن اس کی آواز نئے اٹھنے والے گولوں کی بوچھاڑ میں دب کر رہ گئی۔

"کیا یہی میرا باپ ہے؟" آول بیک نے پوچھا۔

"کون" اس کی ماں نے بے دھیانی سے کہا "آرام سے بیٹھو اور دیکھو۔"

"ابھی تمہی نے تو کہا تھا کہ وہ میرا باپ ہے"

"ہاں ۔۔۔۔وہی تمھارا باپ ہے ۔لیکن چپکے بیٹھے رہو ورنہ تمھاری وجہ سے دوسرے لوگ پریشان ہوں گے "

جیس گل نے ایسا کیوں کہا تھا۔۔۔۔؟ کیا وجہ تھی؟ شاید یوں ہی اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی یا شاید ظلم نے اسے اس کا کھویا ہوا وقار یاد دلا دیا تھا۔ بہر حال کچھ بھی ہو لڑکے کو اپنی ماں کی بات پر یقین تھا اسی لیے وہ بے حد خوش تھا اس اچانک اور غیر متوقع طور پر مل جانے والی خوشی سے وہ جھوم رہا تھا اسے اپنے جنگجو باپ پر فخر ہو رہا تھا یہ شخص اس کا باپ تھا حقیقی باپ اس کے بچوں اکثر اسے اس بات پر چھیڑتے تھے کہ اس کا باپ نہیں ہے ۔انھیں اور چرواہوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا بھی ایک باپ ہے ۔چرواہے جو سال بھر پہاڑوں میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہیں وہ سب بچوں کو پچھاڑتے تو نہیں ہیں۔۔۔۔وہ جب بھیڑوں کی اون کتروانے کے لیے ہنکا کر انھیں باڑے میں لاتا تھا اور ان کے کتوں کو بھونکنے بھرنے سے روکتا تھا تو وہ اس کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ۔ریاستی فارم کے تمام چرواہوں میں ہر کوئی اس سے یہ ضرور پوچھتا۔

"ہاں تو لڑکے تمھارا نام کیا ہے؟"

"آول بیک ۔"

"اور تم کس کے بیٹے ہو؟"

"تو کتوسن کا ۔"

چرواہے بے فکری طور پر یاد نہ آتا کہ یہ تو کتوسن کون ہے ۔"

"تو کتوسن" گھوڑے کی زین سے نیچے جھکتے ہوئے وہ پوچھتا "کون تو کتوسن؟"

"میں تو کتوسن کا بیٹا ہوں ۔" وہ پھر دہراتا۔

اس کی ماں نے اسے ایسا ہی جواب دینے کی ہدایت کر رکھی تھی اس کی نانی دادی کی ہدایت بھی یہی تھی جب وہ اپنے باپ کا نام پوچھنے جاتا تو وہ اس کے کان کھینچا کرتی تھی وہ بہت غصیلی تھی

"اوہ اچھا ۔" چرواہا کہتا ۔"تو یوں کہو کہ تم پوسٹ آفس میں کام کرنے والی اس نیلی فون آپریٹر کے لڑکے ہو نا؟"

"نہیں میں تو کتوسن کا بیٹا ہوں ۔" آول بیک اصرار کرتا ۔

بالآخر چرواہا اس کی بات سمجھ ہی جاتا ۔

"ہاں بھئی واقعی تم تو کتوسن کے بیٹے ہو۔۔۔۔ شاباش۔۔۔۔ میں تو بس یوں ہی تمھارا امتحان لے رہا تھا۔ خفا نہ ہونا میرے بچے۔۔۔۔ دراصل ہم سارا سال وہاں پہاڑوں پر رہتے ہیں۔ اور تم بچے لوگ تو لکڑیوں کی طرح پھلتے پھولتے ہو۔۔۔۔ اب ہر بچے کو پہچاننا آسان تو نہیں ہوتا ناں۔"

اور پھر چرواہے آپس میں کھسر پھسر کرتے ہوئے تو کتوسن کا ذکر کرنے لگتے۔۔۔۔ وہ کہتے "وہ ابھی نوجوان ہی تھا کہ جنگ پر چلا گیا۔ اب بہت سے لوگوں کو تو وہ یاد بھی نہیں رہا۔ یہ اچھی بات ہے کہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ بہت سے نوجوان تو غیر شادی شدہ ہی چلے گئے تھے اور اب یہاں کوئی ان کا نام لینے والا نہیں رہ گیا۔"

اور اب جب کہ اس کی ماں نے اس سے کہا تھا "دیکھو بیٹے۔۔۔۔ یہ تمھارا باپ ہے" تو اسکرین پر موجود سپاہی اس کا باپ بن گیا اور لڑکا اسے اپنا باپ ہی سمجھنے لگا اور واقعی وہ جنگ کے زمانے کی تو کتوسن کی جنگی وردی والی اس تصویر سے بالکل مشابہ تھا جس کو اس کی ماں نے برآمدے کے شیشے کے فریم میں لگا رکھا تھا۔

اور اب آول بیک اس شخص کو ایک ایسے احساسات سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا سارا ایک اجنبی ہمت کی چھاؤں میں چلا گیا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اسکرین پر موجود شخص بھی محسوس کر رہا ہے کہ اس کا بیٹا اسے دیکھ رہا ہے اور اس لیے اب وہ فلم کی اس خیالی زندگی میں اپنے آپ کو یوں دکھانا چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اپنے سپاہی باپ کو ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رکھے۔ آول بیک کے لیے جنگ اب کوئی تفریح نہیں رہ گئی تھی۔ اب وہ کسی جنگ میں مرنے والے سپاہیوں کو دیکھ کر ہنس نہیں سکتا تھا۔ اب وہ جان گیا تھا کہ جنگ ایک سنگین، خطرناک اور خوفناک چیز ہوتی ہے اور زندگی میں پہلی بار اپنے کسی پیارے کے لیے، اپنے باپ کے لیے جس کی کمی اس نے ہمیشہ ہی محسوس کی تھی دکھ سا محسوس کیا۔ پردہ سمٹتا چلا گیا۔ جنگ جاری رہی۔ اب تو بہت خوف ناک سے ٹینک زمین کو روندتے ہوئے پیش قدمی کر رہے تھے۔ ان کے برج گھوم رہے تھے اور توپیں آگ اگل رہی تھیں اور توپچی اپنی قوت کے ساتھ اپنی توپ کو اوپر کی طرف دھکیل رہے تھے۔

"ہو۔۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔۔ ٹینک۔۔۔۔ ٹینک آ رہے ہیں" آول بیک نے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

آخر کار توپ پہاڑی کے اوپر پہنچ گئی۔ اس نے میوے کی جھاڑی کی آڑ میں ٹینکوں پر گولہ

[illegible] شروع [illegible] ٹینکوں نے جوابی حملہ کیا۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی [illegible] حالت اچھی نہیں تھی

جنگ کے شور اور شعلوں کے درمیان بچے نے اپنے آپ کو باپ کے قریب محسوس کیا۔ جب ایک ٹینک کو آگ لگ گئی اور وہ سیاہ آنکھیں میں چھپ گیا اور پھر ایک اور گولے نے ایک دوسرے ٹینک کے ٹکڑے اڑا دیے اور جب وہ غصے میں اندھوں کی طرح ایک ہی جگہ پر گھومنے لگ گیا تو اس کا خوشی سے اپنی ماں کی گود میں اچھلنے کا [illegible] جب اپنی فوج کے سپاہی توپ کے قریب گرنے لگے تو وہ خوش ہو کر بیٹھ گیا [illegible] بچے بہت کم ہی زندہ رہ گئے تھے۔ ماں رونے لگی [illegible] اس کے کان گرم اور تیکھے ہو رہے تھے [illegible] جنگ جاری رہی۔ لڑائی اب زوروں پر تھی۔ ٹینک اب [illegible] قریب آتے جا رہے تھے۔ توپ گاڑی کے قریب پہلو میں جھکتے ہوئے آوں بیک کے باپ نے فیلڈ فون میں چیخ کر کچھ کہا لیکن لڑائی کی گھن گرج میں اس کے الفاظ سنائی نہ دیے۔ توپ کے قریب ایک اور سپاہی گرا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ وہیں پر گر گیا اور زمین اس کے خون سے سیاہ ہو گئی۔ اب صرف دو شخص باقی رہ گئے تھے۔۔۔۔ آوں بیک کا باپ اور ایک دوسرا۔ انھوں نے ایک گولہ چلایا پھر کچھ بعد دیگرے انھوں نے دو گولے اور داغے۔ لیکن ٹینکوں کی پیش قدمی جاری رہی۔ توپ کے قریب ایک بار پھر گولا پھٹا۔ شعلوں اور شعلے نے اس جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جب شعلوں کا بادل چھٹا تو اس وقت ایک ہی آدمی اوپر اٹھ سکا اور وہ وہی تھا آوں بیک کا باپ۔۔۔۔ وہ توپ کی طرف جھپٹا۔۔۔۔ اس میں گولا بھرا۔۔۔۔ نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ یہ اس کا آخری گولہ تھا۔ جس کا ایک اور گولہ پھٹا جس نے ہر چیز کو شعلوں میں غرق کر دیا۔ اس نے توپ کو نقصان پہنچایا اور اسے الٹ دیا۔ لیکن توپچی ابھی زندہ تھا۔ وہ آہستہ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے اور جل رہے تھے اس کے ہاتھ میں گرنیڈ تھا اور وہ سیدھا اپنی طرف آتے ٹینکوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ یہ اس کی آخری کوشش تھی۔

"رکو۔۔۔۔ تم یہاں سے آگے نہیں جا سکتے" وہ چلایا اور اس نے گرنیڈ پھینکنے کے لیے اپنا ہاتھ لہرایا۔

وہ ایک لمحے کے لیے اسی طرح کھڑا رہا۔ درد اور نفرت سے اس کے چہرے کے خدوخال بگڑ گئے تھے۔

جین گل نے اپنے بیٹے کا ہاتھ زور سے کھینچ لیا۔ لڑکے نے اپنا ہاتھ چھڑا کر اپنے باپ کی مدد کو

اٹھنا چاہا۔ لیکن فیک کی مشین گن سے گولیوں کی ایک بوچھاڑ برآمد ہوئی اور وہ چیخ کر نیچے گر گیا۔ وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ دوبارہ پیٹھ کے بل زمین پر گر گیا۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے تھے۔ پروجیکٹر کی گھڑگھڑاہٹ بند ہو گئی۔ فلم اچانک رک گئی تھی۔ ایک ریل ختم ہو گئی تھی اور آپریٹر نے دوسری ریل لگانے کے لیے روشنی کر دی تھی۔

جب ہال میں روشنی پھیل گئی تو وہاں موجود سبھی لوگوں کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ وہ فلم میں پیش کی جانے والی جنگ کی فضا سے یک بارگی حقیقی دنیا میں لوٹ آئے تھے اور وہ ننھا آدمی ایک دم کرسی کے پیچھے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نہایت جوش انداز میں چلانے لگا۔

"یہ میرا باپ تھا۔۔۔۔ کیا تم نے اسے دیکھا۔۔۔۔ ہاں وہ میرا باپ تھا جو جنگ میں مارا گیا۔"

یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ پہلے پہل تو کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ بات کیا ہے۔ بدستور جو شیلے انداز میں چلاتے ہوئے وہ اپنے مجمعوں کی طرف اور پھر اجنبی کی رائے کی اس کے نزدیک بہت وقعت تھی۔ سارے ہال میں عجیب قسم کی خاموشی چھا گئی۔ وہ لوگ ابھی تک اس چھوٹے سے بچے کے اس طرح بے حواس ہونے کو محسوس نہیں کر سکے تھے جس نے اس سے پہلے اپنے باپ کو دیکھا تک نہیں تھا۔ اظہار کے لیے مناسب الفاظ نہ ملنے پر سب لوگ حیرانی اور پریشانی سے اپنے کندھے اچکا رہے تھے۔ آپریٹر نے ریل کا خالی ڈبہ نیچے پھینکا۔ ڈبہ کھل گیا اور وہ ایک ایک حصوں میں فرش پر لڑھک گیا۔ کسی نے اس بات کو محسوس نہ کیا۔ حتیٰ کہ آپریٹر بھی اسے اٹھانے کے لیے نہ جھکا اور وہ بچہ ابھی تک اپنے سپاہی باپ کے کارنامے فخریہ انداز میں پیش کیے جا رہا تھا۔

"کیا تم نے اسے نہیں دیکھا۔۔۔۔ وہ میرا باپ تھا۔۔۔ میرا باپ جسے انھوں نے مار دیا۔"

وہ بار بار یہی کہتا رہا۔ اپنے چاروں اور چھائی خاموشی کو محسوس کر کے وہ اور زیادہ جوش میں آتا جا رہا تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ سارے لوگ اس کے باپ کی بہادری پر اس کی خوشی میں شریک کیوں نہیں ہو رہے تھے؟

"خاموش" بالآخر ان میں سے ایک نے کہہ ہی دیا۔ "تمھیں ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالنی چاہئیں۔"

لیکن ایک دوسری آواز اسی لمحے ابھری۔

"وہ ایسا کیوں نہ کہے۔۔۔۔ جب کہ حقیقتاً اس کا باپ جنگ میں مارا گیا تھا۔

تب ایک بڑی عمر کے لڑکے نے آدل بیک سے حقیقت بیان کرنے کی ٹھان ہی لی۔

"یہ اصل میں تمھارا باپ نہیں تھا۔" اس نے کہا، "اور اسی لیے تمھیں اتنے جوش میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔ یہ تمھارا باپ تھا ہی نہیں۔ یہ تو بس ایک اداکار تھا۔ اگر تمھیں میری بات پر یقین نہیں آتا تو بے شک آپریٹر سے پوچھ لو۔"

دوسرے لوگوں میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ بچے کو یہ بات بتاتا۔ وہ اسے اس حاتی خوشی سے محروم کر دیتے۔ آپریٹر بچوں کو یہاں لاتا نہیں تھا اس لیے ان کے خیال میں اسے اظہار کا موقع دینا بہتر تھا۔ لوگوں نے امید بھری نظروں سے آپریٹر کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی پردے ہی پر جما رہا جیسے کہ وہ بہت مصروف ہو۔

"وہ میرا باپ تھا۔" آدل بیک بولا "وہ وہی تھا۔"

"بھلا وہ ان میں سے کون تھا؟" بڑی عمر کے لڑکے نے استفسار کیا۔

"کیا تم دیکھ نہیں رہے تھے؟" وہی جو ریڈ ماتھو میں سے ٹینک کے قریب کھڑا تھا اور مجھ پر تھا۔۔۔۔ بالکل ویسے۔"

آدل بیک نے زمین پر گر کر اسی طرح لڑھک کر دکھایا جیسے کہ اس کا باپ گرا تھا۔ اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی اور پھر گر پڑا اور پھر اپنے بازو پھیلائے ہوئے وہ پردے کے عین سامنے چت لیٹ گیا۔

لوگ اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکے لیکن اس کا اس طرح بے حس و حرکت وہاں پڑا رہنا جیسے کہ وہ مر چکا ہو۔۔۔۔ وہ لوگوں کی ہنسی میں شریک نہ ہوا۔

ایک بار پھر ایک تکلیف دہ خاموشی نے لوگوں کو گھیر لیا۔

"جین گل یہ کیا قصہ ہے؟" ایک بوڑھی عورت نے جھنجھلا کر پوچھا۔ "تم نے اس بچے کے ذہن میں یہ کیسے خیالات سمو دیے ہیں۔" غم زدہ جین گل اپنی آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے اٹھی اور اپنے بچے کی طرف بڑھ گئی اور پھر اس نے اسے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "آؤ بیٹا گھر چلیں۔" اس نے کہا "وہی تیرا باپ تھا۔"

اس نے لڑکے کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر وہاں سے چل گئی۔

چاند طلوع ہو چکا تھا۔ رات کے گہرے نیلے آسمان کے پس منظر میں پہاڑی کی سفید چوٹیاں چمک رہی تھیں اور نیچے خاموشی کا بے انت اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

اب اس وقت زندگی میں پہلی بار لڑکے کو اپنے شدید نقصان کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ جنگ میں اس طرح اپنے باپ کے مر جانے اور پھر مر جانے پر بہت زیادہ دکھی ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی وہ اپنی ماں سے پہلے مر جانا چاہتا تھا لیکن اس کی ماں رو رہی تھی جس نے کبھی رو رو کر اپنی منتیں بھیجی تھیں اور خاموشی سے اپنے آنسوؤں کو پی لیا

حالاں کہ اس کا باپ بہت عرصہ پہلے جنگ میں مارا جا چکا تھا مگر اس لمحے وہ پھر سے اس کے اندر آ موجود ہوا تھا۔۔۔۔ زندہ!

☆☆☆☆

گیبریل گارشیا مارکیز

پنجرہ اور آدمی

پنجرہ مکمل ہو گیا تھا۔ بالتھازار نے اسے اپنی عادت کے مطابق چھت کے نیچے اگلے حصے کے پیچھے رکھ دیا اور جب اس نے پنجرہ ختم کیا تو اس سے پہلے ہی سورج کو یہ بتا رہا تھا کہ یہ دنیا کا سب سے زیادہ خوب صورت پنجرہ ہے۔ اتنے لوگ اسے دیکھنے کے لیے آئے کہ ان کا ایک ہجوم گھر کے سامنے جمع ہو گیا اور بالتھازار کو اسے پیچھے ہٹا کر دکان بند کرنی پڑی۔

اس کی بیوی ارسلا نے کہا "تمھیں شیو کرنی ہے۔ یہ تمھیں پتہ ہے کہ تم اس وقت ایک خاص مسلک کے پادری کی طرح لگ رہے ہو۔"

"لنچ کے بعد شیو کرنا اچھی بات نہیں۔" بالتھازار نے کہا۔

اس کے دونوں ہاتھوں سے بڑھے ہوئے کھڑے کھڑے سخت اور چھوٹے بال، کسی خچر کی ایال کی طرح لگتے تھے اور اس کا سراپا، ایک ڈرے ہوئے لڑکے کا عمومی تاثر پیش کرتا تھا۔ لیکن یہ ایک غلط تاثر تھا۔ اس فروری میں وہ تیس سال کا ہو چکا تھا اور وہ پچھلے چار سال سے ارسلا سے شادی کیے بغیر اس کے ساتھ رہ رہا تھا اور اس کے ہاں کوئی بچہ بھی نہیں ہوا تھا اور ایسی کئی وجوہات تھیں کہ زندگی نے اسے محتاط ضرور بنا دیا تھا لیکن اس میں ڈرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ جو پنجرہ اس نے ابھی بنایا تھا وہ کچھوؤں کے لیے ایک دنیا کا خوب صورت ترین پنجرہ ہے۔ چوں کہ وہ بچپن ہی سے ایسے پنجرے بناتا چلا آ رہا تھا، اس لیے اس کو بنانے میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

عورت بولی "تو پھر بہتر ہے کہ تم تھوڑا سا ستا لو، کیوں کہ اس بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ تم کہیں باہر تو نہیں جا سکتے۔"

آرام کرنے کے دوران میں بھی اسے اس پنجرے کو اپنے پڑوسیوں کو دکھانے کے لیے کئی بار اپنے جھولتے کھٹولے سے باہر آنا پڑا تھا۔ اس وقت تک ارسلا نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اپنے خاوند سے اس بات پر ناراض تھی کہ وہ اپنی دکان کے نقصان کو نظر انداز کر کے صرف

اس پنجرے کو بنانے میں لگا رہا تھا۔ اس دوران میں اس نے پوری نیند بھی نہیں لی تھی اور کام کرتے ہوئے وہ بکھرے بکھرے خیالات میں بڑبڑاتا بھی رہا تھا۔ لیکن اس کا عمدہ تکمیل شدہ پنجرے کے سامنے ہوا ہوتا۔ جب بالتھازار نے اپنی دوپہری نیند سے بیدار ہوا، اس وقت تک ارسلا نے اس کی پتلون اور قمیص استری کر کے جھولنے کے قریب پرانی کرسی پر رکھ دی تھی اور پنجرہ واپس کر وہ کھانے کی میز پر لے آئی تھی۔

"تم اس کے کتنے دام لو گے۔۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔

بالتھازار نے جواب دیا "مجھے کچھ پتا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ان سے تیس پیسوز مانگوں گا شاید اس طرح وہ مجھے بیس دے دیں۔"

ارسلا نے کہا "تم ان سے پچاس کا مطالبہ کرو۔ تم نے ان پچھلے دو ہفتوں میں اپنی خاصی نیند قربان کی ہے اور وہ پیسے بھی پہنچ رہا ہے۔ میرا خیال ہے، میں نے اپنی زندگی میں جتنے بھی پنجرے دیکھے ہیں، یہ ان سب سے بڑا ہے۔"

"کیا تمھارے خیال میں وہ مجھے پچاس پیسوز دے دیں گے؟"

"یہ جناب موئیل کے لیے کچھ بھی نہیں، اور پنجرہ اتنی قدر تو رکھتا ہے۔ تمھیں ساٹھ مانگنے چاہئیں۔" ارسلا نے کہا۔

گھر دم گھوٹ دینے والے سائے میں پڑا ہوا تھا۔ یہ اپریل کا پہلا ہفتہ تھا اور جھینگروں کے بول بدرے کے بیچ میں گہری خاموشی برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ جب بالتھازار نے کپڑے پہن لیے تو گھر میں ٹھنڈک کے واسطے کے لیے اس نے آنگن کی طرف کھلنے والے دروازے کھول دیے اور تبھی بچوں کا ایک جھنڈ کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔

خبر پھیل چکی تھی۔ بوڑھا ڈاکٹر اکتاویو جیرالڈو جو اپنے پیشے سے ناخوش اور اپنی زندگی سے خوش تھا، اس نے اپنی معذور بیوی کے ساتھ چائے پیتے ہوئے بالتھازار کے پنجرے کے بارے میں سوچا تھا۔ گرم دنوں میں اندر کے کمرے میں، جہاں انھوں نے ایک میز ڈال رکھی تھی، وہاں بہت سے پھولوں کے گملے رکھے تھے اور ساتھ ہی وہاں زرد بلبلوں کے پنجرے بھی پڑے تھے۔ اس کی بیوی کو پرندے اتنے زیادہ پسند تھے کہ وہ بلبلوں سے صرف اس لیے نفرت کرتی تھی کہ وہ ان پرندوں کو کھا جاتی تھی۔ اس کے متعلق سوچتے ہوئے ڈاکٹر جیرالڈو نے اس سہ پہر کو ایک مریض دیکھنے کے لیے تو وہاں پر وہ پنجرہ دیکھنے کے

لیے بالتھازار کے گھر آ گیا۔

کھانے والے کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ تاروں سے بنی، خاصی بڑی گنبد نما کوالی کے ساتھ پنجرہ نمائش کے لیے میز پر رکھا گیا تھا۔ اس کی تین منزلیں تھیں۔ اس میں آنے جانے کے راستے بھی بنے ہوئے تھے اور خاص طور پر سونے اور کھانے کے لیے کمرے بھی بنائے گئے تھے۔ پرندوں کی تفریح کے لیے اس میں چھوٹے چھوٹے حصے بھی بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک بہت بڑے برف کے کارخانے کا چھوٹے پیمانے پر بنا ہوا نمونہ لگتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے چھوئے بغیر اس کا جائزہ لیا۔ اس نے سوچا کہ اصل میں یہ تو اپنی شکل سے بھی اتنا زیادہ خوب صورت ہے کہ اس نے تو کبھی اپنی بیوی کے لیے ایسی کسی چیز کے متعلق خواب بھی نہیں سوچا تھا۔

اس نے کہا "یہ تصور کی پرواز ہے۔"

وہ لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا بالتھازار تک پہنچا اور اس نے اپنی شفیق نظریں، اس پر ڈالتے ہوئے مزید کہا "تم تو بہت غیر معمولی ہنر مند ہو۔"

بالتھازار شرما گیا "آپ کا شکریہ۔" اس نے کہا۔

ڈاکٹر نے خیال کیا "یہ سچ ہے کہ وہ ایک ایسی عورت کی طرح، جو اپنی جوانی میں خوب صورت رہی ہو، ایک شائستہ مدد والے شوہر سے ہونا چاہیے، شکار ہے اور اس کے ہاتھ بہت نرم ہیں۔ اس کی آواز ریلیں بوسے والے ایک پادری جیسی لگتی ہے۔" اس نے کہا "حتیٰ کہ اس میں پرندے رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" اس نے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے پنجرے کو یوں تھما دیا جیسے کہ وہ خود اس پنجرے کو پیدا کر رہا ہو "اسے تو درختوں کے درمیان یوں رکھا ہونا چاہیے کہ یہ خود بخود چہکنا شروع کر دے۔" اس نے پنجرے کو میز پر رکھا، ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پنجرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تو ٹھیک ہے، میں اسے لے جاؤں گا۔"

رسلا نے کہا "یہ بک چکا ہے۔"

بالتھازار نے کہا "یہ جناب موئیل کے صاحب زادے کی ملکیت ہے۔ اس نے اسے خاص اپنے لیے بنایا ہے۔"

ڈاکٹر نے احمقانہ کہا "کیا اس نے تمہیں اس کا ڈیزائن بھی مہیا کیا تھا۔"

"نہیں۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اسی طرح کا ایک بڑا سا پنجرہ ہو، جس میں کہ وہ ڈیل کا ایک

جوڑا رکھ سکے۔"

ڈاکٹر نے پنجرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن یہ زوشیل کے لیے موزوں نہیں ہے۔"

بالتھازار نے میز کے قریب پہنچتے ہوئے کہا "یقیناً یہ زوشیل کے لیے مناسب ہے۔"

بچوں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے مختلف حصوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بہت احتیاط سے پیمائش کی جانچ کی گئی ہے۔" پھر اس نے انگلیوں کے جوڑے پنجرے کے مضبوط کاٹھ پنجرہ ایک سریلی گونج سے بھر گیا "یہ ایک مضبوط ترین تار ہے۔ ایسی تار آپ کو بمشکل ہی ملے گی اور اسے اندر اور باہر سے مضبوطی سے تانکے لگائے گئے ہیں۔"

"یہ تو ایک طوطے کے لیے بھی خاصا بڑا ہے۔" ایک شخص نے اصل درمقام بات کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ہے۔" بالتھازار نے کہا۔

ڈاکٹر نے اپنا سر گھمایا "یہ سب ٹھیک ہے لیکن اس نے اس کا خاکہ تو تمہیں نہیں دیا تھا۔" زوشیل کے لیے ایک مناسب طور پر بڑا پنجرہ بنانے کے علاوہ اس نے تمہیں بالکل صحیح پیمائش نہیں دی۔ کیا یہی بات نہیں ہے؟"

"یہ بالکل صحیح ہے۔" بالتھازار نے کہا۔

"تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایک ایسا پنجرہ بنانا چاہیے جو کہ زوشیل کے لیے کافی بڑا ہو جب کہ یہ ایک ورنی طرح کا پنجرہ ہے۔ اور اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ جو پنجرہ تمہیں بنانے کے لیے کہا گیا تھا، وہ پنجرہ یہی ہے۔"

ذہنی طور پر الجھے ہوئے بالتھازار نے کہا "یہ بالکل وہی ہے، اسی لیے میں نے اسے بنایا ہے۔"

ڈاکٹر نے بے صبری کا مظاہرہ کیا تو ارسلا نے کہا "تم ایک دوسرا بھی تو بنا سکتے ہو۔" پھر اپنے شوہر کی جانب سے وہ اس کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے کہا "آپ کو جلدی تو نہیں۔"

"میں نے آج سہ پہر کو اسے اپنی بیوی کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا

"مجھے افسوس ہے ڈاکٹر۔ میں آپ کو وہ چیز نہیں بیچ سکتا جو کہ پہلے سے ہی بکی ہوئی ہے۔" بالتھازار بولا۔

ڈاکٹر نے اپنے کندھے اچکائے۔ اپنی گردن پر آئے پسینے کو رومال کے ساتھ خشک کرتے ہوئے، اس نے متفکر انداز میں خاموش رہتے ہوئے، بظاہر بے پروائی سے پنجرے کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اس جہاز کی طرف دیکھتا ہے جو کہ بس روانہ ہونے ہی والا ہو۔ "انھوں نے تمھیں اس کے لیے کیا ادائی کی ہے۔"

بالتھازار نے بغیر کوئی جواب دیے ارسلا کی آنکھوں میں جھانکا۔

"سانتا چیوز۔" وہ بولی۔

ڈاکٹر نے پنجرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ بہت خوب صورت ہے۔" اس نے آہ بھری "بہت زیادہ خوب صورت" دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ مسکرایا اور اس نے تیزی سے خود کو پنکھا کیا اور تب اس واقعے کا نشان تک ہمیشہ کے لیے اس کی یادداشت سے محو ہو گیا۔

اس نے کہا: "موئیل بہت امیر ہے۔"

سچ یہ تھا کہ موئیل حقیقت میں اتنا امیر نہیں تھا لیکن وہ اس کا اہل تھا کہ امیر بننے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ یہاں سے کچھ ہی بلاک دور، سارہ وسامان سے لدے ایک ایسے گھر میں، جہاں کسی نے ایسی کسی بھی چیز کے بارے میں نہیں سوچا تھا، جسے کہ بیچا جا سکتا ہو۔ وہ پنجرے کے بارے میں پہلے والی خبروں سے لاتعلق تھا۔ موت کے خوف میں مبتلا، اس کی بیوی نے چیخ کے بعد دروازے کھڑکیاں بند کیں اور کمرے کے سارے کونے کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی دو گھنٹے تک لیٹی رہی جب کہ موئیل نے قیلولہ کیا۔ تبھی بہت سی آوازوں کے شور نے اسے پریشان کر دیا۔ اس نے نصف دروازہ کھولا تو لوگوں کے ایک ہجوم کو اپنے گھر کے سامنے پایا۔ ہجوم کے درمیان، اس نے بالتھازار کو پنجرے کے ساتھ موجود پایا۔ اس نے تازہ شیو کی ہوئی تھی اور ایک ایسا صاف ستھرا اور مہذب قسم کا سفید لباس پہن رکھا تھا، جیسا کہ غریب لوگ امرا کے گھر آتے وقت پہنتے ہیں۔

"کیا شان دار چیز ہے" موئیل کی بیوی نے پرجوش انداز میں بالتھازار کو اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔

دروازے پر جمع ہونے والے لوگوں کے لیے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے، اس نے مزید کہا "میں نے اپنی زندگی میں ایسی چیز نہیں دیکھی لیکن اس سے پہلے کہ لوگ نشست گاہ کو ریس کورس میں بدل دیں تم اسے اندر لے آؤ۔"

بالتھازار موٹیل گھرانے کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں تھا۔ وہ دست موقعوں پر اپنی مہارت اور صحیح تین دین کی بدولت چھوٹے موٹے جرائم کے لیے یہاں بلایا جا چکا تھا۔ لیکن اس نے امیروں کے درمیان خود کو کبھی آسودہ نہیں پایا۔ عموماً وہ ان کی بیویوں کے بارے میں سوچتا جو بھی زخمی رویے والے رویوں کا شکار تھیں اور اسے ایسے لوگوں کے بارے میں سوچ کر افسوس ہی ہوتا تھا۔ وہ جب ان لوگوں کے گھروں میں داخل ہوتا تھا تو اسے اپنے پاؤں گھسیٹنے پڑتے تھے۔

"کیا پیپ گھر پر ہے۔" اس نے پوچھا۔

اس نے خنجر کھانے کی میز پر رکھ دیا۔ "وہ سکول گیا ہوا ہے لیکن وہ آتا ہی ہوگا۔" اس نے کہا "موٹیل تباہ ہو رہا ہے۔" اس نے مزید کہا۔

"حقیقت میں موٹیل کے پاس تباہ ہونے کا وقت ہی نہیں تھا۔ وہ تو آ کر یہ دیکھنے کے لیے کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔ موٹیل بڑی شرابی والے شراب کے شغل میں مصروف تھا۔ وہ ایسا چوکنا شخص تھا کہ سوتے ہوئے پنکھا بھی نہیں چلاتا تھا تاکہ سوتے ہوئے بھی اسے گھر میں پیدا ہونے والا شور سنائی دے سکے۔

"یہ ڈیڈ۔" وہ چلایا "یہ ہو رہا ہے؟"

"یہاں آؤ اور دیکھو یہ کیسی شان دار چیز ہے۔" اس کی بیوی نے اونچی آواز میں کہا۔

بالوں بھرے جسم والا تو نڈیل موٹیل، جس کی ٹانگوں کے گرد تولیہ لپٹا ہوا تھا، بیڈروم کی کھڑکی پر آیا "یہ کیا ہے؟"

بالتھازار نے کہا "یہ پیپ کا خنجر ہے۔"

اس کی بیوی نے متحیر ہو کر پوچھا "کس کا؟"

بالتھازار نے جواب دیا "پیپ کا۔" پھر اس نے موٹیل کی طرف مڑ کر کہا "پیپ نے اس کا آرڈر دیا تھا۔"

ایک لمحے کے لیے تو کچھ نہ ہوا لیکن بالتھازار نے محسوس کیا، جیسے اس کے سامنے کسی نے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا ہو۔ موٹیل نظر آیا۔ پہنے ہوئے بیڈروم سے برآمد ہوا "یہ کیا ہے پیپ نے" وہ چیخا

اس کی بیوی نے بے حرکت رہتے ہوئے سرگوشی کی "وہ ابھی واپس نہیں آیا ہے۔"

پیپ دروازے کے پاس نظر آیا۔ پیپ کی شکل روسی تھی اور اس کی آنکھوں کی پلکیں سرخ ہوئی تھیں اور وہ اپنی ماں کی طرح رنجیدہ خاطر نظر آتا تھا۔

موئیل نے اس سے کہا "یہاں آؤ۔ کیا تم نے اس کا آرڈر دیا تھا؟"

بچے نے اپنا سر جھکا لیا۔

موئیل نے اسے، جس نے بچہ اپنی آنکھوں میں دیکھنے پر مجبور کیا "مجھے جواب دو" بچے نے جواب دیے بغیر اپنے ہونٹوں کو کاٹا۔ اس کی بیوی نے آہستہ سے کہا "موئیل"

موئیل نے بچے کو چھوڑ دیا اور غصے میں بالتھازار کی طرف گھوما۔ اس نے کہا "بالتھازار مجھے افسوس ہے لیکن تمھیں ایسا کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔ اگر تم کسی نائی سے کوئی معاملہ کرتے ہو تو اس کی ذمہ داری تم پر ہوتی۔" جب اس نے یہ کہا تو اس کے چہرے کی تمازت واپس آ چکی تھی۔ اس نے خنجر کی طرف دیکھے بغیر اسے اٹھایا اور بالتھازار کو پکڑا دیا "اسے فوراً یہاں سے لے جاؤ اور جس کسی کو بھی بیچ سکتے ہو اسے بیچ دو۔ اور سب سے مقدم بات یہ ہے کہ تم مجھ سے کسی قسم کی کوئی بحث نہ کرنا۔ یہ میری تم سے درخواست ہے۔" اس نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے وضاحت کی۔ "ڈاکٹر نے مجھے غصے میں آنے سے منع کیا ہے۔"

جب تک بالتھازار بے تحاشا خنجر اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا، بچہ اپنی آنکھیں جھپکائے بغیر ساکت رہا تھا۔ جب اس نے کتے کی غراہٹ جیسی آواز اپنے حلق سے نکالی اور چیختے ہوئے اس نے اپنے آپ کو فرش پر گرا دیا۔ موئیل کوئی حرکت کیے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا جب کہ اس کی ماں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی "اسے دیکھو مت اٹھاؤ موئیل جو، اسے اپنا سر فرش پر ٹکرا کر توڑنے دو" اور پھر اس پر بیموں اور نمک بھی چھڑک دو تاکہ یہ اپنے دل کی گہرائی تک حصہ محسوس کر سکے۔" بچہ اپنی خشک آنکھوں کے ساتھ چلائے جا رہا تھا اور اس کی ماں نے اسے کلائیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ "اسے تنہا چھوڑ دو۔" موئیل نے اصرار کیا۔

بالتھازار نے بچے کا یوں جائزہ لیا، جیسے وہ کسی جال کی میں جلا کسی جانور کو دیکھ رہا ہو۔ یہ تقریباً سہ پہر چار بجے کا وقت تھا۔ عین اسی لمحے گھر پر اس کی بیوی ارسلا، پیاز کے باریک ٹکڑے کرتے ہوئے ایک بہت پرانا گیت گا رہی تھی۔

"پیپ" بالتھازار نے کہا

وہ بچے کی طرف بڑھا اور اس نے مسکراتے ہوئے بچے کو وہ پنجرہ پکڑا دیا۔ بچہ اچھل پڑا۔ اس نے اپنے جتنے بڑے سائز کے پنجرے کو سینے سے لگا لیا۔ اس نے تاروں کی اس کاری گری کے اندر بالتھازار کو جھانکا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس سے کیا کہے۔ اس نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا تھا۔

موئیل نے نرمی سے کہا "بالتھازار میں نے تمھیں پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اسے لے جاؤ۔"

"اسے واپس کرو۔" عورت نے بچے کو حکم دیا۔

بالتھازار نے کہا "تم اسے رکھو۔" اور تب اس نے موئیل سے کہا "بہر حال یہ وہ چیز ہے جو میں نے اسی کے لیے بنائی ہے۔"

موئیل اس کے پیچھے نشست گاہ تک آیا "احمق مت بنو۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس کا راستہ روک رہا تھا "بے قوفی نہ کرو اور اپنی یہ بنائی ہوئی چیز گھر لے جاؤ۔ میں تمھیں ایک بینٹ کی ادائی کے لیے بھی تیار نہیں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں" بالتھازار نے کہا "میں نے اسے ایک تحفے کے طور پر پاپ کے لیے بنایا ہے۔ میں اس کے عوض کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتا۔"

جب بالتھازار تماشائیوں کے درمیان میں سے، جنھوں نے اپنے وجود سے دروازے پر رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی گزرا تو موئیل ویٹنگ روم کے درمیان کھڑا چیخ رہا تھا۔ وہ زرد ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہونا شروع ہو گئی تھیں "احمق" وہ چلا رہا تھا "اپنی فضولیات کو اٹھا دیہاں سے۔ آخری اور حتمی بات یہ ہے کہ اس گھر کے لیے کسی بھی کسی چیز کا آرڈر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتیا کا بچہ۔"

چوپال ہال میں بالتھازار کا رنجوشی سے استقبال کیا گیا۔ اس لمحے تک وہ سوچ چکا تھا کہ اس نے جو پنجرہ موئیل کے لیے بنا کر دیا تھا، وہ اس کے اب تک بنائے گئے تمام پنجروں سے بہتر پنجرہ تھا۔ وہ رو دھو نہیں رہا تھا کہ کوئی بھی چیز خصوصی طور پر اہم نہیں تھی لیکن پھر اس نے سوچا کہ زیادہ لوگوں کے نزدیک ایسی چیزوں کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے۔ وہ تھوڑا سا جوش میں آ گیا

"انھوں نے تمھیں پنجرے کے عوض پیسے نہیں دیے"

"ساٹھ۔" بالتھازار نے کہا۔

"تمھارے لیے ایک تحفہ" کسی نے کہا "تم وہ واحد شخص ہو جو مسٹر موئیل سے اتنی خطیر رقم حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔"

انھوں نے اس کے لیے ایک بیئر خریدی اور بالتھازار نے جواباً ہر ایک کے ساتھ راؤنڈ لیا چوں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ شراب نوشی کر رہا تھا، اس لیے وہ شام تک مکمل طور پر نشے میں ہو گیا۔ وہ ساٹھ پیسوز قیمت والے ایک سرخ رنگ کے شان دار پراجیکٹ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ پھر اس کی تعداد ایک ملین ہو گئی اور پھر یہ بڑھ کر ساٹھ ملین تک جا پہنچی۔ نشے میں دھت وہ کہہ رہا تھا "ہمیں میووں کے مرنے سے پہلے ان کو بیچنے کے لیے ہزاروں چیزیں تیار کرنا ہوں گی۔ یہ سارے کے سارے بیمار ہیں اور یہ سارے مرنے والے ہیں۔ یہ اتنا پیچھے رہ چکے ہیں کہ وہ اب کسی بات پر غصہ نہیں کرتے۔"

دو گھنٹوں سے وہ ٹیوک باس کے لیے دعا کر رہا تھا جو کہ بھیڑ کے پیچھے گیا ہوا تھا۔ ہر ایک نے بالتھازار کے لیے اچھی قسمت، اچھی صحت اور میووں کے لیے ان کی موت کا جام تجویز کیا۔ عین اسی دوران میں انھوں نے بالتھازار کو پول ہال میں اکیلا چھوڑ دیا۔

ارسلا نے پیاز کے قتلوں سے تلی بھنے ہوئے گوشت کی پلیٹ کے ساتھ آٹھ بجے تک انتظار کیا۔ کسی نے اسے بتایا تھا کہ اس کا شوہر خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے ہر ایک کے لیے بیئر خرید رہا تھا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کیوں کہ بالتھازار نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ جب وہ آدھی رات کے قریب سونے کے لیے بیڈ پر لیٹی تو اس وقت بالتھازار ایک روشن کمرے میں تھا، جہاں چار کرسیوں والی چھوٹی میزیں تھیں اور وہاں ایک بیلے والی ڈانس فلور تھا، جہاں ارثر ہمرٹ باراں چل پھر رہے تھے۔ اس کا چہرہ مرغی کی مانند تھا اور جب وہ ہلتا یا ایک بھی قدم اٹھانے کے قابل نہ رہا تو اس نے سوچا کہ وہ ایک ہی رات میں دو عورتوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ اس نے اتنا خرچ کر دیا تھا کہ اسے اپنی گھڑی گروی رکھنی پڑی، اس وعدے کے ساتھ کہ وہ ساری ادائی اگلے دن کر دے گا۔

صرف ایک لمحے بعد گلی میں کسی پر پھیلائے ہوئے عقاب کی طرح پڑے ہوئے، اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے جوتے اتار کر لے جا رہا تھا تاکہ وہ اپنی زندگی کے ان خوش کن خوابوں سے بھی دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ عورتیں جو پانچ بجے کے قریب گرجے کی عبادت کے لیے وہاں سے گزر رہی تھیں، انھوں نے اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کی کیوں کہ ان کے خیال میں وہ مر چکا تھا

☆☆☆☆

گیبریل گارشیا مارکیز

خواب بھولنے والا

جب اس نے میری طرف دیکھا میرا خیال تھا کہ وہ پہلی بار میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن جب وہ لیمپ کے پیچھے سے اٹھ کر آئی اور میں نے کندھوں کے اوپر سے اپنی پشت پر اس کی پھسلوں چکنی نگاہ کو محسوس کیا تو میں سمجھا کہ یہ تو میں تھا، جو پہلی بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کرسی کی پچھلی ٹانگوں پر خود کو متوازن کرتے ہوئے، سونے سے پہلے ایک زبردست قسم کا تیز کش لیا۔ اس کے بعد میں نے اسے وہاں دیکھا، جہاں وہ رات کو میری طرف دیکھتے ہوئے، لیمپ کے قریب کھڑی رہی تھی۔ چند لمحے سے خاموشی میں ہم نے صرف یہ کیا کہ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کرسی کی پچھلی ٹانگوں میں سے ایک پر توازن برقرار رکھتے ہوئے، میں نے دیکھا۔ وہ اپنے لمبے اور خاموش ہاتھ کو لیمپ پر رکھے ہوئے، کھڑکی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے پپوٹوں کو ہر رات کی طرح روشن ہوتے دیکھا۔ تب ہی میں نے اس مفہوم کی چیز کو پا لیا۔ میں نے اس سے کہا "نیلے کتے کی آنکھیں" اس نے لیمپ سے اپنا ہاتھ پرے ہٹائے بغیر مجھ سے کہا "لیکن ہم اس بات کو بالکل نہیں بھولیں گے۔" اس نے منظر سے پرے ہوتے ہوئے لمبی سانس لی۔ "نیلے کتے کی آنکھیں" میں نے اس کو ہر جگہ پر تحریر کیا ہے۔"

میں نے اسے ڈریسنگ ٹیبل کی جانب حرکت کرتے ہوئے پایا۔ میں نے ریاضی جیسی اشکال کے اندر کی روشنی کے، آخر میں آگے پیچھے ہوتے ہوئے، اس وقت اسے آئینے کے گول شیشے میں نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اسے، اس کی دہکتے کوئلے جیسی آنکھوں کے ساتھ، مسلسل اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اس وقت وہ موتیوں والی کلائی پکڑ کے ہلکی سے چھوتے ہوئے ڈبے کو کھول رہی تھی۔ میں نے اسے اپنی ناک پر پاؤڈر لگاتے ہوئے دیکھا۔ یہ کام ختم کر کے اس نے ڈبے کو بند کیا اور دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتے ہوئے، ایک بار پھر لیمپ کی جانب آئی کہ "مجھے خدشہ ہے کہ کوئی اس کمرے کے خواب دیکھ رہا ہے اور میرے رازوں کو افشا کر رہا ہے" اور آئینے کے سامنے بیٹھنے سے پہلے

اپنے لرزاں لمبے ہاتھ کو گرم روشنی پر تاپتے ہوئے، اس نے کہا "تم سردی محسوس نہیں کر رہے" میں نے اس سے کہا "ہاں کچھ کچھ" اس نے مجھ سے کہا "تمہیں اس وقت اسے محسوس کرنا چاہیے" اور تب میں نے جانا کہ میں کیوں اپنی نشست پر اکیلا میں رو رہا تھا۔ یہ ٹھنڈک تھی جو مجھے تنہائی کا یقین دلا رہی تھی۔ اب میں اسے محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا "اور یہ عجیب بات ہے کیوں کہ رات خاموش ہے۔ ہو سکتا ہے پرانا گر گیا ہو" اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دوبارہ آگ کی طرف آئی اور اپنا منہ دوسری طرف کیے ہوئے، میں نے کرسی میں پہلو بدلا۔ اسے دیکھے بغیر مجھے پتہ تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری پشت کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ آگ کے سامنے بیٹھ چکی ہے اور اس طرح اس کے پاس اتنا وقت تو تھا کہ وہ اپنی نگاہوں کے توسط سے آگ کی گہرائیوں میں اتر سکے اور اتنا وافر وقت بھی اس کے پاس تھا کہ وہ ان گہرائیوں سے واپس آ سکے اور اس کے ہاتھ کی پہلی جنبش سے پہلے حتیٰ کہ اس کے ہونٹ پیازی اور رخوانی ہو جائیں اس کے ہاتھ کے پاس اتنا وقت موجود تھا کہ وہ پھر سے پلٹا کھا سکے۔ میں نے اپنی مخالف سمت میں دیکھا۔ یہ ایک ہموار دیوار تھی جو ایک اور راہداری جیسی تھی جس میں سے میں اسے اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں یہ تصور کر سکتا تھا کہ وہ مکمل طور پر کہاں ہو سکتی ہے جیسے دیوار کی جگہ ایک آئینہ لگا دیا گیا ہو۔ "میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے اسے بتایا۔ اور دیوار پر جو میں نے دیکھا، وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی نگاہیں اٹھائی تھیں اور اس نے مجھے کرسی میں پہلو بدل کر آگ کی گہرائیوں میں اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ میرا چہرہ دیوار کی طرف ہو گیا تھا۔ تب میں نے اسے دوبارہ اپنی نگاہیں جھکاتے ہوئے دیکھا اور کچھ نہ کہتے ہوئے، اس سارے وقت میں اس کی آنکھیں اپنی بریزے پر رہی تھیں۔ میں نے اسے دوبارہ کہا "میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔" اور اس نے دوبارہ اپنی نگاہیں بریزے سے اٹھائیں "یہ ناممکن ہے" اس نے کہا۔ میں نے پوچھا "کیوں" اور اس نے خاموش نگاہوں کے ساتھ دوبارہ دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیوں کہ تمہارا چہرہ دیوار کی طرف ہے" تب میں نے کرسی گھمایا۔ میرے منہ میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ جب میرا رخ آگ کی طرف ہوا تو اس کا رخ دوبارہ دیپ کی طرف مڑ گیا۔ اب اس کے ہاتھ مرغی کے دو بازوؤں کی طرح گرم کرنے کی غرض سے شعلے کے بالکل اوپر پھیلے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ اپنی انگلیوں کے سامنے تلے ہوا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے ٹھنڈ لگ گئی ہے" اس نے کہا۔ "اسے برف کا شربت پینا چاہیے" اس نے پتا چلا۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا اور اس کی جلد تانبے جیسی رنگت سے سرخ ہوتی ہوئی، ایک دم

اداس ہو گئی۔ "اس کے متعلق کچھ کرو۔" اس نے کہا اور تب اس نے اپنی بریزیر سے آغاز کرتے ہوئے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتارنا شروع کر دیے۔ میں نے کہا "میں دیوار کی طرف اپنا چہرہ کر لیتا ہوں"۔ نہیں تم مجھے اس حالت میں دیکھ سکتے ہو، بالکل ویسے ہی جیسے تم دیوار کی طرف منہ موڑ کر بھی مجھے دیکھتے رہے تھے۔ اور جوں ہی اس نے یہ جملہ ادا کیا وہ تقریباً مکمل طور پر برہنہ ہو چکی تھی اور شعلہ اس کی ہی ناپنے کے مانند جلد کو چوم رہا تھا "تمھارے پیٹ کی تمام تر گہرائیوں سمیت میں نے تمھاری جلد کو ہمیشہ اس حد تک دیکھنے کی خواہش رکھی تھی جیسے کہ دکھائی دی گئی ہو" اور اس سے پہلے کہ اس کے ننگے پن کے نظارے پر، میں اپنے لفظوں کے جھوٹ پن کو محسوس کر سکوں، وہ لیمپ کے گلوپ پر خود کو گرم کرتے ہوئے بے حرکت ہو گئی اور اس نے کہا "بعض اوقات مجھے لگتا ہے کہ میں دھات کی ہی ہوئی ہوں۔" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں کی پوزیشن خفیف سی تبدیل ہوتی رہی۔ میں نے کہا "بعض دفعہ ایک اور طرح کے خوابوں میں میں نے تمھیں اسی طرح گھر کے ایک کونے میں رکھے ہوئے ناپنے کے چھونے سے کسی طرح سوچا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تم سردی محسوس کر رہی ہو۔" "کبھی کبھی جب میں گہری نیند سو رہی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا جسم کھوکھلا ہو رہا ہے اور میری جلد تختی کے مانند ہو رہی ہے۔ اور جب خون میرے اندر گردش کرتا ہے تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی میرے معدے پر دستک دے رہا ہو۔ اور میں اپنی ناپ آواز کو اپنے ہونٹوں پر محسوس کر سکتی ہوں۔ یہ اس طرح ہے کہ تم اسے ڈھلی ہوئی دھات کہہ سکتے ہو۔" وہ لیمپ کے اور زیادہ قریب ہو گئی۔ "میں تمھیں باتیں کرتے ہوئے سننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس نے کہا "اگر ہم دوبارہ کسی وقت مل پائیں اور جب میں سو رہی ہوں تو تم اپنا کان بائیں طرف میری پسلیوں کے ساتھ لگا دو تو تم میرے اندر کوئی سن سکو گے۔ میں نے ہمیشہ یہ سوچا ہے کہ کبھی تم ایسا کرو۔" جب وہ بات کر رہی تھی تو میں نے اسے بھاری سانس لیتے ہوئے سنا اور اس نے کہا کہ سالوں سے اس نے کچھ مختلف نہیں کیا۔ حقیقت میں اس کی زندگی مجھے پانے کے لیے وقف رہی تھی "نیلے کتے کی آنکھیں" جیسے پچھلے پانچ سالوں کے جمعے کے ذریعے اور وہ اونچی آواز میں کہتے ہوئے بارگی میں جاتی گئی اس انداز میں جیسے کہ وہ صرف اس شخص کو وہ سب کچھ بتا رہی ہو جو کہ اسے سمجھتا تھا

"یہ صرف میں ہوں جو ہر رات کو تمھارے خوابوں میں آتی ہوں اور کہتی ہوں "ایک نیلے کتے کی آنکھیں" اور اس نے کہا جب وہ سرگوشیوں میں جاتی ہے تو کچھ آرام کرنے سے پہلے

وہ اس سے کہتی ہے "نیلے کتے کی آنکھیں" لیکن وہ اسے اپنے خوابوں میں اسے یاد کیے بغیر تعظیم سے جھک جاتے ہیں۔ تب وہ پلیٹوں کے اوپر لکھ دیتی ہے، چاقو سے میز کی وارنش کو کھرچتے ہوئے لکھتی ہے "نیلے کتے کی آنکھیں" اور سینکڑوں، سینکڑوں، تمام عوامی عورتوں کی بھاپ چھوڑتی کھڑکیوں پر انگوٹھے کے ساتھ وہی نظم لکھتی ہے "نیلے کتے کی آنکھیں" اس نے کہا کہ ایک بار وہ ایک ڈارک سٹور میں گئی تو اس نے وہی خوشبو، جو ایک رات کو اس نے سوتے ہوئے مجھے خواب میں دیکھ کر محسوس کی تھی، وہاں پائی۔ ڈارک سٹور کی صاف ستھری نلکیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا اسے کیسا قریب ہونا چاہیے۔ تب وہ ایک کلرک کے پاس گئی اور اس نے اس سے کہا "میں نے ہمیشہ ایک ایسے آدمی کا خواب دیکھا ہے، جو مجھ سے کہتا ہے "نیلے کتے کی آنکھیں۔" کلرک نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا "مس، حقیقت یہ ہے کہ آپ کی آنکھیں اس طرح کی ہیں۔" اور تب اس نے اس سے کہا "میں اس شخص کی تلاش میں ہوں جس نے بالکل یہی الفاظ میرے خوابوں میں کہے تھے۔" اور کلرک نے ہنسنا شروع کر دیا اور وہ باہر کے دھندلے کونے کی طرف مڑ گئی۔ وہ صاف ستھری نلکی کو دیکھتی رہی اور اس کی خوشبو سونگھتی رہی۔ اور اس نے اپنا پرس کھولا اور اپنی قرمزی لپ اسٹک سے نلکی پر سرخ حروف میں لکھا "نیلے کتے کی آنکھیں۔" کلرک جدھر کو وہ تھا واپس آیا۔ اس نے اسے بتایا "میڈیم، آپ نے نلکیوں کو گندا کر دیا ہے۔" اس نے اسے ایک گیلا کپڑا تھماتے ہوئے کہا "اسے صاف کرو۔" اور اس نے لیمپ کے قریب ساکن رہتے ہوئے کہا۔ "اپنے چاروں ہاتھوں پاؤں پر جھکے ہوئے اس نے یہ ساری سہ پہر ان نلکیوں کو دھوتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے صاف کی "نیلے کتے کی آنکھیں"، حتیٰ کہ لوگ دروازے پر اکٹھے ہو گئے اور انھوں نے اسے پاگل گردانا۔"

اور اب جب اس نے بولنا بند کیا تو میں ایک کونے میں کرسی پر بیٹھا جھولتا رہا۔ "ہر روز میں اس فقرے کو یاد کرتا ہوں جس کی وجہ سے مجھے تم کو پالینا چاہیے۔" میں کہتا ہوں، "اب میرا یقین ہے کہ میں کل اسے بھلا دوں گا۔ حالاں کہ ہر بار میں نے ہمیشہ یہی کچھ کیا ہے لیکن جب میں نیند سے بیدار ہوتا ہوں تو اس لحاظ سے، جس کی وجہ سے میں تمھیں پا سکتا ہوں، ہمیشہ یہی چاہتا ہوں۔" اور اس نے کہا "تم نے پہلے ہی دن تمھیں خواب سے گھڑ لیا۔" میں نے کہا "میں نے انھیں گھڑا کیوں کہ میں نے تمھاری خاک رنگ آنکھیں دیکھیں تھیں۔ لیکن کل صبح کو میں انھیں یاد نہ رکھ سکا۔" اس نے لیمپ کے قریب اپنی موٹی ہوئی کلائیوں کے ساتھ بھاری سانس لی۔ "تم کہاں ہو؟ اب یہ یاد رکھو کہ میں انھیں دن کے شروع میں لکھتی

رہی ہوں۔"

اس کے مضبوطی سے بھینچے ہوئے دانت روشنی کے اوپر چمکے۔ "میں تمھیں اب چھونا چاہوں گا" میں نے کہا۔ اس نے اس چہرے کے ساتھ، جو روشنی کی طرف دیکھ رہا تھا، اپنی طرح اور اپنے ہاتھوں کی طرح جلتی بجھتی ہوئی نگاہ اوپر کی اور میں نے محسوس کیا کہ اس نے مجھے اس کونے میں جہاں میں کرسی میں بیٹھا ہوا جھول رہا تھا، دیکھا۔ "میں تمھیں بتا رہا ہوں اور یہ ایک سچ ہے" میں نے کہا۔ لیمپ کی دوسری طرف سے اس نے ایک سگریٹ مانگا۔ سگریٹ کا سرا میری انگلیوں میں غائب ہو گیا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ میں سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے کہا "نہیں جانتی کہ میں کیوں یہ نہیں کر پا رہی کہ میں نے ان الفاظ کو کہاں لکھا تھا۔" اس نے اداس ہو کر کہا "نہیں بات صرف اتنی ہی ہے کہ بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ میں نے کبھی خواب ہی دیکھا تھا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا اور لیمپ کی جانب بڑھا۔ وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکی اور میں سگریٹوں کے ساتھ واپس آ گیا اور وہ پنسل میرے ہاتھ میں تھی جو کہ لیمپ سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اسے اپنے ہونٹوں میں دبایا اور میرے ماچس کی تیلی جلانے سے پیشتر ہی وہ شعلے تک پہنچنے کے لیے جھک گئی۔ "دنیا کے کسی شہر میں اس کی دیواروں پر یہ لفظ لکھے ہوئے ملیں گے۔" نیلے کتے کی آنکھیں۔" میں نے کہا۔ "مگر میں یاد رکھوں گا۔ اب میں کل تمھیں ڈھونڈ لوں گا۔" اس نے دوبارہ اپنا سر اٹھایا۔ اور اب جلتا ہوا وہ اس کے ہونٹوں کے درمیان موجود تھا۔ "نیلے کتے کی آنکھیں۔" اس نے آخری آہ بھری۔

آنکھیں آدھی بند کیے ہوئے، اس نے اپنی ٹھوڑی پر جھکے ہوئے سگریٹ کے ساتھ یاد کیا۔ تب اس نے انگلیوں کے درمیان دبے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کو نکلتے ہوئے تعجب کیا "یہ اب کچھ اور ہی طرح ہے میں حرارت پکڑ رہی ہوں۔" اس نے نیم گرم اور کسی قدر تیز آواز کے ساتھ یوں کہا جیسے اس نے حقیقت میں کہا ہو۔ میں نے کہا جیسے کہ اس نے یہ سب کچھ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا ہو، اور اس کاغذ کو وہ شعلے کے قریب لے آئی ہو، جب کہ میں زور سے بولا "مجھے حرارت پہنچ رہی ہے۔" اور وہ اپنے ٹخنے اور ساتھ والی کرسی کے درمیان کاغذ کو مسلسل پکڑے ہوئے مور رہی تھی اور یہ ختم ہو رہا تھا اور میں زور سے بولا "اوپر" پھر کاغذ مکمل طور پر جل گیا اور اس کی سلوٹیں جو کہ دھول اور روشنی میں بدل گئی تھیں نیچے گر گئیں "یہ ختم ہوا" میں نے کہا "بعض اوقات میں تمھیں ایسی حالت میں دیکھ کر ڈر جاتا ہوں"

ہم کئی سالوں سے ایک دوسرے کو مل رہے تھے۔ بعض مرتبہ جب ہم دونوں اکٹھے ہوتے تھے تو کوئی شخص باہر ایک چیخ وغیرہ سُن لیتا اور ہم چونک جاتے۔ آہستہ آہستہ ہم سمجھنے لگے تھے کہ ہماری دوستی چیزوں اور سادہ ترین قوتوں کے زیر اثر آ چکی ہے۔ ہماری ملاقاتیں (نیندیں) اکثر معمولی سے شور سے ختم ہو جاتی تھیں۔

اب وہ لیمپ کے پاس سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ وہ ایک پرانے خواب میں سے ماضی کے جھروکے سے اسی انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی، جب میں اپنی ٹانگیں پیچھے ہاتھوں پر جھکا دیتا تھا اور ایک خاک رنگ آنکھوں والی عورت کی طرف میرا دھیان رہتا تھا۔ یہ وہ خواب ہی تھا جس میں میں نے پہلی بار اس سے کہا تھا "تم کون ہو؟" اور اس نے مجھ سے کہا تھا "مجھے کچھ یاد نہیں۔" میں نے اس سے کہا "لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اس سے پہلے بھی ایک دوسرے کو مل چکے ہیں۔" اس نے کہا "بالکل صحیح کہا تم نے۔ مجھے یاد آ رہا ہے۔" اور اس نے کہا "کتنی عجیب بات ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ ہم کئی اور خوابوں میں آپس میں مل چکے ہیں۔"

اس نے سگریٹ کے دو لمبے کش لیے۔ میں ابھی تک کھڑا لیمپ کی طرف رخ کیے ہوئے تھا پھر چونک کر میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے اوپر اور نیچے تک دیکھا اور اب بھی وہ ناپنے جیسی تھی۔ وہ بے ہنگی درخت، حیات جیسی نہیں تھی بل کہ زرا نرم ملائم ناپنے جیسی تھی۔ "میں تمہیں چھونا چاہوں گا۔" میں نے دوبارہ کہا۔ اور اس نے کہا "تم ہر چیز کو برباد کر دو گے۔" میں نے کہا "کچھ نہیں ہوگا۔" "بس ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ہمیں دوبارہ ملاپ کے لیے تکیے کا سہارا دینا ہوگا۔" اور اس نے لیمپ کے اوپر سے ہاتھ گزار دیا۔ وہ نہیں ہلی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے چھوؤں اس نے دوبارہ کہا "تم ہر چیز برباد کر دو گے۔" "شاید تمہیں لیمپ کے پیچھے سے آنا چاہیے، ہم سمجھے ہوئے پتے نہیں دنیا کے کسی حصے میں جا گریں گے۔" لیکن میں نے اصرار کیا "کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے کہا "اگر تکیے کا سہارا دیا جائے تو ہم ایک دوسرے سے ملاپ کر سکیں گے لیکن جب تم جاگو گے تو تم سب بھول چکے ہو گے۔" میں نے کونے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہ شعلے پر اپنے ہاتھ تاپتی ہوئی وہیں رکی رہی۔ اور میں اس وقت کمرے کے قریب نہیں تھا تب میں نے اپنے پیچھے اسے کہتے ہوئے سنا "جب میں آدھی رات کو جاگوں گی تو میں مسلسل سر میں پھیلتے ہوئے تکیے کی جھلار کے ساتھ اپنے کھلنے کا زخم محسوس کروں گی اور میں اس عمل کو صبح ہونے تک دہراتی رہوں گی نیلے کتے کی آنکھیں۔"

تب میرا چہرہ دیوار کی طرف تھا۔ "صبح تقریباً ہو ہی رہی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جب وہ بچے ہاکی کھیل رہے تھے تو میں جاگ رہا تھا اور یہ بہت عرصے پہلے کی بات تھی۔" میں دروازے کی طرف بڑھا۔ جب میں نے ناب کو ہاتھ سے چھوا۔ میں نے اس کی وہی مستحکم آواز دوبارہ سنی۔ "دروازہ مت کھولو۔" اس نے کہا "ہال کا راستہ مشکل خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔" اور میں نے اس سے پوچھا "تمھیں کیسے معلوم ہوا ہے؟" اس نے مجھے بتایا "کیوں کہ میں ایک لمحے کے لیے وہاں موجود تھی اور مجھے واپس آنا پڑا کیوں کہ میں نے جانا کہ میں سو رہی تھی۔" میں نے دروازے کو آدھا کھلا چھوڑ دیا۔ میں نے اسے تھوڑی سی حرکت دی۔ تب ٹھنڈی اور تیکھی ہوا کے ذریعے مجھ تک کیلی فصلوں والی ساتی زمین کی مہک پہنچی۔ وہ وہیں رہی۔ میں نے خاموش قبضوں پر جھولتے دروازے کو حرکت دیتے ہوئے ایک اور مرتبہ دیکھا اور میں نے اس سے کہا "میں نہیں سمجھتا کہ یہاں باہر کوئی بات ہے۔ مجھے دیکھی ملانے کی مہک آ رہی ہے۔" اور پھر فاصلے سے وہ بولی "میں یہ تم سے بہتر طور پر جانتی ہوں۔ جو ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ باہر ایک ایسی عورت موجود ہے جو گاؤں کے بارے میں خواب دیکھ رہی ہے۔" اس نے اپنے بازو شعلے کے اوپر تر چھے کیے۔ وہ بولتی رہی۔ "یہ ایک ایسی عورت ہے، جس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ کسی گاؤں میں اس کا گھر ہو لیکن وہ شہر نہ چھوڑ سکی۔" مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک ایسی عورت کو پچھلے خواب میں دیکھا تھا اور اب میں کھلے دروازے کے ساتھ جانتا تھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر مجھے ناشتے کے لیے نیچے جانا ہوگا۔ اور میں نے کہا "مجھے جاگ کر یہاں سے جانا ہوگا۔"

ایک لمحے کے لیے ہوا چلی، پھر خاموش ہو گئی اور کوئی جس نے بستر میں اپنا پہلو بدلا، اس کے سانس لینے کی آواز سنا جا سکتی تھی۔ چھتوں سے آنے والی ہوا بند ہو گئی۔ مزید مہک بھی نہیں تھی۔ "کل میں تمھیں اس سے بچا لوں گا۔" میں نے کہا "میں تمھیں بچا لوں گا، اس وقت جب کہ کوئی عورت گلی میں دیواروں پر لکھ رہی ہوگی "نیلے کتے کی آنکھیں۔" اور وہ اپنی ایک اداس مفتوح مسکراہٹ کے ساتھ، جو پہلے ہی سے ایک ناممکن اور ناقابل رسائی شے تھی، بولی "تاہم تم دن کے دوران میں ہر چیز کو بھول چکے ہو گے۔" اور اس نے اپنے ہاتھ واپس ہیپ کے اوپر رکھے۔ اس کے خدوخال ایک گہرے ہال کے پیچھے چھپ گئے۔ "تم وہ واحد شخص ہو، جسے جاگنے کے بعد یہ بھول جاتا ہے کہ اس نے کیا خواب دیکھا تھا۔"

☆☆☆☆

مبارک دابی

حامو گنجے کا قصہ

پہلے تو یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی لیکن شاید اس کے اس میں نہیں موجود تھا ورنہ تھی کیوں کہ بعد میں یہ لوگوں کا مطالعہ بن گیا پھر اس عمارت کے مکینوں کا بھی مسئلہ بن گیا اور صحیح طور پر کہا جائے تو یہ کہ اس وقت جب ان سب نے اس کے متعلق بات چیت کی تو وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ کیا وہ اسے جانتے بھی تھے یا نہیں۔ یہ مسئلہ اس کے اچانک غائب ہو جانے پر سامنے آیا۔ اخبارات نے جو اشتہار شائع کیا وہ کچھ یوں تھا "حامو سعید جو حرف عام میں "حامو گنجے" کہلاتا تھا اور جس کی عمر پچاس سال تھی، چھ ماہ پہلے غائب ہو گیا۔ وہ روٹی کی محافظ سڑک میں عمارت میں بطور چوکیدار رہتا تھا۔ جو شخص اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو اس سے درخواست ہے کہ براہ مہربانی اس کی اطلاع پولیس کو اس کی بیوی مسز ---- یا اس کے بچوں کو اس پتے ---- پر دے۔"

اور تب ہی اس عمارت کے مکینوں کو اس کی غیر حاضری محسوس ہوئی اور انھوں نے اس کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ جب انھوں نے اس کی گمشدگی کے بارے میں آپس میں تبادلہ خیال کیا تو تبھی وہ ایک دوسرے سے متعارف بھی ہوئے، حالاں کہ وہ ایک عرصے سے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔

انھیں معلوم تھا کہ حامو ---- معاف کیجیے ---- حامو گنجا، ازل سے اس عمارت میں موجود تھا۔ سب سے پرانے مکین، جو اس عمارت میں پچھلے دس سال سے رہ رہا تھا اس کا استقبال حامو گنجے نے ہی کیا تھا۔ شاید اس عمارت کا مالک ہی یہ جانتا تھا کہ حامو اب اس عمارت میں پہلے پہل آیا تھا لیکن اپنے دفاع پر بہت زور دینے کے بعد، اس نے پولیس مین اور اپنے قریب کھڑے اس عمارت کے مکینوں کو بتایا کہ میں اس کی، اس عمارت میں آمد کے بارے میں قطعی طور پر نہیں جانتا۔ اصل میں وہ کافی عرصے سے میری ملازمت میں ہے لیکن کب سے ہے یہ میں نہیں جانتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اس بات کا اندراج ضرور کیا ہوگا لیکن اس وقت، میں بھول چکا ہوں۔

سب سے پرانے مکین نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ شخص یقیناً یہاں اس

عمارت میں دس سال سے زیادہ عرصے سے موجود تھا' کیوں کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حقیقت میں ہی نے اس وقت میرا استقبال کیا تھا" ماموں کی بیوی نے کہا "میں ابھی تک اسی گھر میں رہ رہی ہوں، جہاں رہتے ہوئے میں چار بچوں کی ماں بن چکی ہوں اب مجھے صحیح تاریخ تو یاد نہیں لیکن وہ یہاں اس وقت سے تھا جب آج سے کئی سال پہلے اس وقت ابھی میرے شوہر نے کوئی نوکری بھی حاصل نہیں کی تھی ہمارا گھر بہت چھوٹا سا ہے اور اس شہر کے نواح میں واقع ہے" اس نے مزید کہا "اس عمارت میں ہمارے رہنے کے لیے جو جگہ مہیا کی گئی تھی وہ ایسی تنگ تھی کہ وہ بمشکل وہاں اپنی ٹانگیں پھیر سکتا تھا اور ہی یہ ہے کہ اس نے ہمیں یہاں اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ میرا شوہر دن اور رات کے کسی بھی موقعے پر یہاں چند گھنٹوں کی فرصت نکال کر اور گھریلو کام کاج کو نمٹانے کے لیے خود گھر آتا تھا۔ اس کے تعلقات ہمارے ساتھ بالکل پہلے ہی جیسے تھے۔" پولیس مین نے انتہائی احتیاط کی روشنی میں عمارت کے داخلی راستے پر کھلنے ہونے والے پڑوسیوں سے پوچھا "اس کا مطلب ہے کہ آپ میں سے کسی نے بھی اس کی غیر حاضری محسوس نہیں کی۔۔۔۔ یعنی کہ اب وہ اپنے بیوی بچوں کو ملنے کے لیے یہاں؟" ایک خوب صورت نوجوان نے جھک کر اپنے چہرے پر درست کرتے ہوئے کہا

"اصل میں مجھے جب بھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی، میں نے ہمیشہ سے یہیں حاضر پایا۔"

پولیس مین نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے پوچھا

"یعنی ہمیشہ۔۔۔۔؟"

"جی ہاں۔۔۔۔"

"کیا رات کے وقت بھی۔۔۔ یعنی رات گئے بھی؟"

اس خوب صورت چہرے والے نوجوان نے جواب دیا

"خاص اوقات آدھی رات کے بعد بھی۔"

پولیس مین نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے نہایت چالاکی سے سوال کیا

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ رات کے اس پہر کو تمھیں اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی تھی؟"

نوجوان ہکلانے لگا، اس نے اپنی گھبراہٹ اور خوف زدہ سی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے جیبوں میں سگریٹ تلاش کرنے کی کوشش کی اور ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا

"ہم سارے ایک جیسے ہی ہیں۔"

پولیس مین نے نوجوان پر سے اپنی نگاہیں ہٹائیں جیسے کہ وہ کوئی مشکوک شخص ہو یا اس سے کوئی ضروری سراغ ملنے کی توقع ہو۔

"پہلے میں نے تم سے تمھارے بارے میں پوچھا۔ پھر میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تمھیں اس کی رات کے اس پہر عورت کیوں پڑی تھی اور آخر میں جو کچھ تم نے کہا اس کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ ایسا تمھارے علاوہ سب ہی کرتے تھے اور مسٹر ..."

پولیس مین کو غائب ہو جانے والے شخص کا نام یاد کرنے کے لیے اپنی نوٹ بک سے رجوع کرنا پڑا۔

نوجوان نے، جو اپنا سگریٹ ابھی تک نہیں سلگا سکا تھا، جواب دیا

"میں نے بتا دیا ہے کہ ایسا ہم سب ہی کرتے تھے۔"

عین اسی وقت اس عمارت میں رہنے والی ایک عورت نے کہا

"نہیں وہ صرف اپنے متعلق کہہ رہا ہے۔۔۔۔ یا پھر دوسرے مردوں کے بارے میں۔ لیکن ہم عورتوں کا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔ ہم عورتوں میں سے کسی ایک کو بھی اس نوجوان سے کوئی سروکار نہیں رہا۔"

پولیس مین نے اس عورت کی طرف، اس کے بارے میں حاصل کردہ اپنی معلومات کے حوالے سے خاص توجہ کے ساتھ دیکھا۔ وہ ایک انشورنس کمپنی میں ملازمت کرتی تھی۔۔۔۔ تقریباً طلاق یافتہ، کہ اس کی طلاق کا کیس بھی التوا میں پڑا تھا۔۔۔۔ اس کی بیٹی ایک بورڈنگ سکول میں نرسری کلاس کی طالبہ تھی۔

تاہم اسے عورت کے چہرے پر تجربہ وغیرہ کے کوئی آثار نہیں ملے۔ اس نے اردگرد کھڑے لوگوں کو بھی غور سے دیکھا۔ اس کے متعلق حاصل شدہ معلومات نے اسے امید کی ایک کرن سے ہم کنار کر دیا۔

"اور کیا وہ کبھی تم لوگوں میں سے کسی کو بھی ملنے آیا؟"

اس عمارت کی نزدیکی ایک دکان کے مالک نے کہا

"جناب دکان تو سب کے لیے کھلی ہوتی ہے۔"

"اس کا مطلب وہ تمھارے پاس آتا تھا۔"

"ہاں وہ سودا سلف لینے آتا تھا۔"

"کس قسم کا؟"

"ہر قسم کا [illegible] روٹی [illegible] وغیرہ وغیرہ۔"

"اور اس کے علاوہ؟"

"بس اسی قسم کی ہی چیزیں جناب۔۔۔۔"

پولیس مین نے محسوس کیا کہ اس قسم کے سوالات کے نتیجے میں وہ کلہو کے بیل کی طرح وہیں اسی جگہ گھوم رہا ہے، اس لیے اس نے اپنی تحقیقات کا دائرہ بڑھاتے ہوئے کہا

"اچھا۔۔۔ تو اب تم مجھے اس کے دوستوں کے متعلق کچھ بتاؤ۔۔۔ اس کے بھی ہماری طرح کچھ دوست تو ضرور رہے ہوں گے؟"

اگرچہ اس کی توجہ کسی اور طرف تھی لیکن تحقیقات کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے ایک طرح سے یہ سوال اس نے سبھی سے کیا تھا کنٹریکٹر نے بڑے نپے تلے انداز میں جواب دیا

"یقیناً یہ شخص ہمارے پاس ایک عرصے سے تھا۔۔۔ لیکن میری اس کے ساتھ واقفیت بس "حد تمہیں اپنی ماں میں رکھے" اور جواباً اس کی طرف سے بھی "اور تمہیں بھی حد اپنی ماں میں رکھے" جیسے الفاظ تک محدود تھی۔

ہجوم کی طرف سے ملنے والے بہت سے جوابات آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات!

سوالات اور جوابات کی دوہرائی کا نظریہ بھی تقریباً ناکام ہی رہا تھا پولیس مین نے چند لمحوں کے لیے سوچا اور ایک دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہوئے وہ لوگوں کی طرف مڑا اور کہنے لگا "میرے مطابق یہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔ وہ شخص نہ تو کوئی مجرم تھا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی ایسی ویسی چیز کا ثبوت موجود ہے۔ تحقیقات سے یہ بھی پتہ چل چکا ہے کہ کسی کا مفروض بھی نہ تھا نہ ہی وہ بڑا بگڑے ہوئے شخص تھا اور نہ ہی مجرم جو قسم کا آدمی وہ تو ایک تنہائی کا مارا ہوا شخص تھا اور دوسری طرف ان چھ مہینوں کے دوران میں جب سے کہ یہ شخص جامو لیتی "جامو گنجا" کے متعلق ایسی معلومات اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے جن کے ذریعے اسے اس مصیبت میں وہ اس وقت گرفتار ہو سکتا ہے نجات دلانے کی کوشش کی ضرورت ہے یوں کہنا چاہیے کہ اس طرح اسے تلاش کر کے اس کے بیوی بچوں سے دوبارہ ملوا دینے کی

ضرورت ہے۔ میرے لیے ایک الجھن یہ ہے کہ اپنی محدود آمدنی کے باوجود خاص طور پر اس شخص کے تعلقات اپنے بیوی بچوں سے بہت اچھے تھے۔ آپ لوگوں کی رائے معلوم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح اس کی گمشدگی کا معما کس طرح حل کیا جائے؟ اس کی بیوی کا بیان اور آپ لوگوں کی آرا کا اگر موازنہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ ایک داخلیت پسند شخص تھا۔ وہ اپنے ذاتی معاملات کے بارے میں لوگوں سے کوئی گفتگو نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی اور نے اس کے بارے میں کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔ اور جب دن اور رات کے کسی حصے میں اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لیے جاتا تھا تو بھی کوئی شخص اس کی غیر حاضری کو محسوس نہیں کرتا تھا۔ شاید اس نے اس کام کے لیے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ اسے روپے پیسے کا بھی کوئی لالچ نہیں تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اتنی کم تنخواہ ملنے کے باوجود اس نے اپنے مالک سے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ کہ وہ اس کام سے مطمئن تھا۔ وہ کرایے کی ادائیگی کی کبھی بھاری ادائیگی سے بھی پریشان نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔ حقیقتاً ایک انسانی مسئلہ اس لیے آپ میں سے کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کی اس تقریر کا مثبت اثر پڑا۔ اور آخر کار اس خوب صورت نوجوان نے سگریٹ سلگا ہی لیا۔ لوگوں کے چہرے کا کھچاؤ ختم ہو گیا اور وہ نارمل ہوتے چلے گئے۔

انشورنس کمپنی کی ملازمہ بولی۔

"بے چارہ!۔۔۔۔ خدا کرے وہ اپنے بیوی بچوں میں حفاظت کے ساتھ واپس آ جائے۔"

اس کے گرد کھڑے لوگوں نے کہا: "آمین" اور سبھی خدا سے اس کے لیے سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔

یہ بات یقینی تھی کہ جاسوس نے اس وقت تک کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا جب کہ وہ اس وقت اس کی اس عمارت میں ملازمت کرنے آیا تھا۔ بعد میں بہرحال اس کے دل کے اندر کسی مسئلے نے ضرور سر اٹھایا تھا لیکن یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی کہ اپنی گمشدگی کی وجہ سے وہ لوگوں کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی ان لوگوں کے لیے، جن کا اس عمارت سے کوئی تعلق تھا مثلاً مالک اس عمارت کے مکین یا اس کے پڑوسی وغیرہ۔ اگر اس نے ایسا ہی کوئی طریقہ اختیار کیا ہوتا تو بھی یہ بات یقینی نہیں ہو سکتی تھی کہ دوسرے لوگ اس سارے معاملے کے متعلق یا تھوڑا بہت ہی اس کے اس اقدام کے بارے میں ضرور ہی جانتے ہوں گے۔

اس عمارت میں رہنے والے سبھی لوگ صاف ستھرے اور مخلصانہ اطوار کے مالک تھے۔ عمارت کا مالک بھی نیک سی شخصیت کا حامل شخص تھا، گو کہ وہ کم ہی یہاں آتا تھا۔ ہر مہینے کے آخر میں جب وہ کرایہ وصول کرنے آتا تو خالی فلیٹوں کے بارے میں استفسار کرتا یا پھر ان فلیٹوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا جو کہ عنقریب خالی ہونے والے ہوتے تھے تو تب بھی وہ چوکیدار سے بات چیت کرنے کی اس کے چہرے پر ایک ظاہر ہونے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا۔ یہ شاید اس وجہ سے تھا کہ جب بھی وہ یہاں آتا تو حامو کو، اسے کبھی تنہا نہ چھوڑتا تھا کہ سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا اور یوں اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی ہوئی لیکن سارا قصہ یہ ہے کہ عمارت کے مالک نے جب اپنی یادداشت پر زور دیا تو اسے یاد آیا کہ جب وہ وہاں سے جانے والا ہوتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ حامو ہمیشہ اس سے کچھ پوچھنے یا سوال کرنے کی تک و دو میں ہوتا تھا۔ مالک جب واپس جاتے ہوئے صرف اس لیے رک جاتا کہ حامو اس سے جو کچھ پوچھنا چاہتا ہے، پوچھ لے۔ حامو کبھی نہیں کہتا کہ نہیں اسے اس سے کوئی بات نہیں کہنی مثلاً اپنی تنخواہ وغیرہ کے بڑھانے کے بارے میں یا ایڈوانس لینے کے بارے میں بھی نہیں۔۔۔۔ وہ اگر کچھ کہتا تو بس یہی کہ: "بس جناب کوئی خاص بات نہیں۔" مالک کہتا

"کہو یوں کہو۔۔۔۔"

وہ جواب میں ہکلانے لگتا اور یوں لگتا کہ اظہار کے لیے اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے وہ مزید کہتا:

"دیکھیے جناب جب کوئی شخص اپنے اندر بہت گہرائی میں کچھ محسوس کرتا ہے۔۔۔۔ یعنی کچھ۔۔۔۔"

لینڈ لارڈ کے پاس چوں کہ ہمیشہ ہی وقت کم ہوتا تھا، اس لیے وہ جاتے جاتے کہتا

"اچھا بھئی۔۔۔۔ پھر سہی۔۔۔۔ پھر کبھی سہی۔۔۔۔!"

اور پھر وہ وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جب دائیں طرف کے فلیٹ نمبر ۱۰ میں رہنے والے شخص نے حامو کو ایک دن رات کے دو بجے اپنی رات کی محفل سجانے کے لیے کوئی چیز اس جگہ سے خریدنے کے لیے بھیجنا چاہا، جس جگہ کے بارے میں صرف حامو ہی جانتا تھا تو اس لمحے حامو کی زبان پر وہ دیرینہ سوال بالکل واضح ہو کر آ ہی گیا تھا حامو نے اس خوب صورت نوجوان کی مطلوبہ چیز اسے پکڑاتے ہوئے کہا

"جناب مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟"

نوجوان جس کی آنکھیں اس وقت سرخ ہو رہی تھیں بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں بولا

"باقی پیسا اپنے پاس ہی رکھو۔۔۔۔خدا حافظ!"

اس بات چیت کے صرف چار گھنٹے بعد، جب اس نوجوان نے، ان لڑکیوں کو واپس ان کے گھروں تک پہنچانے کے لیے کہا "کیوں کہ وہ خود انھیں وہاں تک پہنچانے کی حالت میں نہیں تھا" تو اس وقت بھی وہ سوال حامو کے ذہن میں بھی بالکل تازہ اور واضح تھا، لیکن وہ سوال اس نے اس سے اس لیے نہ کیا کہ وہ جانتا تھا کہ اسے اس کا کوئی جواب نہیں ملے گا۔ پھر اس نے اپنے طور پر بہت سا سنوار کر وہ سوال ان دونوں میں سے ایک لڑکی سے کر ہی دیا

اس نے اس لڑکی سے پوچھا

"دنیا میں اس وقت کیا ہو رہا ہے؟"

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور اپنی دوست پر جھکتے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا

"دنیا! بھلا تمھیں اس سے کیا سروکار؟۔۔۔۔بس تم اپنے خدا پر بھروسہ رکھو۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنی ساتھی کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔

جب اس دن وہ مانٹورلس کمپنی میں ملازم، اس علاقے کے براؤن بلاؤز کے لیے وہ بٹن لے کر واپس گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بلاؤز کے کھلے حصے کو اپنے ہاتھوں میں تھامے اپنے دروازے پر ہی اس کی منتظر تھی۔ اس نے وہ سوال اپنے ذہن میں تیار کر لیا اور جب اس عورت نے اپنی چیز اس سے وصول کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا

"میں اس عمارت میں ایک ایسی حالت میں۔۔۔۔"

لیکن اس عورت نے اس کی بات سنے بغیر اسے وہیں چھوڑ کر، اپنا دروازہ بند کر لیا تھا پھر ایک لمحے بعد وہ تیزی سے باہر نکل کر یوں چلنے لگی جیسے اس کے جوتے اس کے پاؤں کو تکلیف دے رہے ہوں۔ وہ ابھی تک وہیں عمارت کے داخلی راستے پر کھڑا تھا کہ اس نے اس عورت کی بڑبڑاہٹ سنی

"خدا کی پناہ۔۔۔۔وقت تو میرے ہاتھ سے نکل گیا۔"

ایک پڑوسی دکان دار نے اس سے ایک بار پوچھا تھا

"حامو۔۔۔۔میں نے آج تمھیں ایسے موڈ میں دیکھا تھا جیسے کہ تم کوئی بات۔۔۔۔ یعنی

کچھ۔۔۔"

حامو گنجے نے محسوس کیا کہ جو کچھ اس کے اندر پک رہا ہے، اس کا اظہار وہ اس شخص سے نہ کر سکتا ہے وہ اس کی بات سمجھ سکتا تھا کیوں کہ وہ شخص اپنے اردگرد بکھری چیزوں کو اپنی توجہ کی میں ڈال رہا تھا

حامو گنجے نے کہا

"اصل میں بات یہ ہے میرے بھائی کہ کچھ عرصے سے میرا دماغ بہت معاملات کی وجہ سے الجھا ہوا ہے۔"

دکان دار نے اس کی ساری مطلوبہ چیزوں کو اپنی توجہ کی میں رکھتے ہوئے کہا

"آپ جاؤ۔۔۔۔ میرے بھائی جلد اپنے آقا کے پاس پہنچو۔۔۔۔ اس نے تو تمہیں ڈھونڈنا بھی شروع کر دیا ہے۔ جلدی کر کے مجھے ان چیزوں کے پیسے پہنچا دینا۔"

اس عمارت میں رہنے والا سب سے پرانا مکین، حقیقت میں حامو گنجے کو تیزی سے واپس آتے ہوئے، اپنی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ جب حامو نے دوسرے فلور پر واقع کوٹھری، اس کے دروازے پر سے پکڑ لی اور واپس جانے ہی والا تھا تو اس شخص نے اسے روک کر اپنی چپکیں جھپکاتے ہوئے حامو کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا

"کیا وہ چلی گئی۔۔۔۔؟"

حامو اس کی بات سمجھ نہ سکا لیکن وہ آدمی بڑے مخصوص انداز میں مسکرایا تاکہ وہ اپنی بات کی وضاحت کر سکے اس طرح اس کی مصنوعی دانتوں کی پتی اپنی جگہ سے ہل گئی، اس نے دانتوں کو دوبارہ جبڑے میں صحیح حالت میں لاتے ہوئے پھر اپنی چپکیں جھپکائیں اور کہا

"وہ نچلی منزل والی پروسن یا۔۔۔"

"وہ چھوڑو۔۔۔۔ وہ تو کبھی نہیں گئی۔۔۔"

"خدا تمہارا بھلا کرے مسٹر حامو"

جب پولیس والا وہاں سے چلا گیا اور باقی لوگ بھی وہاں سے ہٹنے ہی والے تھے تو مینڈ لارڈ نے ان کرایہ داروں سے جنہوں نے ابھی تک کرایہ ادا نہیں کیا تھا ان سے کرائے کے متعلق بات کرنے کا یہ موقع غنیمت جانا اسی لمحے اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا

"بے چارہ چوکیدار۔۔۔۔ میں نے کبھی اسے کچھ کہتے ہوئے نہیں پایا۔"

محمد مرابط

ڈاکٹر صفی

صفی تنہا رہتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور وہ وہاں ایسی ہی زندگی بسر کر رہا تھا جیسے کہ دوسرے سب لوگ بسر کرتے تھے، سوائے ایک فرق کے کہ وہ کوکین کے نشے کے ذریعے ایک خاص لطف بھی حاصل کرتا تھا۔ وہ ہر شے پوست جمع کرتا اور جو اسے مل پاتے وہ انھیں گھر لے آتا۔ وہ ان کی پتیاں علیحدہ کرتا اور ان کے دوسرے بیجوں والے ڈوڈے تیزی کے چھوٹے سے تکوے کے ذریعے کچل کر ایک پیالے میں ڈالتا۔ وہ چائے دانی میں تھوڑی سی کوکین ڈالتا، اس میں چائے چینی اور ابلتا ہوا پانی ڈالتا اور اس برتن کو چولہے پر رکھ دیتا۔ جب یہ تیار ہو جاتا تو وہ اس برتن میں تازہ پودینہ ڈالتا۔ آخر میں وہ اپنے لیے گلاس میں چائے انڈیلتا اور چٹکی بھر نسوار لیتا۔ کبھی اس نسوار میں کوکین بھی شامل ہوتی۔ وہ مشک ڈوڈوں کا سفوف بناتا تھا اور وہ تمباکو کے ساتھ اسے اس پر چھڑکتا تھا۔

ایک دن وہ اپنی چائے پی چکنے اور نسوار سونگھنے کے بعد آرام کر رہا تھا۔ جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں سے وہ صحن میں موجود اپنے گدھے بخوبی دیکھ سکتا تھا، جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو محسوس کیا وہ وہ کچھ نہیں کر رہا تھا جیسے کہ وہ معمول کے مطابق کیا کرتا تھا۔ وہ ایک عجیب طریقے سے زمین پر لڑھک رہا تھا اور اس کے منہ سے تھوڑی سی جھاگ بھی نکل رہی تھی۔ صفی اٹھ بیٹھا اور اس کے پاس آیا۔ یہ ایک بوڑھا گدھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کے دانت خراب ہو چکے تھے۔ اس نے اس کے منہ کے اندر جھانکا اور پھر اس نے اس کے چار دانت کھینچ کر باہر نکال دیے۔

تمھارے پاس اب تھوڑے سے ہی صحت مند دانت رہ گئے ہیں۔ اس نے گدھے کو اطلاع کی۔ لیکن یہ کوئی بات نہیں۔ اگر میں انھیں بھی باہر نکال دوں تو میں تمھیں مصنوعی دانتوں کا ایک سیٹ لگوا دوں گا۔ تم چیزوں کو چبانے کے لائق تو پھر بھی رہو گے۔

بعد میں دن ختم ہونے پر صفی اپنے دوستوں کے ساتھ گاؤں کی مسجد کے سامنے بیٹھا ہوا تھا ایک طالب اپنے چہرے پر ہاتھ رکھے ہوئے وہاں سے گزرا۔ "میرا دانت" وہ چلا رہا تھا۔ صفی کو کین

کے عمل سے دور میں تھا اور اس کی یادداشت میں گدھے کے نکالے ہوئے دانت ابھی تک محفوظ تھے۔ اس نے طالب سے کہا میرے ساتھ گھر چلو۔ میں تمہارا دانت نکال دوں گا۔"

وہ طالب کو اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ وہاں اس نے اسے چٹائی پر بیٹھنے کو کہا اور ساتھ ہی اس نے اسے اس خاص چائے کا گلاس پینے کو دیا۔ اب اس نے طالب کو مٹی سوار کی چند چٹکیاں دیں

پھر جلدی صفی نے طالب سے کہا۔ اپنا منہ کھولو۔ وہ والا دانت کدھر ہے؟ اچھا یہ والا!!

اس نے اس کے ساتھ ایک ڈوری باندھی۔ کہو اللہ۔ اس نے طالب سے کہا۔ پھر اس نے دانت کو ایک تھیلے سے نکالا اور اس نے اسے نمک ملے گرم پانی کا گلاس دیا اور اسے کہا کہ وہ اس سے غرارے کرے۔

کتنے پیسے؟ طالب نے پوچھا۔

صفی نے کچھ سوچا اور کہا اس بار تو بالکل فری کیوں کہ تم میرے پہلے گاہک ہو۔

طالب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔ صفی جب اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو اس نے اپنے آپ سے کہا "اور اب میں اپنا کلینک بناؤں گا۔"

صفی نے اپنی اضافی زمین پر ایک جھونپڑی جیسی عمارت کی تعمیر شروع کر دی۔ جب یہ مکمل ہو گئی تو اس نے اس کی دیوار اس کے ساتھ جوڑ دیے۔ اس نے تین آدمی خریدے اور چوکیدار پاس رکھنے کے لیے ایک عدد میمنہ حاصل کی۔ اس نے کئی بوتلوں میں نمک ملا پانی بھر دیا۔ کمرے میں داخلے کے لیے ساتھ ساتھ دو دروازے تھے۔ ایک پر اس نے ایک بورڈ لگایا جس پر لکھا تھا "ڈاکٹر صفی انسانوں کے لیے" دوسرے پر درج تھا۔ "ڈاکٹر صفی۔ حیوانوں کے لیے"

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک سہ پہر کو ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ اس کے پاس آیا۔ عورت اپنے دو دانت نکلوانا چاہتی تھی۔ صفی کوکین کے نشے میں دھت تھا اور اسے کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے عورت کے ہاتھ اس کی کمر پر باندھے اور اس کے منہ میں جھانکنے سے پہلے اس کی دونوں ٹانگیں بھی باندھ دیں۔

اس نے مرد سے کہا "اس کا سر مضبوطی سے پکڑو۔" پھر اس نے پلاسوں کا ایک جوڑا اپنے ہاتھ میں لیا "منہ کھولو"

کیا ہوا ہے دو دانت؟ ہاں عورت چیخی۔

تو کہو۔ اللہ اور ابھی وہ کہہ ہی رہی تھی کہ اس نے دانت باہر نکال دیا۔ عورت نے درد سے کراہنا شروع کر دیا۔ اس نے اسے نمک والے پانی کا گلاس دیا۔ اب وہ اس کی طرف بڑھا اور اس نے اس کا دوسرا دانت بھی نکال دیا۔ اس بار وہ بے ہوش ہو گئی اور فرش پر گر گئی۔

جب صفی نے اسے فرش پر گرتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا تو وہ ڈر گیا۔ لیکن وہ اپنے کمرے میں گیا۔ اس نے تھوڑا سا مصالحہ لیا تاکہ وہ اسے سوراخوں کے اس سوراخوں میں بھر سکے، جو دانت نکالنے کی وجہ سے بن گئے تھے۔ جب عورت ہوش میں آئی تو اس نے اپنے شوہر سے باتیں کرنا شروع کر دیں اور کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس کے منہ سے ڈھیروں جھاگ نکلنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس کا شوہر خوف زدہ ہو گیا لیکن صفی اسی طرح اپنے کام میں لگا رہا۔ وہ جست کا ایک ڈبہ اور تھوڑا سا لوہا لایا۔ عورت کمروں کی انگیٹھی کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لوہا کے ٹکڑے آگ میں پھینکے۔ عورت نے اس دھوئیں والی سانسیں اپنے اندر کھینچیں۔ اب اس نے عورت کو کیمن والی چائے کا گلاس دیا اور اسے کہا "اسے گرم گرم پی جاؤ۔"

جلد ہی عورت اپنے شوہر کو بتانے لگی کہ سارا درد جاتا رہا تھا۔ تب صفی نے اپنے آپ سے کہا: "میں نے دانتوں کے لیے صحیح دوائی ڈھونڈ نکالی ہے۔"

"کیا پیش کروں؟" وہ شخص بولا۔

صفی نے دونوں دانت ہاتھ میں لیے کچھ دیر تک انھیں بغور دیکھنے کے بعد کہا: "بڑے دانت کے پانچ ریال اور چھوٹے دانت کے دو ریال آپ کو دینا ہوں گے۔"

ایک اور دن ایک آدمی آیا اور اس نے صفی کے دروازے پر دستک دی۔ "اسلام علیکم" کسان نے کہا "میرے پاس ایک گائے ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس کے دانت خراب ہیں۔"

"اندر آ جاؤ۔" صفی نے کہا۔ اور گائے کو دوسرے دروازے سے اندر لے آؤ۔ کسان گائے کو اندر لے آیا۔ صفی نے گائے کا منہ کھولا اور اندر دیکھا۔ وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہاں کوئی مسئلہ تھا یا نہیں۔ اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور کیمن کے تیل کے ساتھ اس نے اسے موٹی سی شکل میں پھیلا دیا۔ جب گائے نے اسے کھا لیا تو اس نے اس کا منہ دوبارہ کھولا اور تھوڑے سے ایک ایک کر کے اس کے دانتوں پر ہولے ہولے لگانی۔ اس نے کسان کو بتایا "گائے کے دانتوں میں کوئی خرابی نہیں۔ تم یہ دوائی لے لو۔ وہ پہلے سے بہتر محسوس کرے گی۔" اس نے کسان کو کیمن کا تیل ایک بڑی مقدار میں دیا۔

"مجھے کتنی ادائیگی کرنی ہوگی؟"

"ڈیڑھ ریال۔"

اس آدمی نے ادائیگی کی اور چلا گیا۔ جب وہ گھر گیا تو اس نے گائے کو دوائی دی اور اسے دوسرے جانوروں کے ساتھ چھوڑ دیا لیکن وہ گائے کے سر پر چڑھ گئی۔ اس نے ڈکرانا شروع کر دیا اور ٹانگیں مارتے ہوئے دوسرے جانوروں پر حملہ آور ہوئی۔ جب کسان یہ معلوم کرنے کے لیے باہر نکلا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا تو وہ اسے دیکھ کر اس کی طرف دوڑی آئی اور اس نے اسے ٹکر مار کر ہوا میں اچھال دیا۔ پھر وہ مڑی اور اس نے اپنا ایک سینگ اس کی ران میں گھونپ دیا جس سے اسے گہرا زخم آیا۔ ہمسائے دوڑے ہوئے آئے اور انھوں نے گائے کو باندھ دیا۔

ہمسایوں نے سوچا ہمیں اسے ڈاکٹر صفی کے پاس لے کر چلنا چاہیے۔ وہ کسان کو ساتھ لے کر کلینک پر آئے۔ ڈاکٹر صفی نے اس کی ٹانگ کا معائنہ کیا۔ اس نے ایک سوئی اور دوا دھاگا لیا۔ کسان نے اس سے کہا۔ میں تمھاری ٹانگ کے زخم کو سینے والا ہوں۔ اس نے سوئی اس آدمی کے گوشت میں گھسائی اور آدمی نے درد سے چلانا شروع کر دیا۔ اس نے سوئی نکال لی اور اس کے لیے کپ میں چائے کا گلاس لایا۔ جب اس آدمی نے یہ گلاس پی لیا تو وہ اس کے لیے ایک اور گلاس لایا۔ اس نے سوئی دوبارہ داخل کی اور آدمی دوبارہ چلایا۔ مجھے اس طرح کی صورت حال کے مطابق صحیح دوا حاصل کرنی چاہیے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ کچن کا سلوف لایا اور چائے کا تیسرا گلاس بھی پی لیا۔ اس سلوف کو اپنے منہ میں رکھو اور اسے پی لو۔ اس نے اسے بتایا۔ اس نے پندرہ منٹ تک انتظار کیا۔ اس دوران میں سو گیا تھا۔ تب صفی نے اس کی ٹانگ میں ٹانکے لگائے۔ اب اسے گھر لے جاؤ اور اسے بستر پر لٹا دو۔

ہمسایوں نے پوچھا ہم آپ کو کیا پیش کریں؟

یہ ایک بھاری کام تھا۔ صفی نے انھیں بتایا میں نے کافی مہنگا دھاگا استعمال کیا اور اس عمل میں میری چار سوئیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس لیے میں تم سے بیس ریال لوں گا۔

ہر ہمسائے نے تھوڑا تھوڑا حصہ ڈالا۔ انھوں نے صفی کو ادائیگی کی اور کسان کو گھر لے گئے۔ جب وہ چلے گئے تو صفی بھینس کی کھال پر بیٹھ کر لطف اندوز ہونے لگا۔ اس نے اپنے لیے اسی خاص چائے کا گلاس تیار کیا۔ اس میں کچن کا چمچ بھر کر ڈالا اور اسے پی لیا۔ اب اس نے اپنے آپ کو چوں کہ ایک

[illegible] کر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اب اسے شہر سے دوائیاں خریدنی چاہئیں۔ مجھے ان چیزوں کی جن کی مجھے ضرورت ہے ایک فہرست بنانی چاہیے۔ دوائیاں۔ اس نے لکھنے کے لیے ایک کتا اور بید کے ایک ٹکڑے سے بنایا گیا قلم لیا۔

پہلی دوائی جس کی مجھے ضرورت ہے۔ وہ ہے سرخ مرچ۔ اس کے بعد مجھے ضرورت ہے سفید زیرے اور کالی مرچ کی۔ اور پھر مہندی کی۔ وہ بہت سی اور چیزوں کے نام جنہیں وہ خریدنا چاہتا تھا لکھنے میں لگا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کو چل دیا۔ اس نے سرائے میں اپنا گھوڑا باندھا۔ پھر وہ اس شخص کو ملنے چلا گیا جس کا دروازے کے ساتھ ایک سائن تھا۔ مجھے دو پیسے کی سرخ مرچ اور دو پیسے کی کالی مرچ دو۔ اتنی ہی قیمت کا سفید زیرہ، دو دار چینی اور سونف بھی دے دو۔ اس نے اس شخص کو پیسے دیے اور آگے سٹال پر گیا۔ مجھے دو پیسے کا Yasoul، سنگترے کے پھولوں کے رس کی ایک بوتل اور اتنے ہی پیسوں کا Chibb دے دو۔ اس نے پیسے دیے اور بازار کی طرف بڑھا جس کی حد بندی پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر ایک چھتری پھیلی ہوئی تھی اور اس کے سامنے بہت سی قسموں کے سفوف اور بیج رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ریال کا لونگ خریدا۔ پھر وہ ایک پرچونے کے پاس گیا اور اس سے ایک پاؤنڈ شہد، ڈوری اور سوئیاں خریدیں۔

شہر سے نکلنے سے پہلے اس نے لکڑی کے تین بڑے کریٹ خریدے کیوں کہ وہ مریضوں کے بیٹھنے کے لیے تخت بنانا چاہتا تھا۔ اس نے ساری چیزوں کو گھوڑے پر لادا اور گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

جب صلی گھر واپس آیا تو وہ مختلف کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے دونوں آتش دانوں میں چولہے جلائے اور اس نے چولہے پر پانی کی بالٹی رکھی، دوسرے کمرے سے دو بڑی بڑی بوتلیں لیں۔ جب پانی گرم ہو گیا تو اس نے تینوں کریٹوں کے ٹکڑے علاحدہ کیے اور انہیں نکال دیا۔ جب پانی ٹھنڈا ہو گیا تو اس نے ایک بالٹی میں سونف اور دوسری میں سفید زیرہ ڈال دیا اور دونوں بالٹیوں کو چولہے پر رکھ کر پانی کو ابلنے دیا۔ جب کافی دیر کے بعد پانی ابل گیا تو اس نے بوتلوں میں اسے بھرنا شروع کر دیا۔ اس نے بوتلوں پر کارک لگائے اور انہیں الماری میں رکھ دیا۔ پانی کی اشیاء کو اس نے ڈبوں میں ڈالا اور انہیں دوسری الماری میں رکھ دیا۔ سب سے آخر میں اس نے کریٹوں سے تختے بنائے اور ان کو بیٹھنے کے تکیوں سے ڈھانک دیا تاکہ وہ لیٹنے پر آرام دہ ثابت ہوں۔

ایک شام کو جب اس نے کوکین کی ایک بھاری مقدار لے لی تھی اس نے دروازے پر دستک

کی آواز سنی۔ اسے کوئی پکار رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو اسے ایک بندہ نظر آیا کہو۔ کیا بات ہے؟

میری بیوی کو بچہ ہونے والا ہے اور کیس دائی کے بس سے باہر ہے

میں جا کر اس کا معائنہ کروں گا۔ صفی نے کہا۔ اس نے ابلی ہوئی سونف والی بوتل لی اور ایک سفید زیرے والی اور اس بندے کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اس شخص کے گھر پہنچ گئے۔ مجھے ایک گلاس دو صفی نے کہا۔ اس نے سفید زیرے اور سونف والا پانی آپس میں ملایا اور اس بندے کو کہا کہ وہ اسے اپنی بیوی کو پلائے۔ جب عورت نے وہ (جوشاندہ) پی لیا تو اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے بستر پر ادھر ادھر حرکت کرنے لگی۔ صفی نے اس کو چوتڑوں سے پکڑ لیا اور اسے آگے کی طرف دھکیلا تو بچہ باہر پھسل پڑا۔

عورت نے بچے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ناف کاٹ دی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جانے کا۔ صفی نے کہا۔

کتنی فیس ہوگی آپ کی؟

میرے پاس جو بہترین دوا تھی وہ میں نے دی تھی۔ صفی نے بتایا اور یہ بہت مشکل بھی تھی۔ میں نے یہ تمہیں چالیس ریال کی قیمت کی دی تھی۔

میرے پاس ایک نوجوان گائے ہے، بندے نے بتایا، اگر آپ چاہیں تو میں وہ آپ کو دے سکتا ہوں۔

"ٹھیک ہے۔" صفی نے کہا۔ "ہم کل شیخ کے سامنے اس سودے کی تکمیل کریں گے۔" بندہ رضامند ہو گیا۔ اگلی صبح صفی اس نوجوان گائے کے ساتھ اس شخص سے ملنے گیا اور پھر وہ دونوں شیخ کے پاس گئے۔ وہ بچھڑے کو گھر لے آیا اور اس نے اسے دوسری گایوں کے ساتھ باندھ دیا۔ وہ بہت خوش تھا کیوں کہ اس کی قیمت چالیس ریال سے یقیناً زیادہ تھی۔

ایک دن چند لوگ ایک دوسرے شہر کے پاشا کو اسے دکھانے کے لیے لائے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو ہر وقت بیمار رہتا تھا اور جب بھی وہ کسی سفر پر جاتا تھا تو اسے کسی ڈاکٹر کو ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ جب اسے اپنے ہمراہیوں کی زبانی پتہ چلا کہ گاؤں میں ایک ڈاکٹر موجود ہے تو اس نے اسے فوری طور پر ملنا چاہا۔ اور یوں وہ اسے سٹریچر پر ڈال کر اس کے کلینک میں لائے

پاشا سوچ رہا تھا شاید یہی شخص مجھے بالآخر صحیح دوائی دے دے۔ جب وہ کلینک پر پہنچے تو اس

وقت صفی ایک دوسرے جھونپڑے کی تعمیر کے آخری مراحل پر تھا "السلام علیکم" "وعلیکم السلام" یہ بخر دکا پاشا ہے، جو ادھر ہمارے پاس آیا ہوا ہے۔

"میں بہت بیمار ہوں۔" پاشا بولی پڑا

"اسے اندر لے چلو" صفی نے کہا، "تم کتنے لوگ ہو؟"

"ہم چھ بندے ہیں۔"

"میں صرف دس منٹوں میں کمرہ تیار کر دوں گا۔ تمھیں یہاں سونے کی ضرورت بھی پڑے گی کیوں کہ تم کو یہاں اس وقت تک ٹھہرنا ہوگا جب تک وہ صحت یاب نہیں ہو جاتا۔"

وہ ان سے صفی نے شوربے کو چولہا بند کر دیا اور فرش پر چند چٹائیاں بچھا دیں۔ تب پاشا اور اس کے دوست اندر آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے صفی بھی چلا آیا۔ بعد میں اس نے ان کے لیے چائے تیار کی اور جب وہ اسے تیار کر رہا تھا تو اس نے اس میں وکین بھی ڈال دی۔ پھر وہ ان کے لیے ایک پلیٹ میں کوکین ملا شہد لایا تاکہ وہ اسے چائے کے ساتھ کھا سکیں۔

جب وہ چائے پینے کے لیے بیٹھ گئے تو صفی نے پوچھا تم کیا بیماری محسوس کرتے ہو؟

مجھے نہیں معلوم۔ مجھے کوئی خاص قسم کی بیماری تو ہے نہیں۔

لیکن کوشش کرو اور مجھے بتاؤ کہ یہ کیسی ہے؟ صفی نے کہا۔

پاشا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب میں سوچتا ہوں تو مجھے پتا نہیں چلتا کہ میں واقعی سو رہا ہوتا ہوں یا نہیں۔ اس نے کہا اور جب میں چلتا ہوں تو مجھے پتا نہیں چلتا کہ میں نے چلنا ہے کہ نہیں اور جب میں یہ کر رہا ہوتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ میں واقعی یہ کر رہا ہوں یا نہیں حتیٰ کہ جب میں بے حرکت بیٹھا ہوتا ہوں تو حقیقت میں مجھے نہیں پتا ہوتا کہ میں بیٹھا ہوا ہوتا ہوں یا کہ نہیں۔ اور اس لمحے میں کیا بات کر رہا ہوں یا میں محض سوچ رہا ہوں کہ میں ایسا کر رہا ہوں؟

صفی اچھل پڑا کیسی خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس مرض کے لیے میرے پاس صحیح دوائی موجود ہے۔ میں نے اس طرح کے کئی کیس دیکھے ہیں اور میں نے ان کا کامیابی سے علاج کیا ہے۔

واقعی پاشا نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ شخص بیمار نہیں ہے۔" صفی نے سوچا۔ یہ محض ایک امیر آدمی ہے اور مرنے سے ڈرتا ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے

اس نے پانی سے بھری بالٹی لی اور اسے چولہے پر رکھا۔ جب پانی ابلنے لگا تو اس نے اس میں بڑی مقدار میں سرخ مرچیں ڈال دیں۔

اور اس نے انھیں کئی گھنٹوں تک کھولنے دیا جیسے کہ وہ گائے کا گوشت گلا رہا ہو۔ جب وہ تیار ہو گئیں تو اس نے ایک اجلا ہوا کپڑا لیا اور اسے ایک دوسری خالی بالٹی میں چھان لیا اور سرخ مرچوں کے ٹکڑے باہر کپڑے پر ہی رہ گئے۔ اس نے پانی سے بوتل بھر لی۔

پھر اس نے Yasoul کا ٹکڑا لیا اور وہ چکنی مٹی لی جس سے کہ عورتیں اپنے برتن دھوتی ہیں۔ پھر وہ پاشا کے پاس آیا۔

"یہ سیدی" اس نے کہا "یہ ہے دوائی۔ اصل میں دوائی نہیں لیکن تم اسے دوائی سمجھ بھی سکتے ہو اور نہیں بھی۔ یہ تمھیں صحت یاب کر بھی سکتی ہیں اور نہیں بھی۔ پاشا نے صوفی کی طرف دیکھا۔ "تو پھر اس ساری خرافات کا مقصد کیا ہے؟"

"تم نے بتایا ہے کہ تم سوتے ہو اور نہیں بھی سوتے۔ تم کھاتے ہو اور نہیں کھاتے اور جیتے ہو لیکن نہیں جیتے۔ میں تمھیں ان سب کی دوائی دے رہا ہوں۔ اس چکنی مٹی کا آدھا گلاس ہر صبح کو پیو اور اسے پیتے ہوئے ساتھ ہی اس Yasoul کا ایک ٹکڑا بھی کھاؤ۔ اور رات کو سونے سے پہلے بھی اس عمل کو دہراؤ۔"

"ٹھیک۔"

جب شام ہوئی تو پاشا نے فیصلہ کیا کہ اس ملاق کو شروع کر دینا چاہیے۔ پہلے مجھے خوں چیز منہ میں ڈالنی چاہیے پھر مائع کے ساتھ اسے حلق سے نیچا اتار لینا چاہیے۔" اس نے سوچا۔

پس اس نے وہ چکنی مٹی منہ میں ڈالی اور مرچوں والا پانی کا گلاس پیا۔ جب یہ اس کے معدے میں گیا تو اس نے محسوس کیا جیسے اس کے اندر آگ سی لگ گئی ہو۔ اس کا گلا اور دل جل رہے تھے حالانکہ وہ کئی مہینوں سے اپنے بستر سے ہل بھی نہیں سکتا تھا لیکن اس وقت وہ بغیر کسی کی مدد کے اٹھ بیٹھا اور تیزی سے آگے پیچھے چلنے پھرنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ منہ کھول کر سانس لینے لگا۔ جلدی وہ ہو گیا اور اس نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا اور اچانک اسے لگا کہ وہ صحت یاب ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کو بلایا "یہ ایک اچھی رات ہے۔ باہر آ کر ہوا کی مہک کو محسوس کرو۔"

وہ سب باہر آئے انھوں نے اپنے سر اٹھا کر ہوا کو سونگھا اور انھوں نے اسے بتایا کہ یہ واقعی ایک خوب صورت رات تھی۔ جب وہ اندر چلے گئے تو پاشا ایک کونے میں تین گھنٹوں تک بیٹھا، اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ سو گیا۔

صبح جب پاشا جاگا تو اس نے فیصلہ کیا کہ چوں کہ وہ خود کو بھلا چنگا محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے وہ اور دوائی نہیں لے گا۔ وہ صفی سے کہنے گیا "میں صحت یاب ہو گیا ہوں۔ الحمدللہ میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ میں اپنے آپ کو بیس سال کا نوجوان شخص محسوس کر رہا ہوں۔ میں تمھاری یہ خدمت کروں؟"

"یہ فیصلہ تم خود کرو۔" صفی نے کہا "تم جانتے ہو کہ تمھارے نزدیک تمھاری صحت کی کیا قدر و قیمت ہے۔"

پاشا نے سونے کے سکوں سے بھری ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی اور صفی کو دے دی۔ اور پھر وہ اور اس کے دوست وہاں سے چلے گئے۔

صفی اپنے طبیب سے مطمئن نہیں تھا کیوں کہ وہ زخموں کی جان اور ان کے جیسے تھیلے کیسوں کے علاوہ ابھی تک کوئی زبردست دوائی دریافت نہیں کر پایا تھا۔ اس نے اس پر دوبارہ غور و فکر کیا۔ وہ کوشش کرتا رہا اور چیزوں کو آپس میں ملاتا رہا پھر ان نسخوں کو خود پر آزماتا رہا۔

ایک دن اس نے چند پتے لیے اور انھیں آگ پر سکھایا۔ پھر اس نے ان کا سفوف بنایا اور پھر کھرل میں بھنگ کے بیجوں کو کوٹا۔ اس نے ان دونوں اشیا کو کیکن کے سفوف میں ملا دیا۔ اس میں سے کچھ میں اس نے ارگن (Argan) کا تیل ملایا اور تیسرا حصہ میں شہد ملایا۔ جو سفوف بچ گیا وہ اس نے ایک ڈبے میں محفوظ کر لیا۔

دیکھتے ہیں اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے اس (دوا) کو چمچ بھر کھایا اور اوپر سے گلاس بھر چائے پی۔ پھر وہ پیچھے کی طرف جھک گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس سہ پہر کو تین مختلف لوگوں نے اس کے دروازہ کھٹکھٹایا لیکن وہ سوتا رہا۔ رات کو ایک شخص اپنے بیٹے کو لے کر آیا تاکہ وہ اس کے دانت کا معائنہ کر سکے لیکن وہ تب بھی نہ جاگا۔

اگلی صبح صفی نے گدھوں کو چیخوں چیخوں کرتے اور مرغیوں کو شور کرتے ہوئے سنا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اس نے باہر جھانکا۔ انھیں کیا مسئلہ پیش آیا ہے؟ اس نے سوچا۔ جب وہ ابھی دروازے

میں ہی کھڑا تھا تو چند لوگ اندر آ گئے۔ صفی نے ان سے کہا۔ "سہ پہر بخیر۔"

"ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی۔" انھوں نے کہا۔ "ابھی تو صبح کا ہی وقت ہے۔"

"کیا یہ سہ پہر کا دن نہیں ہے۔"

"بالکل نہیں، وہ تو کل کا دن تھا۔" انھوں نے کہا۔

صفی اندر گیا۔ "آہا!" اس نے سوچا۔ "میں نے وہ پا لیا، جس کی مجھے تلاش تھی۔"

اس شام کو اس کی ہمسائی عورت نے اس کے لیے طرخون پتوں کے ساتھ پکے ہوئے گوشتوں اور پالک سے بھری ہوئی ایک بڑی کیتلی بھیجی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسی ڈشیں بہت پسند کرتا تھا۔ جو کچھ اس نے بھیجا تھا، وہ اسے پا کر بہت خوش ہوا تھا۔ تبھی وہ بہت اچھے موڈ میں اسے کھانے بیٹھ گیا۔

لیکن ابھی اس نے چند لقمے ہی لیے تھے کہ کسی نے اس کے دروازے کو بہت زور و شور سے کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

"ٹھہرو!" وہ چلایا۔ "دروازہ مت توڑو۔" پھر وہ اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ یہ دو آدمی تھے، جنھوں نے ایک عورت کو اٹھا رکھا تھا۔

وہ اسے جلدی سے ٹھیک میں لے آئے۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" صفی نے پوچھا۔ "اس بے چاری کو ادھر بیچ پر ڈال دو۔"

"اس کا سر چکرا رہا ہے اور اسے بخار بھی ہے۔" انھوں نے کہا۔ "اور اس کی اُنگلی کا رنگ گہرا زرد ہے۔"

صفی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور محسوس کیا کہ عورت خاصی بیمار ہے۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ اندے کی زردی کی طرح پیلے تھے۔ وہ ڈر رہا تھا کیوں کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کرے لیکن اس نے کہا۔ "عورت کو ہر قسم کی بیماری ہے۔ ہمیں اس تمام پیلے پن سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو گا۔ اس نے کچھ کھایا پیا ہے؟"

"نہیں۔ تین دن سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا۔"

"اسے گوشتوں کے شوربے کی ضرورت ہے۔" صفی نے کہا۔

وہ اپنے کمرے میں گیا اور گوشتوں والا وہ سالن لے کر آیا جو وہ کھا رہا تھا۔ جب وہ اسے لے

کر آیا تو اس نے اس میں تیار کردہ چار چمچ سفوف ڈالا اور اسے اس شوربے میں مکس کیا۔ عورت وہ سارا شوربہ پی گئی۔ پھر صفی نے اسے کوکین والی چائے کا گلاس دیا۔ صرف دس منٹ بعد وہ اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ بالکل بشاش بشاش دکھائی دے رہی تھی۔

دونوں آدمی بولے "کیا کمال کی دوائی ہے یہ۔ ہم یہ پورا پیکٹ خریدنا چاہیں گے۔ اگر آپ بیچنا پسند کریں تو ..."

صفی نے عورت کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو پھر ڈر گیا لیکن ساٹھ ریال کے عوض وہ اس سفوف کا پیکٹ ان لوگوں کے ہاتھ بیچنے پر رضامند ہو گیا۔ انھوں نے رقم ادا کی اور عورت کو ساتھ لے کر وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد وہ بیٹھ کر کچھ سوچتا رہا۔ اس نے سونے کے سکوں سے بھری ہوئی اس تھیلی کے متعلق سوچا جو کہ اسے بڑھیا نے دی تھی اور اس کے علاوہ جو روپیہ اس نے بچایا تھا، اس کے متعلق بھی اس نے سوچا۔ پھر وہ اچانک اٹھا اور وہ اس ہمسائے کے گھر کی طرف چل دیا، جو اس کے قریب ہی رہتا تھا۔ اس نے اس شخص کے ہاتھ اپنی گائیں اور گدھے بیچ دیا اور گھر چلا گیا۔ تب اس نے اپنے کپڑے اور دوائیاں اکٹھی کیں اور اس نے اپنا سارا اسباب گھوڑے پر رکھ دیا۔ اس نے سڑک کی جانب دیکھا اور اپنے آپ سے کہا۔

"یہی صحیح راستہ ہے۔" تب وہ گھوڑے کی زین پر بیٹھا اور اپنے کلینک کو پیچھے چھوڑتا ہوا سڑک پر چل پڑا۔

تقریباً آدھی رات کے وقت دو آدمی کلینک کے دروازے پر آئے۔ انھوں نے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں کلہاڑا اور وہ ڈاکٹر صفی، ڈاکٹر صفی چلا رہے تھے۔ جب انھوں نے دروازہ توڑ دیا تو اندر آ کر انھوں نے اسے تلاش کیا وہ وہاں نہیں تھا۔ اس وقت تک گاؤں کا ہر شخص کلینک کے باہر موجود تھا۔ شیخ دوڑتا ہوا آیا۔

جس آدمی کے ہاتھ میں کلہاڑا تھا، چلایا۔ ڈاکٹر صفی نے مجھے دوائی دی تھی، جب میں نے یہ دوائی اپنی بیوی کو دی تو وہ پاگل ہو گئی۔ وہ چیختی چلاتی ہوئی دوڑتی رہی اور ہم اسے نہ پکڑ سکے۔ جب وہ گری تو خون اس کے منہ جاری ہو گیا اور پھر وہ مر گئی۔ ہم ڈاکٹر صفی کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ کہاں ہے؟

شیخ نے بولنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے سوچا۔ پھر اس نے کہا تمھاری بیوی مر چکی ہے۔ اسے قبرستان لے جاؤ اور دفن کر دو۔ اس طرح تم ایک نوجوان عورت سے شادی کر سکتے ہو اور دانا صفی کا یہ طبلک تمھارے رہنے کے لیے موجود ہے۔ تم اس پر قبضہ کر سکتے ہو۔ جس گھر میں تم اس وقت رہ رہے ہو اسے تم بیچ سکتے ہو یا اسے کرایے پر اٹھا سکتے ہو۔

اس شخص نے شیخ کی طرف دیکھا۔ شکریہ۔ اس نے کہا "میں ایسا ہی کروں گا۔ تم ایک بہت ہی اچھے آدمی ہو۔"

سب لوگ سونے کے لیے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ صفی ابھی تک رات کی تاریکی میں سڑک پر رواں دواں تھا۔ وہ خوش تھا اور وہ پوری طرح کوکین کے نشے میں چور تھا۔

☆☆☆☆

نجیب محفوظ

پیلس واک

وہ آدھی رات کے وقت نیند سے جاگ گئی۔ وہ ہمیشہ سی گھڑی کے الارم پر انحصار کیے بغیر ہی اٹھ بیٹھتی تھی۔ ایک ہی خواہش نے، جس نے اس کے اندر جڑ پکڑی تھی، بالکل صحیح وقت پر اسے جگا دیا تھا۔ چند لمحوں تک اسے یقین نہ آیا کہ وہ جاگ چکی ہے۔ خواب اور تخیل کا ملا جلا تاثر اس کے ذہن میں موجود تھا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے وہ کسی قدر پریشان سی تھی، اس ڈر سے کہ شاید نیند نے اسے دھوکا دیا ہے۔ آہستہ سے سر کو ہلاتے ہوئے اس نے کمرے میں موجود مصلی تاریکی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ کوئی پتہ نہیں کہ اس وقت کیا بجا تھا۔ اس کے کمرے سے باہر گلی کا شور صبح ہونے تک جاری رہتا تھا۔ چاہے یہ شام ہو، آدھی رات ہو یا صبح ہونے سے پہلے کا وقت ہو وہ کافی ہاؤسوں اور شراب کی دکانوں سے اٹھتی آوازوں کی بک بک سن سکتی تھی۔ وقت کے تعین کے لیے اس کے پاس ایک حساس گھڑی جیسا اندرونی احساس اور گرد و نواح کی چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی ہی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے شوہر نے ابھی تک دروازے پر دستک نہیں دی اور یہ کہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ابھی تک اس کی چھڑی کے ٹکرانے کی آواز پیدا نہیں ہوئی۔

نجیب اس وقت اسے جاگ پڑنے کی عادت ہو گئی تھی۔ یہ ایک پرانی عادت تھی، جسے اس نے اپنی جوانی کے زمانے سے اپنایا تھا اور اب جب کہ وہ پختہ عمر کی ہو چکی تھی پھر بھی یہ عادت برقرار تھی۔ جیسا کہ اس نے شادی شدہ زندگی کے دوسرے لوازمات کے ساتھ ساتھ ہی سیکھا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی شامی تفریحات سے واپس گھر لوٹنے کا انتظار کرنے کے لیے آدھی رات کو جاگ پڑتی تھی پھر وہ اس کے سو جانے تک اس کی خاطر مدارت میں لگی رہتی۔ وہ نیند کے حملے پر قابو پانے کے لیے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ وہ بسم اللہ پڑھ کر بستر سے باہر آئی اور فرش پر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پہلے اپنی چارپائی اور پھر ایک کھڑکی کی چوکھٹ کے سہارے دروازے کا راستہ تلاش کیا۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو برآمدے میں پڑی ایک شیلف پر رکھے لیمپ کی مدھم روشنی کمرے میں در آئی۔ وہ اسے

اٹھانے کے لیے آگے بڑھی اور اندھیرے میں اس کے شیشے سے منعکس ہوتی اس کی پیلی روشنی کا دائرہ سی
چھت پر پھرنے لگا۔ اس نے صوفے کے ساتھ پڑی میز پر لیمپ رکھ دیا۔ روشنی ہر طرف پھیل گئی، جس
سے اس بڑے چوکور کمرے کی اونچی دیواریں، چھت اور اس کے متوازی شہتیر وغیرہ سب کچھ واضح
طور پر نظر آنے لگا۔ اجاڑ اور بے معیار مکان تھا۔ شیرازی قالین بہت پرانا، پلاسٹر کا بنا ہوا ایک بڑی
اداری مختلف رنگوں اور شکلوں کے ٹیلوں میں سے مزین پھر سے ڈھکا ہوا ایک لمبا صوفہ۔

عورت اپنے سراپے پر ایک نظر ڈالنے کے لیے آئینے کی طرف بڑھی۔ اس نے محسوس کیا کہ
اس کا رخ ان عارف شکلوں سے پرے ہے اور کسی قدر پیچھے کی طرف کھسک گیا ہے۔ اس کے بھورے بال
بکھر کر اس کے ماتھے پر پھیل گئے تھے۔ اس نے اپنی انگلیوں سے عارف کی گرہ کھولی اور اسے کھول
دیا۔ اس نے عارف کو اپنے بالوں کے گرد صحیح طور پر جمایا اور آہستگی اور احتیاط کے ساتھ اس کے دونوں
سروں کو دوبارہ باندھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرے کے اطراف کو یوں صاف کیا جیسے وہ نیند کی
باقیات کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ چالیس سال کی ایک درمیانی جسامت کی عورت تھی مگر
پتلی دبلی لگتی تھی حالانکہ اس کے بدن کی ہر حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ ایک نہایت ہی خوب صورت
توانائی کی حامل تھی۔ اس کا ماتھا اونچا تھا اور قدرے لمبوترا چہرہ بے حد خوب صورت تھا۔ اس کی چھوٹی
چھوٹی آنکھیں بہت حسین تھیں، جو ہر وقت بیداری لگتی تھیں۔ اس کی ناک بہت پتلی سی اور چھوٹی سی تھی
، جو نتھنوں پر قدرے پھیل گئی تھی۔ اس کے نازک ہونٹوں کے نیچے اس کی ٹھوڑی ذرا نوکیلی تھی۔ اس
کے گورے چٹے گال پر ایک خوب صورت کالا سیاہ تل تھا۔ اپنے آپ کو ایک چادر میں لپیٹتے ہوئے باتھ روم
تک جانے کے لیے، جب وہ دروازے کی طرف بڑھی تو کسی قدر جلدی میں لگتی تھی۔ اس نے دروازہ
کھولا اور لکڑی کے بنی جھنجری سے چاروں طرف سے بند جگہ پر پہنچ کر کھڑی ہوئی اور اپنے چہرے کو
، بائیں ہاتھ کھولتے ہوئے وہ جھنجری کے ان چھوٹے چھوٹے گول سوراخوں سے لگ کر باہر جھانکنے
لگی جن کی وجہ سے اس کا سراپا باہر گلی میں سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ باتھ روم پرانے قدیم رہائشی
مکانوں پر بنے، پانی کے حوضوں کے نیچے اترتی سیڑھیاں اور ایک اسکول کی اوپر کی طرف جاتی سیڑھیاں
دکھائی دیتی تھیں۔ یہ علاقہ چیلس واک یا بین القصرین کے درمیان واقع تھا۔ دوسری گلیں یہاں آ کر آپس
میں مل جاتی تھیں۔ ال ثہامین یا کاپر سمتھ سٹریٹ جو جنوب کی طرف جاتی تھی اور دوسری چیلس واک، جو
شمال کی طرف جاتی تھی۔ اس کے بائیں طرف گلی تنگ ہوتی اور موڑ مڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ یہ گلی

اداسی میں پٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور وہاں سے ماحول اور بھی زیادہ غم زدہ ہو جاتا تھا، جہاں سے نیند میں ڈوبے گھروں کی کھڑکیاں پیلی دکھائی دیتی تھیں، جو صبح کے وقت تک کھلی رہنے والی دکانوں اور کافی ہاؤسوں کے دھندلے لیمپوں اور چکلوں سے برآمد ہونے والی مدھم روشنی میں بجلی کی روشنی سے زیادہ واضح نہیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس کے دائیں طرف گلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس طرف کوئی کافی ہاؤس نہیں تھا صرف بڑے بڑے سنور تھے، جو بہت جلدی بند ہو جاتے تھے۔ وہاں اس طرف دلچسپی کی کوئی خاص چیز نہ تھی سوائے ہالاوں اور برتن کی دکانوں کے، ان میناروں کے، جو روشن ستاروں کی روشنی میں رات کو سر اٹھائے ہوئے بڑے بڑے دیوانوں کی طرح معلوم ہوتے ہوئے لگ رہے تھے۔

یہ دوسرا منظر جو پچھلے پچیس سالوں سے اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ اس سے قطعاً بے زار نہیں ہوئی تھی۔ حسن یا انسانیت کے بارے میں اس میں وہ درد نہیں تھی، اس کے لیے شاید بے زاری یا بیزاری کا تاثر کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہ رات دن اس کی تنہائی کا ساتھی تھا اور ایک بیمار سے اس کے اکیلے پن کا واحد دوست تھا، جب وہ اپنے بچوں کی پیدائش سے پہلے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے محروم کر دی گئی تھی۔ جب وہ ایک گہرے کنوئیں، گرد آلود صحن اور بڑے بڑے کمروں کی اونچی چھتوں والے، اس دھندلے بہت بڑے مکان کی واحد مکین کی صورت میں اپنے دن رات گذارا کرتی تھی۔

ابھی وہ چودہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی شادی ہو گئی تھی اور پھر جلد ہی اپنے شوہر کے وارثین کی وفات کے بعد اس نے اپنے آپ کو اس بڑے گھر کی مالکن کے طور پر پایا۔ ایک بوڑھی عورت اس گھر کی دیکھ بھال کے لیے اس کی مدد کرتی تھی لیکن رات ہی صحن میں بنے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی جاتی تھی اور یوں وہ بدروحوں اور بلاؤں سے بھری، سیاہ راتوں میں اکیلی رہ جاتی تھی۔ وہ ایک گھنٹے تک اونگھتی رہتی اور دوسرے گھنٹے میں جاگتی رہتی، یہ جاننے اور سوچنے کا عمل جاری رہتا تھی کہ اس کا مشکوک شوہر اپنی رات کی لمبی سیر و تفریح کے بعد واپس پہنچ جاتا۔ اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے، اس نے اپنی ملازمہ کے ساتھ جس نے ہاتھ میں لیمپ پکڑا ہوتا تھا، ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومنے پھرنے کی عادت اپنائی تھی۔ وہ ان کمروں میں گھومتے ہوئے ڈری سہمی ہوئی نظروں سے کچھ تلاش کرتی رہتی تھی۔ وہ پہلی منزل سے شروع کرتی اور اوپر والی منزل تک جاتی اس دوران میں، وہ بدروحوں کو بھگانے کے لیے قرآن کی سورتیں پڑھتی رہتی۔ وہ اس کام کو اپنے کمرے پر پہنچ کر ختم کرتی، اپنے کمرے کے دروازے کو تالا لگاتی اور پھر بستر پر چلی جاتی، گہری نیند میں جانے

سے پہلے تک، وہ قرآنی آیات کی تلاوت جاری رکھتی۔

پہلے پہل وہ اس گھر میں رہتے ہوئے، رات سے بہت خوف زدہ رہتی تھی۔ وہ انسانوں سے زیادہ جنات کی دنیا سے بہتر طور پر واقف تھی اور اس کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اس بڑے مکان میں اکیلی نہیں رہتی۔ ایک عرصے سے، مکمل خالی رہنے والے اس مکان کے بڑے بڑے کمروں سے جنات بھرے کیسے، اور رہ سکتے تھے۔ شاید انھوں نے اس کے اس گھر میں آنے سے پہلے، حتیٰ کہ اس کے اس کی روشنی دیکھنے سے پہلے ہی، یہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ اکثر اوقات، ان کی سرگوشیاں سنتی تھی کہ وہ سوتے ہوئے، ان کے گرم سانسوں کے احساس سے جاگ پڑتی تھی۔ جب وہ بالکل اکیلی رہ جاتی تو وہ قرآنی آیات کی تلاوت ہی میں اپنے آپ کو مصروف رکھتی، زیادہ تر اس کی ایک سو بارہویں سورۃ کی تلاوت میں، جس میں خدا کی مطلق حاکمیت کو بیان کیا گیا ہے یا پھر وہ جعفری کے چھوٹے سوراخوں سے لگی بے چینی سے کالی بدروحوں اور چکروں کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے، بہت احتیاط سے، اس کی کھانسی یا ہنسی کی آواز کو سننے کی کوشش کرتی تاکہ اس طرح، وہ اپنے حواس بحال کر سکے۔

پھر ایک کے بعد ایک بچے پیدا ہوتے گئے۔ اپنے ابتدائی دنوں میں، جب بچے ابھی نوخیز ہی تھے، وہ اس کے خوف کو دور کرنے یا اس کی ڈھارس بندھانے میں معاون ثابت نہ ہوئے۔ اس کے برعکس اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کے احساس اور اس ڈر فکر سے کہ کہیں ان کو نقصان نہ پہنچ جائے، اس کا خوف کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ وہ منتر، ان ٹوٹے ٹوٹکوں، تعویذ اور قرآنی سورتوں کی حفاظت میں، سوتے جاگتے ان کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ان کے اردگرد رہتے ہوئے ان پر اپنی محبت نچھاور کرتے ہوئے، وقت گذارتی تھی۔ جب تک کہ اس کا شوہر، اپنی شام کی تفریحات سے واپس نہ آ جاتا، اس وقت تک اسے مکمل ذہنی سکون حاصل نہ ہوتا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ جب وہ اپنے کسی شیر خوار بچے کو سلانے کے لیے جھولا جھلا رہی ہوتی تو اچانک وہ اسے اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے، اپنے سینے سے لگا لیتی۔ وہ نہایت غور سے، کچھ سنتے ہوئے خوف زدگی کے عالم میں کسی خطرے کو بھانپ کر کمرے میں موجود کسی ذی روح کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں کہتی "ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ تمھارا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا۔ ہم مسلمان ہیں اور ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں۔" اور پھر وہ جلدی سے نہایت خشوع و خضوع سے قرآن کی ایک سو بارہویں سورت پڑھتی، جس میں خدا کے بے مثل ہونے کی دلیل دی گئی ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ، جب اس نے

راتوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا تجربہ حاصل کر لیا تو اس کا خوف کافی حد تک کم ہو گیا۔ اب وہ بغیر ڈرے ہوئے نہایت خاموشی سے، ان کے ساتھ معاملات کرنے لگی۔ اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے قریب دبے پاؤں چلتا ہوا محسوس کرتی، تو وہ تقریباً ایک روکھے لہجے میں کہتی "یہ تمہارے پاس ان لوگوں کے لیے، کوئی عزت نہیں، جو اپنے مہربان خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ وہی ہماری حفاظت کرنے والا ہے اس لیے جو بدنیتی کر کے یہاں سے الگ ہو جاؤ۔" لیکن اس کا ذہن اپنے شوہر کی واپسی تک کسی بھی مضمون نہ ہوتا۔ بے شک سوتے ہوئے یا جاگتے ہوئے اس کے شوہر کی قدر میں موجودگی ہی اس کے تحفظ کے احساس کے لیے کافی تھی۔ اس وقت اس بات کی کوئی وقعت نہ ہوتی کہ گو دروازے کھلے ہیں یا بند ہیں، لیمپ جل رہا ہے یا کہ بجھا ہوا ہے۔

اپنے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے، پہلے سال کے دوران میں، متواتر راتوں کو باہر رہنے پر جب اس نے نرم لہجے میں کمزور سا احتجاج کیا تو اس کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ اس کے جواب نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے نہایت تحکمانہ لہجے میں اونچی آواز سے کہا تھا "میں ایک مرد ہوں۔ میرا کام حکم دینا اور ممانعت کرنا ہے۔ میں اپنے کسی رویے پر تنقید کو قبول نہیں کروں گا۔ جو میں تم سے چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ تم میرا حکم مانو۔ مجھے سختی برتنے پر مجبور نہ کرو۔"

اس واقعہ سے اس نے سبق لیا اور دوسرے سبق، جو اس نے حاصل کیے وہ یہ تھے کہ وہ ماحول سے مطابقت حاصل کر لے حتیٰ کہ اس کی غضب ناک آنکھوں چہرے سے بچنے کے لیے، اسے جنوں کے ساتھ بھی زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ بغیر کسی شرط یا استحقاق کے، اپنے شوہر کا حکم ماننا اس کا فرض تھا۔ وہ اس حد تک مغلوب ہو چکی تھی کہ تنہائی میں بھی وہ یوں راتوں کو اس کے باہر رہنے پر کوئی اعتراض نہ کرتی۔ اس نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ صحیح مرد اپنے بستر اور آدھی رات کے بعد بھی گھر سے باہر رہنا دراصل کسی ایک شخص کی عام مصروفیات تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چاہے وہ خوش تھی یا ناخوش اس نے اپنی مرضی کو بہ رضا و رغبت قبول کر لیا تھا۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو جاتا، وہ ہمیشہ ایک محبت کرنے والی تابع دار اور مطیع بیوی کی طرح رہتی۔ شکست پر بھی تحفظ کے اس انداز سے سمجھوتہ کرنے پر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔

جب بھی اس نے اپنی پچھلی زندگی کو یاد کرنے کی کوشش کی تو ہمیشہ اچھائی اور خوشی کا تاثر ہی اس کے ذہن میں آیا۔ خوف اور غم اس کے نزدیک بے معنی ہو چکے تھے۔ ایک رحم بھری مسکراہٹ سے زیادہ ان کی وقعت نہ تھی۔ اگر وہ اپنے اس شوہر کے ساتھ نہ رہ رہی ہوتی اور اس نے بچپن سے ماں پر محیط

محرومیاں نہ سہی ہوتیں تو وہ ان بچوں کی ماں نہ بن پاتی، جو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے اور زندگی کے تمام تر لوازمات اور آسائشات سے پرے، یہ گھر بھی اسے نہ ملتا اور یہ خوش کن باشعور زندگی بھی اس کا مقدر نہ بن پاتی۔ یقیناً اس کے پاس یہ سب کچھ تھا۔ ایک حسن کے ساتھ، زندگی بسر کرنا قابل برداشت بات تھی اور اسی طرح یہ شام بھی قابل برداشت تھی جنوں میں سے کسی نے بھی اسے یا اس کے بچوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ انھوں نے اسے خوف زدہ کرنے کے لیے چند بے ضرر سی شرارتیں ہی کی تھیں۔ "خدا کی تعریف بیان کرنی چاہیے کہ تمام اچھائیاں اسی سے منسوب ہیں۔"

اگرچہ اس طرح اس کی خوش گوار نیند خراب ہوئی تھی اور وہ گھریلو کام کاج جسے دن کے وقت ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا اس وقت تک اسے کرنا پڑتا تھا مگر پھر بھی اس طرح اس کے آنے کا انتظار کرنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ صرف یہ کہ انتظار اس کی بہت سی یادوں سے وابستہ زندگی کا ایک لازمی عنصر بن چکا تھا بل کہ وہ آنے والی رات کو اپنے اس انتظار کے حوالے سے اپنے مرد کے ساتھ اپنی بے پناہ محبت اور اسے خوش رکھنے کی ایک رسم و علامت کے طور پر اپنی تابع فرمانی کا اظہار کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ کھڑکی میں کھڑی وہاں سے بیس واٹ اور اقوام وحشی کے بازاروں اور یہ پھر تمام اسلحہ جات سے مینا روں کا نظارہ کرتی تو اس کی ذات صبر و شکر و قناعت کا ایک مجسم بن کر نمودار ہوتی۔

وہ سڑک کے دوراہے پر بے ڈھنگے پن سے آپس میں پیوست مکانوں پر نگاہیں ڈالتی، جو سکون کی حالت میں کھڑے، ان چیزوں کی نظاری طرح لگتے تھے جیسے وہ سخت قسم کے نظم و ضبط سے آزاد ہو کر آرام کر رہے ہوں۔ وہ سڑک کے اس پسندیدہ نظارے سے محظوظ ہوتی ہوئی مسکراتی، جو صبح ہونے تک جاری رہتا تھا جبکہ دوسرے بازار اور گلیاں اس وقت نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ منظر نیند کی طرف سے اس کی توجہ ہٹا دیتا اور اس کے خوف کو دور کیے ہوئے، اس کی تنہائی کا ساتھی بنا رہتا۔

راستہ اردگرد کے ماحول کو ایک ایسی گہری خاموشی کے سپرد کر دیتی، جس میں گلی میں سے برآمد ہونے والی ہر آواز واضح ہو جاتی، جیسے کسی پینٹنگ کے سایوں پر موجود Shades اس کے نام کو گہری وضاحت بخشتے ہیں۔ کسی قہقہے کی آواز، یوں گونجتی جیسے کوئی اس کے کمرے میں قہقہے لگا رہا ہو اور ایک دھیمے لہجے میں کی گئی بات بھی بالکل واضح طور پر سنائی دیتی تھی۔ وہ کسی شخص کی کھانسی کی کھرکھراہٹ کو آخر میں ایک کراہ میں تبدیل ہوتے ہوئے بھی سن سکتی تھی۔ یہاں سے کسی ریستوران کے ویٹر کی آواز ایک موذن کی پکار کی طرح لگتی تھی۔ "آپ کے لیے تھوڑا اور تباکو، دھیمی آواز میں کہہ رہا ہے آپ

سے کہتی "خدا کی پناہ یہ وقت رات کے اس پہر کو مزید تنہا کو بھرنے کا آرزو مند ہے ہیں؟"

وہ اسے اپنے غیر حاضر شوہر کی یاد دلاتے تھے۔ وہ فکر مند ہو کر سوچتی "بھلا اس وقت وہ کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟ بہر حال، جہاں کہیں بھی وہ ہے اور جو کچھ کر رہا ہے اسے صحیح سلامت ہونا چاہیے"

ایک بار اسے باور کرایا گیا تھا کہ مسٹر احمد عبدالجواد جیسے دولت مند، مضبوط اور خوب صورت مرد جو اپنی راتیں بسر کرنے کے عادی ہوں کسی دوسری عورت کی زلف کے اسیر ہوتے ہیں۔ اس وقت اس کی روح حسد کے رہے سے آلودہ ہوئی تھی اور وہ ایک گہرے غم میں گھر گئی تھی۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اس سے اس کے بارے میں کچھ پوچھ سکے۔ لیکن اس نے اپنے اس اندیشے کا اظہار جب اپنی ماں سے کیا، تو اس نے نرم لہجے میں بھرپور طنز کرتے ہوئے کہا "اس نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد تم سے شادی کی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اسے بھی اپنی بیوی کے طور پر رکھ سکتا تھا۔ یہ وہ تین چار بیویاں بھی رکھ سکتا تھا۔ اس کے باپ کی کئی بیویاں تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم اس کی واحد بیوی ہو۔"

اگرچہ اس کی ماں کے ان الفاظ نے اس کی دل جاں کو حاصل نہ بدحواسی تاہم آخر کار اس نے اس کی صداقت اور معقولیت کو تسلیم کر لیا۔ اگر اس افواہ میں کوئی صداقت بھی تھی تو شاید راتوں کو دیر سے آنے اور تنہا کرنے کی طرح یہ بھی مرد ہونے کی ایک اور خصوصیت تھی۔ بہر طور بہت سی برائیوں کے مقابلے میں صرف ایک برائی تو کچھ بھی نہیں تھی۔ محض ایک شک کی بنیاد پر اپنی یہ خوشیوں اور راحت بھری دنیا تباہ کرنا ایک غلطی ہی ہوتی۔ مزید یہ کہ مرچیز کے باوجود شاید یہ افواہ محض ایک تصور یا ایک جھوٹ ہی تھی۔ اس نے جانا کہ حسد اس کی زندگی میں پہلے سے موجود دکھوں اور تکلیفوں سے کچھ زیادہ مختلف چیز نہیں تھا۔ اس دکھوں اور تکلیفوں کی حقیقت کو تسلیم کرنا ایک اور حتمی بات تھی۔ ناقابل قبول حالات کے خلاف جدوجہد کا ایک بہترین طریقہ اس نے اپنی روحانی طاقت اور صبر سے کام لینے کو قرار دیا۔ حسد اور اس کے محرک کو اس نے اپنے شوہر کی دوسری اچھی اور اچھی خصوصیات کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے مترادف پایا۔

وہ بدستور راستے کی طرف دیکھتی رہی اور لوگوں کی آپ شپ سنتی رہی حتیٰ کہ اس نے گھوڑے کے سموں کی آواز سنی۔ اس نے پناہ گاہ کی طرف اشارہ کیا اور اندھیرے میں روشنی کے ساتھ ایک بگھی کو آہستہ آہستہ قریب آتے دیکھا۔ وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بڑبڑائی "آخر کار" یہ اس کے شوہر کے ایک دوست کی بگھی تھی اور وہ کئی اور دوستوں کے ساتھ جو یہاں

انغر وفش ہی میں رہتے تھے۔ شام کی اس معمول کی سیر و تفریح کے بعد، اس تکھی کے مالک کی وساطت سے اپنے گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ تکھی گھر کے بالکل سامنے آ کر رک گئی، اس کے شوہر کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی "لی امان اللہ۔"

جب اس کے شوہر نے اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہا تو اس کی آواز کو اس نے ایک تحیر آمیز محبت کے ساتھ سنا۔ اگر اس نے اس کی آواز کو یوں ہر رات نہ سنا ہوتا تو اسے اس کا کبھی یقین نہ آتا۔ وہ اور اس کے بچے اس کی سنجیدگی، وقار اور ہوشمندی ہی کے عادی تھے۔ اس وقت نہ جانے کس طرح وہ ایک کھلنڈرے اور چنچل اطوار کے حامل شخص میں ڈھل گیا تھا؟ تکھی کے مالک نے اس کے شوہر کو یہ کہتے ہوئے سنا "جب تم تکھی سے اتر رہے تھے تو یہ تم نے سنا کہ گھوڑا آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ کتنی قابل رحم بات ہے کہ میں جس شخص کو ہر رات گھر واپس لاتا ہوں، وہ ایک گدھے پر سواری کرنے کے لائق ہے۔"

تکھی میں موجود تمام لوگوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ اس کے شوہر نے ان کے خاموش ہونے کا انتظار کیا اور پھر جواب دیا "یہ تم نے جواب نہیں سنا۔۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ اس صورت میں میں "تم" پر سوار ہونا پسند کروں گا۔"

سب لوگ ایک بار پھر ہنس پڑے۔ تکھی کے مالک نے کہا "باقی لطیفے ہم کل رات کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔"

تکھی پیس ڈک کی طرف بڑھ گئی اور اس کا شوہر اپنے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے بیڈ روم میں جانے کے لیے بالکنی چھوڑ دی۔ لیمپ اٹھا کر وہ بیٹھک میں آ گئی اور پھر ہال میں آ کر سیڑھیوں کے اوپری سرے پر کھڑی ہو گئی۔ وہ باہر کے دروازے کے کھلنے بند ہونے اور چٹخنی لگانے کی آواز سن رہی تھی۔ پھر اس نے تصور میں اس بے قد کے آدمی کو سیڑھیاں عبور کرتے دیکھا، جس نے اپنی سنجیدگی اور متانت کو تکلیف دہ طنزیہ مذاق میں ڈبو دیا تھا۔ اگر اس نے اوپر سے سب کچھ سن نہ لیا ہوتا تو وہ کبھی ایسی بات پر یقین نہ کرتی۔ سیڑھیوں پر اس کی چھڑی کی ٹک ٹک کی آواز کو سنتے ہوئے، اس نے اسے راستہ دکھانے کی خاطر جنگلے کے اوپر سے لیمپ کو اونچا کر کے اٹھا لیا۔"

☆☆☆☆

نجیب محفوظ

ہاتھ کی صفائی

"وقت آ گیا ہے کہ تم کارآمد آدمی ہو" ماں نے مجھ سے کہا اور ساتھ ہی اپنی جیب میں ہاتھ سرکاتے ہوئے کہنے لگی "یہ دو درجا کر تھوڑا سا لوبیا لے آؤ۔ دیکھو راستے میں کھیل کود میں مت لگ جانا ورنہ بھوک سے بھی بچنا۔"

میں نے تھالی لی۔ کھڑاویں پہنیں اور ایک دھن گنگناتا ہوا چل پڑا۔ لوبیا بیچنے والے کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں نے انتظار کیا اور تب مجھے اس سنگ مرمر کی میز تک جانے کا راستہ ملا۔

"جناب۔۔۔۔ مجھے ایک پیاستر کے برابر لوبیا چاہیے۔" میں نے چیخنے کے انداز میں کہا۔

اس نے فوراً پوچھا "خالی لوبیا؟ تیل یا گھی کے ساتھ نہیں؟"

میں کوئی جواب نہ دے سکا تو اس نے بے رخی سے کہا "چلو سہی اور آنے دو۔"

میں بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا اور شکست خوردہ گھر لوٹا۔

"ہوں۔۔۔۔ خالی تھالی کے ساتھ لوٹ آئے۔ شریر کے تم نے پیسے۔۔۔۔ لوبیا کہاں ہے پیاستر گم کر بیٹھے۔"

ماں مجھ پر چلائی۔

"صرف لوبیا چاہیے تھا۔ یا تیل یا گھی کے ساتھ چاہیے تھا۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔"

میں نے احتجاج کیا۔

"حمق ہر روز صبح کے وقت تم کیا کھاتے ہو؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کچھ آدمی اسے کہو تیل کے ساتھ لوبیا۔"

"میں اس شخص کے پاس پہنچا اور کہا "جناب ایک پیاستر کا لوبیا تیل کے ساتھ۔"

اس نے نہایت عجلت کے انداز میں تیوری چڑھا کر پوچھا "السی کا تیل، اخروٹ کا تیل یا

زیتون کا تیل؟"

میں حیران رہ گیا اور مجھ سے کوئی جواب نہ بن پایا "کسی اور کے لیے جگہ چھوڑ دو بھئی۔" وہ چلایا۔

میں غصے میں تپا ہوا ماں کے پاس پہنچا تو وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی "تم پھر خالی ہاتھ واپس آ گئے؟ لو یا نہ تیل۔"

"السی کا تیل، اخروٹ کا تیل یا زیتون کا تیل۔۔۔۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"تیل کے ساتھ لو یے کا مطلب ہوتا ہے السی کے تیل کے ساتھ۔"

"اب مجھے یہ کیسے معلوم ہوتا۔"

"تم سمجھے ہو اور وہ ایک تکلیف دینے والا شخص ہے۔ اسے کہو کہ لو یا، السی کے تیل کے ساتھ۔"

"اب مجھے کیا پتہ تھا۔"

میں جلدی سے واپس ہوا اور ابھی دکان سے کچھ دوری پر ہی تھا کہ میں نے اس آدمی سے کہا۔ "جناب لو یا السی کے تیل کے ساتھ۔"

اس نے کرچھے کو (تیل والے) برتن میں داخل کرتے ہوئے کہا۔ "پیاستر کاؤنٹر پر رکھ دو۔"

میں نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا مگر پیاستر وہاں نہیں تھا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں تلاش کیا۔ جیب کو ہر طرف سے ٹٹولا لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ آدمی نے بے زاری کے ساتھ خالی کرچھا پیچھے ہٹا لیا تو تم نے پیاستر گم کر دیا۔ تم قابل اعتماد لڑکے نہیں ہو۔" میں نے نیچے اپنے پاؤں کی طرف اور اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے نہیں کھویا۔۔۔۔ یہ سارا وقت میری جیب میں رہا ہے۔"

"مسئلہ کھڑا مت کرو اور کسی دوسرے کے لیے جگہ خالی کرو۔"

میں خالی تھالی کے ساتھ ماں کے پاس لوٹا۔

"افسوس۔۔۔۔ بے وقوف لڑکے۔ پیاستر۔۔۔۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟"

"وہ میری جیب میں نہیں تھا۔"

"کیا تم نے اس کی مٹھائی خریدی؟"

"میں قسم کھاتا ہوں میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"تم نے کیسے اسے مُہر کیا؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"کیا قرآن کی قسم کھا سکتے ہو کہ تم نے اس کے عوض کچھ نہیں خریدا۔"

"میں قسم کھاتا ہوں۔"

"کیا تمھاری جیب میں سوراخ ہے؟"

"نہیں۔"

"ہو سکتا ہے تم نے پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ اس شخص کو دیا ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"کیا تمھیں کسی بھی بات کا یقین نہیں۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔"

اس نے راضی بہ رضا ہو کر ہاتھوں کو تان کے انداز میں جھورا۔ "چلو وہی بات سہی۔" وہ بولی "میں تمھیں ایک روپیہ دوں گی لیکن یہ میں تمھاری گردن سے نکالوں گی اور اگر تم اب جانی تھانی کے ساتھ واپس آئے تو میں تمھاری گردن توڑ دوں گی۔"

میں ایک مزے دار ناشتے کا خواب دیکھتا ہوا دوڑنے کے انداز میں روانہ ہوا۔ گلی کا وہ موڑ جہاں لوبیا بیچنے والا بیٹھا تھا وہاں میں نے جشن کے انداز میں خوشی کی آوازیں نکالتے بچوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ میں نے اپنے پاؤں کو گھسیٹا کیوں کہ میرا دل ان کی طرف کھنچتا تھا۔ کم از کم تھوڑی دیر کے لیے سرسری طور پر ہی مجھے ان کو دیکھ لینا چاہیے۔ میں ان میں گھس گیا اور مجھے لگا کہ ہاتھ کی صفائی دکھانے والا سیدھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک مدہوش کر دینے والی خوشی مجھ پر چھا گئی۔ میں اپنے آپ میں بالکل نہیں رہا تھا۔ میں اپنے پورے حواس کے ساتھ ٹرکوں، انڈوں، ماچسوں اور رسوں کے کرتبوں میں محو ہو گیا۔ جب وہ شخص پیسے اکٹھے کرنے کے لیے آگے آیا تو میں بڑبڑاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا "میرے پاس تو پیسے ہی نہیں۔" وہ وحشیانہ طریقے سے میری طرف بڑھا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچایا۔ میں دوبارہ اس کے مکے کی ضرب سے میری کمر تقریباً ٹوٹ ہی چکی تھی۔ تاہم جب میں لوبیا بیچنے والے کی طرف جا رہا تھا تو بے انتہا خوش تھا۔

"ایک پیاستر کالو یا السی کے تیل کے ساتھ جناب۔" میں نے کہا۔

وہ کوئی حرکت کیے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"مجھے تعاویذ دو۔" اس نے غصے سے مطالبہ کیا۔

"تعاویذ۔" تعاویذ کہاں تھی؟ کیا میں نے اسے دوڑتے ہوئے گرا دیا تھا؟ کہیں اس شعبدہ باز نے تو اس کے ساتھ ہاتھ کی صفائی نہیں دکھا دی تھی؟"

"لڑکے۔۔۔۔ تم بالکل پاگل ہو۔"

میں واپس مڑا اور اپنے راستے پر چلتے ہوئے کھوئی ہوئی تعاویذ تلاش کرنے لگا جہاں شعبدہ باز موجود تھا۔ اس جگہ کو میں نے خالی پایا۔ کہیں بچوں کی آوازیں مجھے ایک قریبی گلی میں اس تک لے گئیں۔ میں دروازے کے قریب کھڑا تھا، جب شعبدہ باز نے مجھے دیکھا تو وہ اشتعال آمیز لہجے میں چیخا۔ پیسے دو ورنہ فوراً یہاں سے چل دو۔

"وہ تعاویذ۔" میں مایوسی سے بولا۔

"ننھے شیطان۔۔۔۔ کونسی تعاویذ؟"

"مجھے میری تعاویذ واپس کرو۔"

"یہاں سے دفعان ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں سانپوں کی غذا بنا دوں گا۔"

اس نے تعاویذ چرائی تھی۔ بہرحال خوف کے مارے میں اس کی نظروں سے دور ہو گیا اور رونے لگا۔ جب بھی کوئی رو کر مجھے روتے ہوئے پا کر مجھ سے رونے کی وجہ پوچھتا تو میں کہتا "شعبدہ باز نے میری تعاویذ غائب کر دی ہے۔" میں اس مصیبت میں گرا ہوا تھا تو ایک آواز میرے کانوں میں پڑی "یہاں آؤ اور نظارہ کرو۔"

میں نے اپنے پیچھے دیکھا۔ ایک 'میرین' والے نے وہاں پر اپنا پڑاؤ جمایا ہوا تھا۔ میں نے درجنوں بچوں کو دیکھا جو میرین والے کی طرف بڑھ رہے تھے اور باری باری موکھے کے سامنے کھڑے ہو کر اندر جھانک رہے تھے اور وہ شخص ساتھ ساتھ تصاویر پر تبصرہ کرتا جا رہا تھا "آؤ بہادر بانکا دیکھو اور عورتوں میں سب زیادہ خوب صورت عورت زینت امان دیکھو" اپنے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے اور شعبدہ باز اور تعاویذ کو مکمل طور پر بھولتے ہوئے، میں نے شوق کے ساتھ ڈبے کی طرف دیکھا۔ میں اپنی خواہش پر قابو نہ پا سکا۔ میں نے پیاستر ادا کیا اور اس لڑکی سے آگے ہو کر موکھے

کے اندر جھانکنے لگا۔ وہ ایک دوسرے موڑ کے آگے کھڑی تھی۔ وہاں ہماری نظروں کے سامنے خوش رنگ تصویری کہانیاں تیر رہی تھیں۔ جب میرے ہوش و حواس بحال ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ میں پیاسا اور تھکن دونوں چیزیں کھو چکا ہوں اور شعد ما زنا کوئی چیز نہیں تھا۔ تاہم میں نے نقصان پر دھیان نہ دیا وہ اس لیے کہ میں تصاویر کی شان، محبت اور جرأت کے کارناموں سے مغلوب ہو چکا تھا۔ میں اپنی بھوک بھول گیا تھا اور گھر واپس پہنچنے پر جو کچھ میرے ساتھ ہونے والا تھا، اسے بھی بھول چکا تھا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹا اور میں نے قدیم دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔ جہاں کسی زمانے میں افسر مایات کا دفتر اور افسر اعلیٰ کا گھر ہوا کرتا تھا اور پھر میں جانتی آنکھوں سے چہرہ دیکھنے لگا۔ بہت دیر تک میں شان و شوکت، زینت ہمات اور طول بیانی کے خواب دیکھتا رہا۔ اس خواب میں اپنی حرکات و سکنات کے تقاضے سے میں اپنے فعلوں کو معافی دینے کے لیے اونچی آواز میں بولتا رہا۔ میں نے تصوراتی تیغ سے حملہ کرتے ہوئے کہا۔ "او طول بیانی، یہ لو سیدھا تمھارے دل میں۔"

"اور اس نے اپنے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھائی ہوئی زینت الہمات کو اوپر اٹھایا۔" ایک ملائم آواز پیچھے سے ابھری۔ میں نے اپنی دائیں طرف دیکھا یہ وہی لڑکی تھی جو اس تقریب پر اہتمام میں میرے قریب موجود رہی تھی۔ اس نے گندھ نیاس پہن رکھا تھا، اس کی کڑھائی رنگ دار تھیں۔ وہ اپنے بالوں کی ایک لٹ سے کھیل رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں سرخ اور سفید رنگ کی وہ مصاریاں تھیں، جنھیں "لوگیوں کی خاص پسند" کہا جاتا ہے اور جنھیں وہ اطمینان سے چوسے جا رہی تھی۔ ہماری نظریں آپس میں ملیں اور میرا دل جاتا رہا۔

"آؤ کہیں بیٹھتے ہیں اور سستاتے ہیں۔" میں نے اس سے کہا

اس نے میری تجویز پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا اور ہم پرانی دیوار کے دروازے سے نکل کر باہر آ گئے اور سیڑھی دار راستے کے ایک مقام پر جا بیٹھے۔ وہ سیڑھی دار راستہ اوپر کی طرف بڑھتا ہوا ایک ایسے پلیٹ فارم پر جا کر ختم ہوتا تھا، جس کے پیچھے سے بلند مکان اور مینار دیکھے جا سکتے تھے۔ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو دبایا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ کیا کہا جائے اس لیے خاموش بیٹھے رہے۔ میں ایسے احساسات کے تجربے سے گزر رہا تھا، جو نئے، عجیب اور مبہم تھے۔ اپنا چہرہ اس کے قریب کرتے ہوئے میں نے اس کے بالوں کی فطری خوشبو کو سونگھا جس میں مٹی کی مہک اور مصاریوں کی خوشبو میں ملی تھی، اس کی سانسوں کی خوشبو بھی

نازک تھی۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو چوما اور اپنے حلق کو نگلا، جس میں اسی "لڑکیوں کی خاص پسند" والی مٹھائیوں کی مٹھاس تحلیل ہو چکی تھی۔ میں نے اپنا بازو اس کے گرد حمائل کیا۔ اس کی خاموشی برقرار رہی اور میں اس کے گالوں اور لبوں کے بوسے لیتا رہا۔

جب میں نے اس کے ہونٹوں کو چوما تو یہ ذرا متحرک ہو گئے لیکن فوراً ہی یہ دوبارہ ان مٹھائیوں کو چوسنے میں لگ گئے۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں واپس جانا چاہیے تھا۔ میں نے بے قراری سے اس کا بازو تھام لیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں جا رہی ہوں۔" اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

"کہاں۔۔۔۔؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"دائی اُم علی کے ہاں۔" اور اس نے نیچے کی طرف، اس مکان کی جانب اشارہ کیا، جس کی نچلی منزل میں لوہار کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔

"کیوں؟"

"اسے کہنے کے لیے کہ وہ جلدی سے آئے۔"

"کیوں؟"

"میری والدہ گھر پر زور زور سے چلا رہی ہے۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں دائی اُم علی کے پاس جاؤں اور جلدی سے اسے اپنے ساتھ لے کر آؤں۔"

"کیا تم اس کے بعد واپس آؤ گی؟"

اس نے سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ اس نے جب اپنی والدہ کا حوالہ دیا تو اس نے مجھے میری ماں کی بھی یاد دلا دی۔ میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔ پرانے نیم تاریک راستے سے دیکھتے ہوئے، میں گھر کی طرف چل دیا۔ میں اونچی آواز میں رونے لگا۔ یہ ایک آزمودہ نسخہ تھا، جس سے میں اپنا دفاع کر سکتا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکے گی لیکن وہاں تو اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ "میری ماں کہاں چلی گئی؟ وہ کب لوٹے گی؟" میں خالی گھر میں بور ہونے لگا۔ مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے جیب سے ایک تھوڑی سی اپنی بچت کی رقم میں سے ایک پیسہ لیا اور فوراً لوہے کے پیچھے والے کی طرف چل پڑا۔ میں نے اسے دکان کے باہر ایک تنگ پر اپنے بازو سے چہرے کو ڈھانپ کر

سوئے ہوئے پیدا ہونیوالے بچے غائب تھے۔ تیل کی لمبی گردن والی بوتلیں واپس الماری میں رکھی ہوئی تھیں اور سنگِ مرمر سے بنے کاؤنٹر کے اوپر والی سطح کو دھو دیا گیا تھا۔

"جناب" میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر سرگوشی کی۔

مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ بس اس کے خراٹے ہی سنائی دے رہے تھے۔ میں نے اس کے کندھے چھوئے۔ اس نے چونک کر اپنا زاویہ بدلا اور اپنی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"جناب"

اس نے میری موجودگی محسوس کرتے ہوئے اور مجھے پہچانتے ہوئے نہایت کھردرے طریقے سے پوچھا

"کیا چاہتے ہو؟"

"ایک پیاسٹر کالومیا الکحل کے تیل کے ساتھ۔"

"ہوں۔"

"میرے پاس پیاسٹر بھی ہے اور تھائی بھی۔"

"لو کے تم پاگل ہو۔" وہ چیخا۔ دفع ہو جاؤ ورنہ میں مار مار کے تمھارا بھیجا نکال دوں گا۔" جب میں وہاں سے نکلا تو اس نے مجھے اتنے زور سے دھکا دیا کہ میں کمر کے بل نیچے گر گیا۔ میں خاصی تکلیف کے ساتھ اٹھا۔ میں اس چیخ کو روکنے کی کوشش کرنے لگا جس نے میرے ہونٹوں کو کاٹ دیا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں سے ایک میں پیاسٹر اور دوسرے میں تھائی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ واپس ہوتے ہوئے میں اپنی امید کو ختم ہوتے ہوئے محسوس کرنے لگا لیکن دیوانی اور ہمت کے تصور نے میرے عمل اقدام کو بدل کر رکھ دیا۔ پورے یقین کے ساتھ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور تھائی کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس پر پھینکا۔ یہ ہوا میں اڑتی ہوئی گئی اور اس کے سر سے ٹکرائی۔ اس دوران میں، میں جو تیزی سے بے پروا ہو کر وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا مجھے پورا یقین تھا کہ میں نے اسے مار دیا تھا جیسے کہ اس بانکے نے اس خون پیاسی کو مار دیا تھا۔ میں پرانی دیوار کے قریب پہنچنے تک بھاگتا رہا۔ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ میں نے اپنے پیچھے دیکھا کوئی میرا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ میں اپنی سانسیں بحال کرنے کے لیے رکا تب میں نے اپنے آپ سے پوچھا اب مجھے کیا کرنا چاہیے کیوں کہ اب تو میں نے دوسری تھائی بھی کھو دی تھی۔ کسی چیز نے مجھے روکا کہ میں فوری طور

پر سیدھا گھر نہ جاؤں اور پھر جلدی میں نے اپنے آپ کو تعلق کی ایک ایسی ہر کے پیر ڈھونڈ دیا جس نے میری خواہش کو مضبوط کر دیا۔ گھر واپس پر کم وبیش ایک ہفتہ دیر ہی منتظر تھی، اس لیے میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر کے لیے خود اس سے جان چھڑا ہی لینی چاہیے۔ میرے ہاتھ میں ایک پیسہ تو تھا ہی اس لیے مجھے گھر جانے سے پہلے اس سے کچھ نہ کچھ تو خوشی حاصل کر ہی لینی چاہیے تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہ سوچوں کہ میں نے کوئی خاص کام کیا ہی نہیں لیکن وہ ہاتھ کی صفائی دکھانے والا کہاں تھا۔ وہ سیر میں والا کدھر تھا۔ میں نے ہر طرف انھیں ڈھونڈا لیکن بے سود تھا۔

اس بے ثمر تلاش سے تھک کر میں اسی پرانے سیڑھی دار راستے کی طرف چل دیا، جہاں مجھے اس سے ملنا تھا۔ میں اس ملاقات کے متعلق سوچتے ہوئے اس کا انتظار کرنے بیٹھ گیا۔ میں نے مصنوعوں کی خوشبو سے معطر ایک اور بو سے کی آرزو کی۔ میں نے تسلیم کیا کہ اس چھوٹی سی لڑکی نے مجھے ایسے لمس سے آشنا کیا تھا، جس سے میں پہلے واقف نہ تھا۔ ایسے میں جب کہ میں انتظار کر رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا مجھے اپنے پیچھے سے ایک سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔ میں احتیاط سے سیڑھیوں پر چڑھا اور اخلاق کی چوٹ سے پرسی کی نظر میں آئے بغیر یہ دیکھنے کے لیے کہ میرے پیچھے کیا ہو رہا ہے، میں منہ کے بل سیدھا لیٹ گیا۔ میں نے ایک بہت اونچی دیوار کے نیچے سے میں کچھ مناظر دیکھے جو مایوسی ذہنی اور افسردگی کے گہرے دقیانوسی میں سے تھے۔ سیڑھیوں کے بالکل نیچے ایک مرد اور عورت بیٹھے ہوئے تھے اور ان سرگوشی کا باعث وہی تھے۔ دوسرا ایک آوارہ شخص کی طرح تھا اور عورت ان خاندانوں جیسی تھی جو کہ بھیڑوں کی رکھوالی کرتے ہیں۔ میرے اندر سے برآمد ہوتی آواز نے مجھ سے کہا کہ ان کی ملاقات بھی بالکل ویسی ہے جیسی کہ میں خود کر چکا تھا۔ ان کی آنکھوں اور ہونٹوں سے یہ سب کچھ آشکار ہو رہا تھا لیکن ان کی اس غیر معمولی سرگرمی میں ایک تیز ان کی مہارت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میرا ان کو یوں چھپ کر دیکھنا، اصل میں تجسس، تیزابی، خوشی اور بہت حد تک میری بے تابی کی وجہ سے تھا۔ آخر کار وہ ایک دوسرے کے بہت قریب بیٹھ گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق تھے تھوڑی دیر بعد وہ شخص بولا

"روپے"

"تم کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔" وہ شک مزاجی سے بولی۔

زمین پر تھوکتے ہوئے وہ بولا "تم پاگل ہو۔"

"تم ایک چور ہو۔"

مرد نے اپنے ہاتھ کی پشت سے عورت کو ایک بھاری تھپڑ جڑ دیا۔ عورت نے جواب میں مٹھی بھر مٹی مرد کے چہرے پر پھینکی۔ مرد نے عورت پر جھپٹتے ہوئے اس کے نرخرے کو اپنی انگلیوں سے دبوچ لیا۔ عورت نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ مرد کی گرفت سے نکلنے کی بے سود کوشش کی۔ اس کی آواز میں ناکامی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے حلقوں سے باہر ابل پڑیں جب کہ اس کے پاؤں ہوا میں بلند ہو گئے۔ ایک گونگی دہشت میں ڈوبے ہوئے، میں نے اس منظر کو دیکھا۔ تب میں نے عورت کی ناک سے خون کی ایک دھار ایک دھار کو نکلتے دیکھا۔ ایک چیخ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص پکڑا جاتا، میں ایک ہی چھلانگ میں نیچے اترتے ہوئے پیچھے کی طرف رینگ گیا۔ جہاں تک میری ٹانگیں مجھے لے جا سکتی تھیں، میں نے ایک پاگل شخص کی طرح دوڑ لگا دی۔ جب تک میری سانس پھول گئی میں مسلسل دوڑتا رہا۔ سانس بحال کرنے کے لیے جب میں رکا تو میں قطعی طور پر نہیں جانتا تھا کہ اس وقت میں کہاں ہوں لیکن جب میں ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک چوراہے کے درمیان تنہا کھڑا پایا۔ آج سے پہلے میرے قدم وہاں کبھی نہیں پہنچے تھے اور مجھے بالکل نہیں سوجھ رہا تھا کہ میں اپنے گھر سے کتنی دوری پر اور کدھر موجود ہوں۔ دونوں اطراف میں اندھے گدڑ بیٹھے ہوئے تھے اور ہر طرف سے لوگ گزر رہے تھے جو ایک دوسرے سے بے تعلق لگ رہے تھے۔ ایک خوف کے تحت میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا راستہ بھول چکا ہوں اور اس سے پہلے کہ میں اپنے گھر کی طرف جانے والا راستہ ڈھونڈ سکوں، ان گنت مشکلات میرے انتظار میں تھیں۔ کیا مجھے کسی راہ گیر کی مدد حاصل کرنی چاہیے تاکہ وہ میری رہنمائی کر سکے۔ لیکن اگر مجھے لوہا بیچنے والے شخص جیسا کوئی شخص مل گیا یا اس ویرانے والے آوارہ جیسا کوئی بندہ مل گیا تو کیا ہوگا؟ کیا ایسا کوئی شخص ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ماں کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھوں اس کی طرف دیوانہ وار بڑھ سکوں؟ کیا مجھے خود سے اپنا راستہ تلاش کرنا چاہیے تاکہ یوں ہی ماردیوں مارتے ہوئے مجھے کوئی ایسی مانوس حد بندی مل جائے جو صحیح راستے کی نشاندہی میں میری رہنما ثابت ہو سکے۔ میں نے خود سے کہا مجھے پرعزم رہنا چاہیے اور جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ دن گزرتا جا رہا تھا اور پراسرار اندھیرا چھانے والا تھا۔

☆☆☆☆

عادا البوریمی

دروازہ

سوئی سوئی آنکھوں والا چھوٹے قد کا گھر میں نوجوانی کے زمانے میں کسی قدر موٹاپے کی طرف مائل میرا دوست مادو، جس کی چونتیس سالہ زندگی میں موٹی بلچل نہ تھی اور جس کے گرد خوشی اور قہقہے بکھرے پڑے تھے۔ میرے خیال میں دنیا کا سب سے پرسکون شخص تھا۔ اس نے سکون، خاموشی اور تنہائی سے اپنا ناطہ جوڑ رکھا تھا۔ اس نے یہ رویہ اپنی مسلسل بیماری سے اختیار کیا تھا۔ وہ ہجوم کے شور شرابے سے گھبراتا تھا۔ تنہائی ہی اس کی ساتھی تھی۔

خدا نے اس کی خواہشات پوری کر دی تھیں۔ پچھلے دس سالوں سے ایک تجارتی ادارے میں بطور کاتب کام کرتے ہوئے اس کی ماہی پوزیشن حاصل ہو گئی۔ اس دوران میں اس نے شادی کی اور ایک ایسا گھر بھی اس نے بنایا جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔ وہ گھر جو دراصل پانی پر بنایا گیا تھا۔ اور جس کا پچھلا حصہ ایک خاص تار میں پناہ ہوا تھا۔ عام گھروں سے ذرا ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے ایک راستہ مشرق کی طرف سے تھا۔ جو پوپلر کے درختوں کے گھنے پن کے درمیان سے ہو کر جاتا تھا اور دوسرا شمال کی طرف سے تھا، جو پہلے راستے سے ملتا ہوا قریبی باغ میں گم ہو جاتا تھا۔

مکان کی پچھلی طرف سے ڈھلے کا راستہ شمالی راستے کی جانب جاتا تھا۔ وہ ہر شام کو کام سے فارغ ہونے کے بعد مکان کے پچھواڑے کے ڈھلے میں آرام کرسی میں نیم دراز ہو کر اپنے ہاتھوں میں کتاب پکڑے مطالعے سے لطف اندوز ہونا پسند کرتا تھا۔

میں ہر دوسرے دن اس سے ملنے آتا تھا۔ وہ مجھے اور اپنی بیوی کو ایک اور کرسی لانے کو کہتا۔ اور پھر رسمی خیریت پوچھنے کے بعد میں اس کے قریب بیٹھ جاتا اور پھر سورج غروب ہونے تک ہم دونوں بیٹھے خاموشی میں ڈوبے رہتے۔

رہائش کی اس ایک سادگی اور سکون کو، جس میں کبھی کبھی درختوں پر چہچہانے والے پرندوں کی آواز در آتی تھی، کسی شخص نے ایک دن اس گھر سے ہمیشہ کے لیے تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا تھا

اس واقعے سے چند دن پہلے اماوو کی بیوی ایک مہینے کے لیے ایک قریبی گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے پاس چلی گئی تھی۔ وہ اکیلا تھا اور اپنی زندگی کی تنہائیوں کی خوشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چوں کہ میں اس کے مزاج سے واقف تھا اس لیے میں ایک ہفتے تک اس سے دور رہا۔ پھر ایک شام کو کھانے کے وقت سے ذرا پہلے وہ اپنے، تھوڑے میں ایک بیگ پکڑے ہوئے انداز میں مجھ سے ملنے آیا۔

تین دن پہلے حالات کے یہ بات بہت عجیب محسوس ہوئی۔ اس نے ایک فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا جس میں ہوسیس وی فیور مرکزی کردار ادا کر رہا تھا اور اس خیال سے کہ اس طرح بہت سے لوگوں سے سامنا نہ ہو گا وہ اس شام گھر سے نکلتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ تفریح کی خواہش بہرحال پہلی بار اس پر حاوی ہو گئی۔

اس نے جلدی جلدی نہانے کے بعد اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا آملیٹ تیزی سے نگلا اور پھر لباس بدلنے کے بعد اس نے شو شروع ہونے کے صرف چند منٹ پیشتر اپنے آپ کو سینما ہال میں پایا۔ اس شام میں بھی بہت سے فلم بینوں کے درمیان موجود تھا اور یہ اس نے فلم دیکھنے کے بعد جانا۔ ہر کوئی اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے قہقہے لگا رہا تھا اور دور سے، میں اماوو کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ قطعی خوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کئی بار یہ محسوس ہوا کہ وہ ابھی سینما ہال سے اٹھ بھاگے گا۔ اداکاروں کے فن سے متاثر ہو کر وہ فلم کے اختتام تک بیٹھا رہا۔ اور رات گئے گھر لوٹا۔

وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں جلتی ہوئی روشنی میں نہا گیا، جس کو وہ جلتا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو وہاں بھی روشنی تھی۔ لیکن جس چیز نے اس کے پاؤں جکڑ لیے تھے، وہ یہ تھی کہ دروازہ بالکل کھلا تھا۔

اور یہ بات یقینی تھی کہ وہ باہر جاتے ہوئے گھر کا دروازہ بند کر کے گیا تھا۔۔۔۔ تو پھر یہ دروازہ کس نے کھولا تھا؟ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ شاید یہ میں تھا، جو اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن یہ کس طرح ممکن تھا جب کہ ہم دونوں نے شو ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے کو الوداع کہا تھا؟ اور اگر یہ میں ہی تھا تو میں کیسے داخل ہوا جب کہ میرے پاس اس گھر کی دوسری چابی ہی نہیں تھی؟ کیا یہ کوئی دھوکہ ہے؟ لیکن نہیں۔ وہ تو جیسوں سے ملتا ہی نہیں۔ شاید یوں ہوا تھا کہ وہ چابی دروازے میں ہی بھول گیا تھا۔ لیکن پھر وہ اپنی قمیص کی ایک جیب کے کونے میں چابی کی موجودگی کو کس طرح محسوس کر سکتا ہے اگر یہ یہاں نہ ہوتی؟ پھر اسے دروازے کے چابی کے سوراخ میں ہونا چاہیے تھی؟ اس بات کا اسے پکا یقین

تھا کہ اس نے دروازہ روبند کیا تھا۔ ہاں اسے یقین تھا۔ اسی لمحے اس نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا

"کیا کوئی اندر ہے؟" لیکن جواب ندارد۔ اندر کوئی ہے؟" وہ دوبارہ بول اٹھا۔۔۔۔ وہی خاموشی۔ یہ خاموشی ناقابل برداشت حد تک پراسرار طریقے سے اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔

وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے بھاگ جانا چاہا مگر پھر اس نے اس اقدام کو بے وقوفی سمجھا۔ وہ پھر آگے بڑھا اور اس نے اس دروازے کی طرف دیکھا، جس نے اب اس کے اندر ایک خوف بھر دیا تھا۔ رات اب بھیگ چکی تھی۔ چار چوفیرے خنک تھی مگر اس نے گھر میں داخل ہونے کی جرات نہ کی۔ وہ مسئلہ نہیں تھا ورنہ ہی ہے وہ تنہا ہو کر سوچ رہا تھا کہ وہ جنگل کی صورت میں اپنا بچاؤ کیسے کرے گا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی تنہا ہونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ضرورت پڑنے پر ایک آدمی کتنا غیر محفوظ ہوتا ہے۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ ایک آدمی کے پاس صرف ایک ہی زندگی ہوتی ہے۔

بعض اوقات آئندہ زندہ رہنے کے لیے دوسرا لمحہ موجود ہی نہیں ہوتا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے کسی دوسری جگہ پر یہ رات گزارنے کے بارے میں سوچا۔

لیکن اگر یہ بات پھیل گئی تو اسے بزدل سمجھا جائے گا۔ کہیں بھاگ جانے سے مر جانا اچھا ہے۔ مستحکم ارادے کے ساتھ اس نے قدم دروازے کی طرف بڑھائے روشنی میں نہائی اس کو عبور کیا۔ دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر اس نے دروازے کو پورا کھول دیا اور پھر وہ دہلیز کے درمیان کھڑا پورے بدن سے کانپ رہا تھا۔

وہ ایک تحیر میں کھڑا ہوا تھا۔ کھانے کی میز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ کچن کے آخری سرے پر بالکل دیوار کے ساتھ اس پر وہ پلیٹ ابھی تک وہیں پڑی تھی، جس میں اس نے آملیٹ کھایا تھا۔ اس کے قریب ہی خوراک کے ایک خالی گلاس اور ایک ڈش کا تھیلا بھی پڑا ہوا تھا۔ اس کی دائیں والی چار کرسیاں بھی وہیں گہرے سبز قالین پر پڑی تھیں اور اپنی جگہ سے ہلی تک نہ تھیں۔ لیکن مہاگنی لکڑی سے بنی الماری یہاں اسے ضرور چھوا گیا تھا۔ یہ کھلی پڑی تھی اور وہ جس نے کچن کے برتنوں وغیرہ کے علاوہ یہاں کچھ اور تلاش کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے اس کے پٹ یوں ہی چھوڑ دیے تھے۔ پچھلی طرف موجود دو شاخوں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ وہ وہاں کے قریب آیا اور ایک چھوٹی سی لوہے کی سلاخ کے پاس ایک گیلا کپڑا پڑا دیکھا۔ یہ چیزیں یہاں کس نے ڈالی ہیں؟ اس نے ایک لمحے کے

لیے سوچا اور محسوس کیا کہ شاید سلاخ کو دروازے کا تالا توڑنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا لیکن یہ کپڑا؟

اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ کوئی گھر میں ضرور داخل ہوا تھا لیکن کون؟ اور اگر وہ اس وقت گھر ہی میں کہیں کسی جگہ چھپا ہوا ہو تو ... وہ اس خیال ہی سے کانپ گیا کہ کوئی اس وقت بھی اسے دیکھ رہا ہے اور اس پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس نے باہر چلے جانے کے بارے میں سوچا لیکن وہ یہاں اندر رہا۔ وہ اس بے بسی کی حالت میں کسی کو مدد کے لیے پکارنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

وہ دبے پاؤں اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا جو اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس نے آہستگی سے کھول دیا۔ اس نے یہ محسوس کرنے کے لیے کہ کوئی اور تو اندر موجود نہیں پہلے اس تھوڑے سے کھلے ہوئے دروازے میں اپنا ہاتھ اندر کر دیا۔ صندوق، بیگ اور الماری ساری چیزیں وہیں تھیں۔ جہاں وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے باتھ روم اور بیڈ روم میں جھانکنے کی ضرورت اس لیے محسوس نہ کی کہ اس کے نزدیک وہاں کوئی قابل ذکر چیز موجود نہیں تھی۔

وہ آرام کرسی پر گر سا گیا۔ کسی نے اس کے گھر میں نقب ضرور لگائی تھی اور اب اس کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا۔ اجنبی یقیناً چور نہیں تھا۔ وہ یہاں سے ہر چیز اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔ یہاں کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں تھا۔ تو پھر ... یہ وہ اسے جان سے مار دینے کے لیے آیا تھا؟ ہاں ایسا ہونا ممکن بھی تو نہیں تھا ...؟ لوگوں کی نظروں میں ایک اداکار بہت اچھی مالی حیثیت کا مالک ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی حاسد شخص اس کے وجود کو ختم کرنے اور اس کی جائیداد کو ہتھیانے کے لیے ایسا اقدام کر سکتا تھا؟

اس نے اپنے قریب پڑے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو ... پولیس اسٹیشن؟ مہربانی کر کے مجھے پولیس چیف مسٹر ڈوکی سے ملوائیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

چند لمحوں بعد اسے بتایا گیا کہ جناب پولیس چیف مسٹر ڈوکی سے بات کیجیے؟

"مسٹر کمشنر ... میں اماڈو بول رہا ہوں۔ مہربانی کر کے فوراً میرے گھر تشریف لائیے۔ کوئی یہاں میری جان کے درپے ہے۔" بڑے کلاک کے مطابق اس وقت رات کے دو بجے تھے

پانچ منٹ بعد پولیس چیف اپنے ایک ماتحت کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ وہ اماڈو کے سامنے بیٹھ گیا اور فوراً ہی گفتگو شروع ہو گئی۔ ڈوکی الف سے ی تک ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ

چھوٹی چھوٹی تحریریں کوئی ظاہر نہیں کرتا چاہتا تھا کہ اماوا نے کسی مدد کے بغیر یہاں آنے کی دوربیہ
مکان کیوں ہو۔ اس کے پاس کتنی چابیاں ہیں؟ اس کی بیوی کہاں گئی ہے اور کتنے عرصے کے لیے گئی
ہے؟ کیا اس کے پاس کوئی نوکر بھی ہے؟ کوئی محافظ؟ کون کون سی چیزیں چرائی گئی تھیں؟ کیا اس نے
باغ میں قدموں کے کوئی نشان دیکھے ہیں؟ اسے ختم کرنے کے کون کون سے طریقے ہو سکتے تھے، دوسرے جو سوالات
اس سے پوچھے گئے ان کی نوعیت یہ تھی۔ میں آپ پر چھوڑتا ہوں جب کہ جوابات اس سے بالکل
مختلف نہیں جو آپ پہلے ہی جانتے ہیں۔ اماوا نے سب کچھ بتا دیا اور یہ راز کی بات نہ ہوتی
اگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اماوا کو اس بات کا یقین تھا کہ ملاح کو واقعی دروازہ کھولنے کے لیے استعمال
کیا گیا تھا اور کپڑے کو اپنی انگلیوں کے نشانات مٹانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اور وہ پراسرار شخص جو
یہاں مکان میں داخل ہوا تھا۔ اس کی نیت یہاں سے کچھ چرانے کی نہیں تھی کہ کچھ اور تھی۔

اب چوں کہ رات کافی دیر ہو گئی تھی اس لیے انسپکٹر وہاں سے چلا آیا مگر پولیس مین اماوا کے پاس
وہیں چھوڑ گیا۔ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا وہ "شریف آدمی" پھر چلا آئے۔

اگلے دن اور رات پولیس مین وہاں اس لیے موجود رہا تھا کہ اس طرح وہ اس نقب والے پر
ہاتھ ڈال سکے تو اماوا نے بھی اس حالت میں یہ وقت گزارا جیسے اس کی زندگی کے دن ختم ہونے والے
ہوں۔ اس دوران کے مختلف حصوں میں نیند لیتے ہوئے اماوا نے خوابوں میں ایک بے قد کے آدمی کو
اپنے سر پر ایک تھوڑا تانے ہوئے پایا۔ وہ اپنے اس ڈراؤنے خواب کے دوران میں ہمیشہ اس وقت ڈر کر
جاگ گیا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اب وہ خوفناک ہتھیار اس کی گردن پر گرنے والا ہے۔

تیسرے دن صبح تک جب کوئی ہونی بات ظہور پذیر نہ ہوئی تو پولیس چیف نے اپنے آدمی کو واپس
بلا لیا اور اماوا پھر اکیلا رہ گیا۔ سہ پہر کے بعد وہ اسی پر اماوا اپنے گھر کے باغ میں بڑی دیر تک ٹہلتا رہا
اس کے چہرے پر ہریالی سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بار بار جھکا یوکلپٹس کے درختوں کے اس جھنڈ کی طرف
دیکھتا رہا، جو ایک حقیقی جنگل کی طرح لگ رہا تھا۔

یہ جھنڈ ہاں واقعی اس نے اس کے بارے میں پہلے کیوں نہیں سوچا؟ وہ ادھر
ہی سے آیا ہوگا۔ وہ یقیناً ان بھتوں میں سے ایک تھا جنھوں نے اس جھنڈ میں رہائش اختیار کر رکھی
تھی اور اس رات اس سے ملنے آیا ہوگا۔ وہ کا پے آیا۔ بھتوں کی بستی کے درمیان میں رہنے کے تصور
نے اس کا خون خشک کر دیا تھا۔

وہ ایک طرف ہوا۔ باڑ پیچھے ہٹائی۔ اور پھر گھر میں داخل ہو گیا ایک لمحے کے بعد وہ اپنے ہاتھ میں ایک بیگ پکڑے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر آیا اور شہر کی طرف چل پڑا جہاں کسی مینار کے اوپر سے کوئی موذن دن کی چوتھی یعنی مغرب کی اذان دے رہا تھا۔ اور اس طرح اس نے جب اپنی تنہائی کو خیرباد کہا تو اس لمحے اس کے تمام خوف و خطرات بھی ہوا ہو گئے۔

☆☆☆☆

چنوا اچیبے

فوق مافوق

جوئیس آئی بیٹھا اپنے باپ رامی کو دیکھ رہا تھا۔ موٹا چیف ٹرک، جو اس وقت اس کی میز کے پاس بیٹھ کر نے لے رہا تھا۔ گیٹ کیپر، جس نے ہزاروں میں رہتی تھی، اپنی جگہ پر سو رہا تھا لیکن آپ اس پر کوئی ترس نہیں کھا سکتے کیونکہ یہ ایک مفتے سے کسی ملاقاتی کا گزر اس دروازے سے نہیں ہوا تھا۔ وزن کرنے والی ریوالنگ مشین پر ایک خالی ٹوکری پڑی تھی۔ مشین کے گرد چند پامسٹری پوسٹر اداسی میں لپٹے ہوئے پڑے تھے۔ وہاں صرف مکھیوں کی حکومت تھی۔

جوئیس اس کھڑکی کی طرف آیا، جو ماہیگر دریا کے کنارے پر موجود بڑی مارکیٹ کی نگرانی کرتی نظر آتی تھی۔ اگرچہ یہ قصبہ جو آبادی کی بڑھوتری اور پھیلاؤ کی وجہ سے ایک بڑی پامسٹل بندرگاہ میں تبدیل ہوتے ہوئے دریا کے آخر تک بڑھ آیا تھا، ابھی تک اس کی یہ مارکیٹ کھوہی ہوئی تھی، تاہم اپنی حد سے تجاوز کرنے کے باوجود یہ اپنے اصل مکینوں کے موقع پر اب بھی مصروف ترین ہی تھی کیونکہ وہ دیوی جو قدیم زمانے سے اس کی میزبان تھی، وہ اپنے خاص دن پر اب بھی اس پر سحر طاری کیے رکھتی تھی تاکہ لوگ اس کے لوبھ میں پھنستے پھولتے رہیں۔

ایک کہاوت کے مطابق وہ مرغے کی بانگ سے پہلے ہی مارکیٹ کے مرکز میں ایک بوڑھی عورت کے روپ میں ظاہر ہوتی تھی اور کافی فاصلوں پر رہنے والے مردوں اور عورتوں کو مارکیٹ میں کھینچ لانے کے لیے اپنے جادوئی پنکھے کو اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے زمین کے چاروں اطراف میں ہلاتی تھی۔ وہ لوگ اپنی زمینوں کی پیداوار، پامسٹل اور مغربی علاقے کی اشیاء، بیساکھیاں، ٹوکریاں اور مٹی کے برتن اپنے ساتھ لاتے تھے اور اپنے گھروں میں بہت سے رنگین کپڑے، دھواں رنگ مچھلیاں، لوہے کے برتن اور چٹائیاں لے جاتے تھے۔ یہ جنگلوں میں رہنے والے لوگ تھے۔ دوسری آدھی دنیا جو عظیم دریاؤں کے کناروں پر آباد تھی وہ بھی ڈونگا کشتی میں آتی تھی اور اپنے ساتھ دھاگا اور مچھلی لاتی تھی۔ بعض اوقات یہ ایک بڑی ڈونگا کشتی ہوتی تھی، جس میں ایک درجن سے زیادہ لوگ

ہوتے تھے اور بعض اوقات تیز بہاؤ والے انیم بارا کے ذریعے ایک چھوٹی کشتی میں اپنی بیوی کے ساتھ آنے والا کوئی کیا مچھیرا ہوتا تھا۔ وہ اپنی ڈونگا کشتی کنارے پر لنگر انداز کرتے ہوئے، خاص سودے بازی کے بعد اپنی مچھلی بیچتے۔ تب ان کی عورت دریا کے ڈھلوانی کنارے سے چل کر تیل اور نمک خریدنے کے لیے مارکیٹ کے وسط میں چلی آتی اور اگر اس کا مال بہت اچھا بک گیا ہوتا تو اب وہ بہر حال تھوڑا سا کپڑا بھی لے لیتی اور وہ گھر پر موجود اپنے بچوں کے لیے چیں یک اور مانی مانی خریدتی جو کار عورتوں نے تیار کیے ہوتے تھے۔ شام ہونے پر وہ دوبارہ اپنے پتوار پکڑتے اور غروب آفتاب کی روشنی میں ٹمٹماتے پانی میں کشتی کھیتے تھے اور ان کی ڈونگا کشتی دور جاتی ہوئی ہچکولے کھاتی ہوئی پانی کی سطح پر ایک کالے چاند جیسی شکل اختیار کر جاتی اور اس میں سوار وہ کالے جسم آگے جھکے ہوتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تب جنگل کے لوگوں کے لیے جو اموروکو کہلاتے تھے اموروان کے ملنے کی جگہ ہوتی اور وہ اجنبی دیہاتی لوگ نہیں یہ سو لوگ اولو کہتے تھے ان کے آگے دنیا لامتناہی انداز سے پھیلی ہوئی تھی۔

جو شخص آپی اموروکا مقامی نہیں تھا وہ دوسرے ان گنت لوگوں کی طرح ملک کے دوسرے چھاؤنیوں سے آیا ہوا تھا۔ وہ ایک مشن سکول سے اچھے درجے امتحان پاس کرنے کے بعد اس طاقتور یورپی ٹریڈنگ کمپنی کے دفاتر میں کلرک کے طور پر کام کرنے کے لیے اموروآیا تھا جو پامگری وہ اپنی طے کردہ قیمت پر خریدتی تھی اور پھر اور اجناس کے بدلے اس طرح اپنی من مرضی کی قیمت پر بیچتی تھی۔ یہ دفاتر اس مشہور مارکیٹ کے پہلو میں واقع تھے اس لیے جو شخص کو اپنے پہلے دو تین ہفتوں میں اس کے خاص پیچ و تاب کھاتی جھنجھناہٹ میں گھرے ہوئے ماحول میں اپنے کام کو سیکھنا تھا۔ بعض اوقات جب چیف کلرک موجود نہ ہوتا تو وہ کھڑکی کی طرف آ جاتا اور جھک کر اس سرگرمی کو دیکھنے لگتا۔ وہ سوچتا، بہت سے لوگ کل یہاں موجود نہیں تھے پھر بھی مارکیٹ بھری ہوئی لگتی تھی۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو کہ اس طرح اس بہاؤ میں اس کو سر پر بھرنے کے لیے بھی ادھر آنے والے تھے۔ بے شک ایک کہاوت کے مطابق وہ سارے لوگ جو یہاں ادھر اس عظیم مارکیٹ میں آتے تھے اپنا حقیقی وجود نہیں رکھتے تھے، بیوٹ کی ماں نے ایسا کہا تھا۔ خوب صورت عورتوں میں سے چند ایک ہجوم میں سے اپنا راستہ بناتی ہوئی تھیں، وہ میری اور تمھاری طرح کے لوگ نہیں تھیں لیکن ہاں قیمتی وہ لوگ ضرور تھیں جو کہ دریائی گھاٹیوں کے قریب موجود بستی میں رہتے تھے۔ اس نے کہا کہ ہمیشہ ایسا ہو سکتے ہو کیوں کہ وہ ایسی خوب صورتی کے حوالے سے خوب صورت تھیں جو بے عیب بھی ہے اور بے پروا بھی ہے۔ تم اپنی

آنکھ کے پچھلے حصے سے بھی کسی عورت کی جھلک دیکھ سکتے ہو، پھر تم پلک جھپکتے ہوئے زیادہ مناسب طریقے سے بھی اسے دیکھ سکتے ہو لیکن وہ تو اس سے پہلے ہی ہجوم میں گم ہو چکی ہوگی

جولیس اس وقت کھڑکی کے قریب کھڑا خاموش اور خالی مارکیٹ کی طرف دیکھتا ہوا ایسی ہی چیزوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کس کو یقین تھا کہ ایسی پرشور مارکیٹ کبھی یوں ٹھنڈی بھی پڑ سکتی تھی؟ لیکن یہی طاقت صرف ایک بچے کے پاس تھی جو بچپن کی طاقت کا مجسمہ تھا۔ صرف وہی تھا، جو لوگوں کو یہاں سے دھکیل کر باہر کر سکتا تھا اور اس مارکیٹ کو مکھیوں کے سپرد کر سکتا تھا۔

جب اموروا ابھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا تب ایک عمر رسیدہ شخص ہوا کرتا تھا جو ہفتے دو دن کے موقع پر مارکیٹ کے چبوترے کی صفائی کیا کرتا تھا لیکن ترقی نے اسے ایک غیر مانوس زمین اور لوگوں کے ہجوم سے بھری چت پڑی ہوئی ایک گندی مصروف ترین سڑک میں تبدیل کر دیا تھا جو اب زمین کے بیٹوں سے کہیں زیادہ لاتعداد اجنبیوں سے بھری پڑی تھی اور زمین کے بیٹے جو سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اپنی عبادت سے مجموعی طور پر انحراف کرتے ہوئے اپنے سروں کو ہلاتے جائیں۔ لیکن بے شک انھوں نے (اور اس کے لیے اس پر کوئی الزام دھرے گا) اپنی بستی کے پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کی دعا ضرور کی تھی اور اس نے ترقی کر لی تھی۔ لیکن ایک چھوٹی ترقی ہوتی ہے اور ایک بڑی ترقی ہوتی ہے۔ صرف شب و روز اسے ہی تو مدغم نہیں کر سکتی۔ یہ ایک گندی بیماری کی طرح سے بھی ہو سکتی ہے جو اس میں مبتلا شخص کو گھسیٹ کر لے جا سکتی ہے قبل کہ وہ ابھی مکمل طور پر مرا ہوا بھی نہ ہو۔

جو جنگلی اموروا میں در آئے تھے وہ یہاں کسی قسم کے فراخ منفعت کی تلاش میں جو کہ ملکوں کے اپنے گاؤں میں (جو کہ ان کا گھر تھا) میں بھی موجود تھے نہیں آئے تھے بل کہ وہ یہاں دولت کے حصول اور تجارت کی غرض سے آئے تھے کیوں کہ یہ کوئی اطمینان بخش بات نہ تھی اس لیے اموروا کی جے نوجوان بیٹے یہاں جو سطحوں اور درجوں سے ترغیب پاتے تھے ان کا سوکھا ان سے انھیں سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے پہلے کے سارے سبق بھلا کر ان سے صرف اپنی رقابت کو نبھا رہے تھے

تب بستی کی یہی حالت تھی جب تک پاؤ اسے دیکھنے اور یہاں کے رہنے والوں سے جو رسمی دیوتاؤں کے مقروض و ممنون تھے قربانی کا مطالبہ کرنے آیا تھا، وہ یہاں کے لوگوں کے اوپر چھائی ہوئی بے دہشت کے علم کے بھروسے پر یہاں آیا تھا۔ وہ جری کا دیوتا تھا اور شکی بھکاری تھا، تھوں کے، ان کو منھیں، اس نے مار تھا کوئی تکلیف نہیں دی تھی کیوں کہ وہ مارے نہیں گئے تھے بل کہ وہ تو معزز

بتا دیے گئے تھے اسی لیے کسی نے ان کے لیے رونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس نے دیہات کے درمیان اور پڑوسیوں کے آپس میں آنے جانے کا خاتمہ کر دیا۔ کسی نے کہا ''ایک پاگل اس گاؤں میں موجود ہے۔'' اور فوری طور پر اس کا اپنے پڑوسیوں سے قطع تعلق ہو گیا۔ جوئیس غمگین اور متفکر تھا کیوں کہ ہیوٹ یعنی وہ لڑکی جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا، اسے اس نے تقریباً ایک ہفتے سے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اسے بڑی سادگی کے ساتھ بتایا تھا کہ اسے ان لوگوں سے ملنے ابھی نہیں جانا چاہیے تاکہ اس کی بیوہ کی طاقت کے ذریعے یہ پتہ نہ ہو جائے (اس ایک نومقتدر پادری صاحب کی تھی اور وہ واحد وجہ، جس کی بنا پر اس نے اپنی کلوٹی بیٹی کو جوئیس سے منسوب ہونے کی اجازت دی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ ایم ایس چرچ کے گانے والے طائفے میں شامل تھا)

''تمھیں خود کو اپنے اندر تک محدود رکھنا چاہیے۔'' اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا کیوں کہ ایک پادری نے شور اور ہجوم کی ممانعت کرتا ہے۔ تمھیں نہیں معلوم کہ باہر تمھاری کس سے ملاقات ہو جائے۔ ''خاص دنوں کو معلوم ہوتا ہے۔'' اس نے اپنی آواز اور دھیمی کر لی اور اس مکان کی طرف پراسرار انداز میں اشارہ کیا جو سڑک کی پرلی طرف واقع تھا اور جس کا دروازہ تازہ کیلوں سے بند کر دیا گیا تھا۔

''اس نے پہلے ہی اس میں سے ایک کو بچایا ہوا ہے اور جو باقی کے تھے، وہ آج ایک بڑی خلوتی لاری میں یہاں سے کوچ کر گئے تھے۔''

ہیوٹ نے جوئیس کے راستے کو جوئیس کے ساتھ طے کیا اور رک گئی تو وہ بھی رک گیا۔ لگتا تھا کہ ان کے پاس ایک دوسرے کو کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ تبھی وہ پیش کر رہے تھے، تب لڑکی نے صدا حافظ کہا اور اس نے بھی صدا حافظ کہہ دیا اور ایک عجیب بات تھی کہ انھوں نے آپس میں ہاتھ ملائے جیسے رات بھر کے لیے ان کا جدا ہونا کوئی نیا اور سنگین مسئلہ تھا۔

وہ سیدھا گھر کی طرف نہیں گیا کیوں کہ وہ نہایت مایوسانہ انداز میں اس عجیب جدائی کو بالکل اکیلے جھیلنا چاہتا تھا۔ بچوں کو وہ پڑھا رہی تھی، اس لیے وہ اس بات سے خوفزدہ نہیں تھا کہ کوئی اس سے راستے میں ملنے والا ہو سکتا تھا۔ وہ دریا کے کنارے تک چلا گیا اور وہ وہاں اوپر سے نیچے تک پھرتا رہا۔ اسے یہاں آنے میں کافی دیر ہو گئی تھی کیوں کہ جب تک اس کا گھڑی کا گھنٹہ بجا اس وقت تک وہ وہیں تھا۔ وہ فوراً ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ چل بھی رہا تھا اور قدرے بھاگ

بھی رہا تھا کیوں کہ اس وقت وہ سب تو ہم پرستی کا معاملہ نہیں تھا بل کہ یہ حقیقی تھے، وہ اپنی بدمستیوں کے لیے رات کا چناؤ کرتے تھے کیوں کہ چمگادڑوں کی طرح ان کی بدصورتی بھی عظیم تر تھی۔

جلدی میں اس کا پاؤں کسی چیز پر پڑا جو ملبے سے مانع دھار کے کے ساتھ اس کے پاؤں کے نیچے ٹوٹ گئی۔ وہ رکا اور اس نے نیچے جھک کر دست پاتھ پر دیکھا۔ ابھی تک چاند نمودار نہیں ہوا تھا لیکن آسمان پر ایک مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے ملبے کے اوپر سے گزرا تھا جو قربانی کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ کوئی ایسا شخص جسے بدقسمتی نے آگھیرا تھا، اس نے شام کے وقت اسے چوک میں بھینٹ کے طور پر رکھا تھا اور اس کے اوپر اس کا پاؤں آ گیا تھا۔ وہاں پر اس کے اردگرد وہی معمولی کم تر ناز کے پودے تھے لیکن جوئیس نے اسے ایک مختلف انداز میں ایسے گھر کے طور پر دیکھا، جہاں وہ ڈراؤنا آرٹسٹ اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس نے ریتیلے راستے پر اپنے جوتے کے تلے رگڑ صاف کیے اور اپنے ذہن میں ایک اور طرح کی دھندلی سی فکر کو لیے تیزی سے آگے بڑھنے لگا لیکن جلدی سے اب بے سود تھا کیوں کہ تیز قدم ماسک پہلے ہی آزاد ہو چکا تھا۔ وہ (ماسک) تیز چلنے پر شاید اس لیے مجبور تھا کہ چاند کے نمودار ہونے کا ڈر اس کے سر پر موجود تھا لیکن رات کی خاموشی ہوا میں اس کی صاف اور دوٹوک آواز تھوڑے کے ساتھ تھی۔ یہ بھی کافی دوری پر تھا لیکن جوئیس جانتا تھا کہ فاصلے اس کے سامنے ہتھیار ڈالتے تھے، اس لیے اس نے سیدھا سڑک کے کنارے پر موجود ناریلوں کے فارم کا رخ کیا اور اس نے خود کو پیٹ کے بل گرا دیا۔ اس طرح اسے چورے پتوں کی آڑ مل گئی۔ اس نے بمشکل ہی ایسا کیا تھا کہ عین اسی وقت اس نے روح کے ساتھیوں کی گھڑگھڑاہٹ کو سنا اور ساتھ ہی اس نے اس کی پرشور جیسی مجرمانہ مسائل پر مبنی تقریر کو بھی سنا۔ وہ کانپ کر رو گیا۔ آوازیں اس پر بوجھ ڈالتے ہوئے اس کے چہرے کو تقریباً ڈھکتے ہوئے سطح زمین کے ساتھ ٹکرا رہی تھیں اور اب وہ قدموں کی آواز سن سکتا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے بیس شیطان صفت روح اکٹھے بھاگ رہے تھے۔ وہ خوف سے پسینے میں نہا گیا اور تقریباً اٹھ کر بھاگنے ہی والا تھا۔ خوش قسمتی سے اس نے خود پر قابو پا لیا اور پلک جھپکتے میں زمین اور ہوا میں موجود یہ سارا فتنہ یعنی گھڑگھڑاہٹ اور موسلا دھار بارش، رعد اور برق غائب ہو گئی اور سڑک کی دوسری طرف ایک فاصلے پر غائب ہو گئی۔

اگلی صبح، چیف ٹرک کے ذریعے زمین کے ایک حصے نے گزری شب کے سرکش نوجوان کے ذریعے برپا کیے جانے والے تباہ کن اشتعال دلانے والے مظاہرے کو بیان کیا۔ نوجوان

نے شور سن کر تیز قدم ماتے ہوا یہ مظاہرہ اپنے بیٹوں کی حفاظت میں کیا تھا جن کا کہنا تھا کہ یوں کتے پا
سے پاہو جائے گا اور تبدیلی ..... حقیقت یہ تھی کہ ان نافرمان نوجوانوں کو ابھی تک خود کتے پالنے کی طاقت
کا اندازہ نہیں تھا۔ انھوں نے اس کے متعلق صرف سن رکھا تھا لیکن وہ جلد ہی اس کے متعلق جان
لیں گے۔

اس وقت جب جوئیس کھڑکی کے قریب خالی مارکیٹ کا جائزہ لے رہا تھا تو دوبارہ سے اس
رات والے خوف نے اسے جکڑ لیا تھا۔ حالانکہ اس کو صرف ایک بات پیشتر ہی ہوا تھا، لیکن پہلے ہی سے
یہ ایک ادھوری رہ گئی لگ رہی تھی جو کہ ایک وسیع خالی پن کے ذریعے موجودہ زندگی سے جدا کر دی گئی تھی۔
یہ خالی پن ہر گزرتے دن کے ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ اس طرف جوئیس کھڑا تھا اور دوسری طرف ماں اور
بیٹ کھڑی تھیں، جنھیں اس دہشت زدہ کرنے والے آرٹسٹ نے سنوارا تھا۔

☆☆☆☆

پھول اور انسان

اس لیے بھی اور جب کبھی بھی میں گملوں میں لگے پھولوں کو دیکھتا ہوں یا جب پھولوں کے آرٹ سے لطف اندوز ہونے کی بات ہوتی ہے تو مجھے اس بوڑھے شریف آدمی سکالر گوین کا خیال ضرور آتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے میں اس وقت صحیح معنوں میں آشنا ہوا تھا، جب میں نے ذہنی پختگی حاصل کر لی تھی اور میں چیزوں کو زیادہ گہرائی میں دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا اور اب اس وقت میں پھولوں کے ساتھ وابستگی کے معاملے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔

البتہ آج کل مجھے اس بوڑھے سکالر جیسا اہم آدمی نظر نہیں آتا، جو ہمارے گھر میں میرے والد کا اکثر مہمان بنتا تھا۔ وہ کبھی کبھار ہی ہمارے گھر میں آتا تھا۔

مگر ایک چیز مجھے بہت متاثر کرتی تھی کہ میرے گھر والے اس بوڑھے سکالر کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے تھے۔ حالاں کہ اس کی دعوت عموماً بہت سادہ سی ہوتی تھی اور دوسرے آنے والے اعلیٰ درجے کے مہمانوں سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ لیکن اس سادگی میں بھی ایک خاص استحصال پنہاں ہوتا تھا، جس کے ذریعے بڑے اور منفرد لوگوں کے لیے ایک گہری عقیدت کا اظہار ہوتا تھا۔

جب بھی یہ بوڑھا سکالر ہمارے گھر آتا، میرے والد خود اس کے لیے چائے بناتے، اس کے لیے خوشبو دار شطرنج کے مہرے سجاتے اور اس کے لیے دوسری ضروری چیزوں اور ضروریات کا خیال رکھتے۔ اس کے علاوہ اپنے موقع کے لیے میرے والد خاص خوشبو والی چائے کی پتی بچا کر رکھتے تھے۔ جب وہ دونوں بزرگ اکٹھے بیٹھ کر شطرنج کھیلتے تو انتہائی سنجیدگی سے شغل کرتے، ایک دوسرے کو شاعری سناتے اور اگر بتی یا چیلی صندل کی خوشبو میں گھرے وہ حالات حاضرہ پر بحث کیا کرتے تھے۔ شطرنج کی بازیاں بعض اوقات بہت طویل پکڑ جاتیں اور سارا سارا دن تک چلتیں۔ پھر بھی دونوں حریفوں کے درمیان کوئی بھی فتح مند نہیں ہوتا تھا۔ بازی برابر ہی رہتی تھی۔

میرے والد دو تین ماہ بعد ہی اپنے دوست کے گھر جاتے تھے۔ جب بھی میرے والد کے

پاس کبھی چائے کی پتی موجود ہوتی یا کوئی اور اعلیٰ چائے کی قسم ہوتی تو وہ مجھے اور میرے بھائی کو یہ چیزیں اپنے دوست کو دینے کے لیے اس کے گھر بھیجتے تھے۔ ایسی چیزیں میرے والد نے نوکر کے ہاتھ کبھی نہیں بھیجیں۔

اس طرح مجھے کئی بار اس بوڑھے سنالر کے گھر جانے کا موقع ملا۔ انہی مواقع کی نسبت سے میں نے یہ نتیجہ عبرت کے طلبگار اس بوڑھے شخص کی ذاتی نیک زندگی میں غور و فکر کرنا سیکھا تھا۔

اس کا گھر غریبوں کی بستی میں ایک چھوٹے سے باغ کے درمیان بنایا گیا تھا اور یہ گھاس پھوس کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ اس باغ کے ساتھ ساتھ اس گھر نے میری روح میں بڑی خوب صورت اور شاعرانہ یادیں اتار دی تھیں۔

بوڑھے سنالر کا باغ مجھے ایک پھول باغ لگتا تھا۔ جب میں دروازے سے اندر داخل ہوتا تو میں محسوس کرتا تھا جیسے میں کسی درختوں سے بھرے جنگل پر آئے ہوئے جنگل میں تنہا کھڑا ہوں۔ سارا باغ سورج کی روشنی میں جھلمل کرتی پھولوں کی رنگا رنگ پتیوں سے مہک رہا ہوتا تھا۔ یہ باہر کی پُرشور دنیا سے بہت مختلف ایک پُرسکون جگہ تھی۔

میں بوڑھے سنالر سے اس کے گھر سے زیادہ اس کے باغ میں اس سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ اس بوڑھے شخص کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ اس کا قد بہت خوب صورت تھا اور چاندی کے فریم والے اس کے چشمے کے پیچھے اس کی مہربان آنکھیں ہوتی تھیں۔ وہ تقریباً ہر موسم میں اپنے دبلے پتلے جسم کو بھورے رنگ کے کپڑوں میں چھپائے رکھتا تھا۔ وہ باغ کے درمیان کھڑا اپنی پوتی کے ساتھ مجھے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملتا تھا۔ میں اس بوڑھے شخص کی مسحور کن شخصیت کو شاید کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔

میرے لیے اب بھی اس کی شخصیت کا پرتو ایک پاکیزہ، نیک اور مشاہدہ محسوس کرنے والی زندگی کی علامت تھا۔ میرے ذہن میں یہ تاثر اس وقت ابھرتا تھا، جب انسانی خواہشات کی بے لگام ہرین یکسر مقصد زندگی کے یقین کو میرے اندر سے نکالے جانے پر تل جاتی تھیں۔

وہ بوڑھا سنالر اس پرامن جگہ پر اپنے نوکر اور پوتی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی اصل میں تو وہ اپنے پھولوں کے ہمراہ رہتا تھا۔ اسے پھولوں کو اگانے، ان کی دیکھ بھال کرنے اور ان کی نشوونما کے سلسلے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر غور کرنے میں بے پناہ خوشی حاصل ہوتی تھی اور اس طرح وہ دوسری

مصروفیتوں میں الجھنے سے بچا رہتا تھا۔

پہلے پہل میں نے اس مسرت بھری دنیا کو ایک عام آدمی کی نظر سے دیکھا تھا کیوں کہ پھولوں کو بڑے بڑے گملوں میں اگانا اس مقدس شہر کی روایت تھی۔ اس وقت صرف سولہ سال کی عمر میں میں نے اس خوشی اور مسرت کو محض ایک طرح کی پیچیدگی اور بوریت کے حوالے سے دیکھا تھا۔ مزید یہ کہ اس شریف بوڑھے آدمی کا روحانی انداز میرے لیے کوئی غیر معمولی چیز نہ تھا اور اس طرح آغاز میں میں اس کے گھر جانا ہی چاہتا تھا اور مجھے اس میں کوئی خاص خوشی حاصل نہیں ہوتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ میں نے اس شخص کو ایک نوجوان روح کا مالک پایا۔ وہ بہت سادہ اور خوش دل رکھتا تھا۔ جوں جوں میں اس کے گھر جاتا رہا میرے دل میں اس کے لیے محبت اور عزت بڑھتی ہی رہی اور یوں میرے اندر چھپے پرانے خدشات ہوا ہو گئے۔ بوڑھا سنار مجھے اپنی چوتھی ماں کی طرح اپنے گھر کا ایک فرد سمجھتا تھا۔

اس کا پھول باغ مجھے دوسری چیزوں سے زیادہ اپنی طرف کھینچتا تھا۔ باغ میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے پھولوں کو پانی دینے میں اس کی مدد کرتے ہوئے پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتے ہوئے اور ادھر ادھر کے کئی دوسرے کام کرتے ہوئے مجھے ایک سچی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ ایسے کام سرانجام دیتے ہوئے بوڑھا سنار مجھے دوسری ماں کو بہت سمجھدار لوگ سمجھتے ہوئے گپ شپ کرتا تھا۔ وہ پھولوں اور ان کی مختلف قسموں اور ان کے مخصوص امتیازی اوصاف کے متعلق باتیں کرتا تھا اور ان کے متعلق بڑے خوش کن ریمارکس دیتا تھا۔ ان پھولوں کی چھاؤں میں کی جانے والی ان باتوں کے ذریعے جن کو میں اس وقت پوری طرح سمجھ نہیں پاتا تھا میں نے یہ جانا تھا کہ بوڑھے کو پھول اگانے میں جو خوشی حاصل ہوتی تھی اس کی نوعیت بہت غیر معمولی اور اعلیٰ درجے کی تھی۔ یہ خود غرضانہ خوشی بالکل نہ تھی۔ اس کے باغ کے نہایت قیمتی پھولوں کے چند گملوں میں قسمت سے واسطہ ایک حادثے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ ان لمحوں میں بوڑھے سنار کا دھیان اس کے لیے ایک مذہب کا درجہ رکھتا تھا۔ پھولوں کے مذہب کا

مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں گل داؤدی کے پودے ایک دوسری جگہ منتقل کر رہا تھا تو بوڑھے سنار نے مجھے بتایا تھا

"ہاں مجھے اب ان کی جگہ بدل دینی چاہیے نہیں تو ان کی زندگی پرانی غاروں والی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔"

"جناب۔۔۔۔غاروں والی زندگی میں تبدیل ہونے سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

پھولوں کی دیکھ بھال کرنے کے فن سے آشنا شخص سے کیے گئے میرے نہایت معصومانہ سوال نے خوب صورت بوئی لان کو کھی کھی کر کے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

بوڑھے شخص نے جواب دیا۔

"پودوں کے لیے غاروں والی زندگی میں واپسی کا مطلب، اس کے پتوں کا بالکل غائب ہو جانا ہوتا ہے۔ اگر کوئی پودا پتوں سے لدا پھندا بھی ہو، اور وہ غاروں والی زندگی میں واپس چلا جائے تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ گل داؤدی کی کہانی میں یہی ایک سبق ہے۔ راستہ ہے۔ یہاں اسے محض دوسرے گملے میں لگا دینا یا اس کی مٹی تبدیل کر دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس کا سب سے زیادہ انحصار مٹی کی خصوصیت اور اسے کھاد دینے کے طور طریقے پر ہوتا ہے۔

بوئی لان جو کہ جھکی ہوئی گملے میں مٹی ڈال رہی تھی، بڑی آہستگی سے بوڑھے سے مخاطب ہوئی

"اصل چیز یہ ہے کہ یہاں بے شمار پھول ہیں اور اگر کوئی پودا اس غاروں والی حالت میں پہنچ جائے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔۔۔۔ دادا۔ آپ وان کی پوتی ہی فکر کی رہتی ہے۔ اسی لیے پھولوں کا کوئی گملا آپ کے لیے بیچنا بہت ہی مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔"

بوڑھے سالر نے مسکراتے ہوئے اپنی پوتی سے کہا۔

"ہاں۔ اس کے علاوہ بھی وجہ ہے کہ میں کبھی پھول خریدتا نہیں کیوں کہ میں ان پھولوں کو کبھی بیچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خوشی اور مسرت حاصل کرنے کے لیے جو پھول اگائے جاتے ہیں وہ انمول ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جو پھول خریدتے ہیں، ان میں ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کیوں کہ خوشی ان کے رنگوں اور خوشبوؤں سے حاصل نہیں ہوتی بل کہ ان کو پروان چڑھانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے میں ہوتی ہے۔ ایک نوخیز کونپل جو پھوٹ رہی ہے، ایک پتا جو نمودار ہوتا ہے، یہ چیزیں آنکھوں کے طمینان کے لیے کافی ہوتی ہیں اور یہ پھولوں کو محض دیکھتے رہنے سے زیادہ بہتر خوشی حاصل کرنے کی چیزیں ہیں۔ یہ ہماری دولت کی محتاج نہیں ہوتیں، انھیں صرف ہماری نگہداشت درکار ہوتی ہے۔

وہ لوگ جو دل و جان سے پھولوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، وہی ان کی خوب صورتی سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور ظاہری خوب صورتی سے زیادہ ان کی اندرونی خوب صورتی زیادہ قابل قدر

ہوتی ہے کیوں کہ پھولوں کی روح ہوتی ہے اور کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا لیکن جو لوگ ان کے لیے محض پیسے خرچ کرتے ہیں وہ ان چیزوں کو محسوس نہیں کر سکتے۔

اور جو توجہ بوڑھا سالران کو دے سکتا تھا ایسا شاید اور نہیں کر سکتا تھا۔ پھولوں میں اسے آرکڈ بہت پسند تھے اور آرکڈ کی قسم میں سے "پیدائش دن" کی قسم زیادہ بھاتی تھی۔ بوڑھی نے مجھے اس کی اس پسند کے بارے میں بتایا تھا اور اس بوڑھے سیلر کے پسندیدہ آرکڈ پھولوں کے بارے میں مجھے بہت قیمتی معلومات بہم پہنچائی تھیں۔

"میرے دو تھورے واقعی قسم کے انسان ہیں۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ اپنے آرکڈ کو پسند کرتے ہیں۔ وہ مجھے چھوٹے بچوں سے بھی زیادہ توجہ کے ساتھ ان کے بارے کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو پانی دینے کے لیے وہی پانی استعمال کیا جائے جو میں اپنا منہ دھونے کے لیے استعمال کرتی ہوں۔ ہر روز صبح کے وقت مجھے ان کا ایک ایک پتا دھونا ہوتا ہے تاکہ آرکڈ اپنی پوری خوب صورتی اور جوش کے ساتھ دکھائی دیں۔"

میں یہ سن کر ہنس پڑا۔ "جس پانی سے تم اپنا منہ دھوتی ہو بھلا وہی پانی ان کے لیے کیوں ضروری ہوتا ہے؟"

"وہ کہتے ہیں۔۔۔۔ آرکڈ عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ عموماً یہ کہتے ہیں کہ آرکڈ ایک خوب صورت مخلوق ہے۔ خاموش اور خوب صورت۔ تم بتاؤ۔ خوب صورت مخلوق سے ان کی کیا مراد ہے؟"

میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا "خوب صورت مخلوق۔ ایک خوب صورت عورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر تمھارے جیسی کچی نوجوان لڑکی اور خاموشی سے ان کی مراد شاید یہ ہے کہ وہ بولتی نہیں ہوتے۔۔۔۔ میرا خیال ہے اس طرح وہ تجویز پیش کر رہے تھے کہ۔۔۔۔"

بوڑھی ماں قہقہہ لگاتے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگی

مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ الفاظ بغیر کسی خاص مقصد کے محض نوجوانی کی بھونڈی میں کہہ دیے تھے

اور اسی لمحے مجھے خیال آیا تھا کہ بوڑھی ماں تو واقعی باغ میں کھلے پھولوں کی طرح پیاری اور خوب صورت تھی۔ جب مجھے اس کی رفاقت میسر ہوتی تھی تو مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے میں اپنے سب سے

بہترین دوستوں میں ہوں۔ لیکن یہ باتیں مجھے اس وقت سمجھ میں آئیں جب میں ذہنی طور پر پختہ ہو گیا تھا اور گزرے دنوں کی تلخیوں اور خوشیوں کی یادوں کے پیچھے موجود احساسات کو جانے اور ان کا تجزیہ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اور اس وقت سے میں نے آرکڈ کے پھولوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ میں نے ان کے متعلق زیادہ معلومات اکٹھی کرنی شروع کر دیں، جب مجھے معلوم ہوا کہ بوئی لان خود ان کی دیکھ بھال کرتی ہے اور خاص طور پر اس وقت سے میری دلچسپی بڑھ گئی، جب مجھے معلوم ہوا کہ اس کو اس پانی سے دھویا جاتا تھا، جو خود بوئی لان اپنا منہ دھونے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ پھر مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہوا، جب مجھے بوئی لان نے اس واقعے کے متعلق بتایا جو بوڑھے سٹار کو پھول خریدنے والے ایک شخص کے ساتھ پیش آیا تھا۔

"اس نے 'بے داغ دل والے' آرکڈ پھولوں کے دو گملوں کے لیے پیاسٹروں (دیہاتی روپے) کی گئی گنڈیاں پیش کی تھیں۔ لیکن میرے دادا نے انہیں بیچنے پر رضامند نہ ہوتے ہوئے معذرت پیش کی اور یوں اس پھولوں کے اس خریدار سے چھٹکارا حاصل کیا۔"

آرکڈ کے پھولوں کے صرف دو گملوں کے لیے پیاسٹروں کی کئی گنڈیاں۔۔۔۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ان لمحوں میں محض ایک پیاسٹر کے عوض بوئی شخص ڈھیروں پھول خرید سکتا تھا، اور یہاں وہ صرف آرکڈ کے دو گملوں کے لیے کئی بنڈل پیاسٹروں کے دے رہا تھا۔ اصل میں وہ خریدار صحیح معنوں میں پھولوں کا عاشق ہی ہو سکتا تھا۔ میری نیند کو بھاگتے ہوئے قریب ہی موجود باغ کے پودوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے ملازم نے اپنے ہاتھ کو بیچ میں روکتے ہوئے اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"پیاسٹروں کی ایک گڈی۔۔۔۔ ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔۔۔۔ اگر اسے آرکڈ مل جانے کی امید ہوتی تو شاید وہ اس سے زیادہ کی پیش کش کرتا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ آرکڈ خریدنا چاہتا تھا، دراصل اسے یہ شخص جاننے کا شوق تھا، جو اس باغ کے تمام آرکڈ پھولوں کا مالک ہونا چاہتا تھا اور اپنے سمجھنے والے کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس کا بیٹا شاید اس علاقے کا سب سے زیادہ خود پسند شخص تھا۔ لیکن اس بوڑھے سٹار کو ان پھولوں کو خریدنے کی پیش کش کرنا اس کی حماقت تھی۔ اگر اس نے ان پھولوں کو ویسے ہی مانگ لیا ہوتا تو شاید وہاں میں سے کچھ لینے میں کامیاب ہو جاتا اور اس طرح سے کوئی معاوضہ بھی نہ دینا پڑتا۔ بوڑھے سٹار کے ساتھ روپے پیسے کی اہمیت کی بات کرنا بہت بڑی بے وقوفی تھی۔ اس طرح تو

اس نے اس سے انکار ہی سنا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جس وقت اس نے یہ بات کی تو بوڑھا سالار پیے ہوئے نہیں تھا، ورنہ چھری سے اسے قتل کر دیتا کہ اس سے اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔"

اس واقعے کو سننے کے بعد بوڑھے سالار کی عزت میرے دل میں اور زیادہ بڑھ گئی۔ اب میں نے سمجھ لیا کہ میرے دادا اس شخص کو اتنی اہمیت کیوں دیتے تھے اور اس کے لیے وہ اچھی سے اچھی دعوت کیوں کھلاتے تھے۔ اور یہ دعوت کسی چینی عامل جیسے اجنبی شخص کی بھی ہو سکتی تھی۔ بوڑھا سالار کسی چینی عاملوں سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے دادا کسی اور شخص کے ساتھ وقت گزارنے سے زیادہ بوڑھے سالار کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس بات کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا۔

بوڑھے سالار کے لیے جوں جوں میرے دل میں عزت بڑھتی جا رہی تھی، آرکڈ کے گملوں میں بھی میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ بوڑھی نانی اور میں ہم دونوں آرکڈ کے پودوں کو پانی دیتے، ان کے پتوں کو دھوتے اور انھیں گملوں میں جمانے میں زیادہ انہماک سے لگے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں آرکڈ کے پودوں کے نیلے پتوں کی چمک سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ان میں کی نازک اور معصوم پھولوں کے درمیان ایک چہرہ جس کے گرد سیاہ بالوں کا ایک ہالہ ہوتا تھا، مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ صبح کے سورج کی روشنی میں اس پتوں پر چمکنے والی شبنم کے قطروں کی طرح اس چہرے پر موجود فاختہ جیسی دو خوب صورت آنکھیں جھلملاتی تھیں۔ میرے ذہن میں اب بھی وہ ایسے نازک پتے سے ہوئے محفوظ ہیں، جو کسی چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش میں بھیچے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور آرکڈ کے پتوں میں چھپا ان ہونٹوں نے ایک صبح مجھ سے کہا تھا۔

"وہ" یہ اغ والے اس آرکڈ کے پھولوں کے گملوں کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ یہ عین نئے تہوار کے موقع پر کھلنے والے ہیں۔ اس موقع کے لیے تب وہ ساری رات ان پھولوں سے کشید کی ہوئی مٹھاس بھری خوشبو میں بسی رائس برانڈی تیار کریں گے۔ اور تب دادا اس میں سے کچھ ہمیں بھی ان پھولوں کی دیکھ بھال کے عوض عطا کریں گے۔ ایک مہینہ اور گزر جائے وہ پھر تم دیکھنا کہ یہ آرکڈ کی قسم "سفید موتی" سے زیادہ خوب صورت انداز میں کھلا ہوں گے۔"

اس وقت یہ فاختہ جیسی آنکھیں آرکڈ کے پتوں کو اتنی محبت سے دیکھ رہی تھیں جیسے کہ باغ کے پچھلے حصے میں پودوں کی گھنی چھاؤں کے نیچے خوشبودار چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بوڑھے سالار کی آنکھیں دیکھتی تھیں اور نئے شگوفوں کے پھوٹنے کی مسرت محسوس کرتی تھیں۔

ایک سہ پہر کو میں بوڑھے سکالر کے گھر گیا۔ میں آرکڈ کے پھولوں کے ان گملوں کو دیکھنے آیا تھا، جن کی دیکھ بھال میں اور بوئی لان کافی دنوں سے کر رہے تھے۔ کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ اگر کوئی معمولی سی تبدیلی تھی بھی تو وہ نگاہوں سے پوشیدہ رہی۔ اگر کبھی میں ایک دن رکتا تو اگلے دن بوئی لان مجھے ان پودوں میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں اور باریکیوں کو تفصیل سے بتاتی تھی۔ قریب ہی موجود بوڑھا سکالر اس کی باتیں سن کر خاموشی سے مسکرائے جاتا تھا، جیسے ایک دادا اپنی پوتی کے شوخ کارناموں کی داد دے رہا ہو۔ اب چونکہ میں دو دن کی غیر حاضری کے بعد آیا تھا تو مجھے توقع تھی کہ بوئی لان مجھے یقیناً کیپوں کے پھوٹنے، ایک بچے کے برآمد ہونے یا مرجھانے کے متعلق یا پھولوں پر منڈلانے والی تتلیوں کی حرکات و سکنات اور اس کے علاوہ بہت سی دوسری بہت سی چھوٹی چھوٹی حقیقی مگر شاعرانہ قسم کی جزیات سے خبردار کرے گی۔ میں جب گیٹ سے اندر داخل ہوا تو میرا دل بہت کے تہوار کے روز ایک آ جانے اور جو تفصیلات مجھے بوئی لان سے ملنے والی تھیں ان کی وجہ سے سینے میں تیزی سے اچھل رہا تھا۔

لیکن جوں ہی میں کورٹ یارڈ میں داخل ہوا دنگ رہ گیا۔۔۔۔ میں رک کر دیکھنے لگا۔۔۔۔ بوئی لان داخلی دروازے کے قریب ایک ستون کے ساتھ لگی حالت میں گھورے جا رہی تھی۔ میں نے کبھی اس کا اتنا روتا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے دوپہر کے سورج میں جھلسے ہوئی بانی سماس پھول کی طرح لگ رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے سانس لی۔

"بوئی لان کیا بات ہے۔۔۔۔ کیا ہوا ہے؟"

بوئی لان سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور سیب کے ایک پودے کے ساتھ لگ کر بہت غم زدہ لہجے میں اس نے کہا۔

"دادا نے بیچ دیا ہے۔۔۔۔"

"بیچ دیا ہے۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔"

وہ تیزی سے پلکیں جھپکا رہی تھی ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی رو پڑے گی۔

میں نے دوبارہ اس سے پوچھا۔

"بھئی بتاؤ بھی کہ دادا نے کیا بیچ دیا ہے؟"

"آرکڈ کے دونوں گملے"

حیران ہوتے ہوئے میں نے کہا "یہ ناممکن ہے۔ کیا تم پاگل ہو گئی ہو یا دادا نے تمھارے ساتھ کوئی مذاق کیا ہے۔ وہ ان پھولوں کو کبھی نہیں بیچ سکتے۔ اگر انھیں ان کو بیچنا ہی ہوتا تو اسی دن وہ انھیں بیچ دیتے۔ لیکن اب انھوں نے ان کو کیوں بیچ دیا؟"

بوبی ان نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ـــــ دادا نے انھیں اس آدمی کے ہاتھ بیچ دیا، جو چند دن پیشتر انھیں خریدنے کے لیے آیا تھا۔ اگر تمھیں میری بات پر یقین نہیں آیا تو تم خود جا کر خود دیکھ لو۔"

میں تیزی سے اس طرف گیا۔ گو کہ بوبی ان نے یہ بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہی تھی لیکن پھر بھی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کیوں کہ میں بوڑھے سالار کی ان پھولوں کے ساتھ بے پناہ محبت کو جانتا تھا۔ اس جیسا شخص تو خود دو روپے پیسے کی بہت زیادہ کمی کا شکار ہو جاتا تب بھی وہ ان پھولوں کو بیچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس جیسا شخص دنیا کی خوبصورتیوں سے مرعوب نہیں ہو سکتا تھا اور وہ رنگ کی داخلی قدر و قیمت اور فخر کو یوں نہیں کھو سکتا تھا۔

بوڑھے سالار کے لیے پھول بیچنا بہت شرمناک بات تھی کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے ایک شخص تھا، جس کے لیے پھول اگانا ایک مذہب کا درجہ رکھتا تھا۔ اور اس کے باغ میں، جو پھول تھے وہ بہت ہی خوب صورت تھے۔ اس نے اور اس کی بیوی نے نیٹ کے لیے اپنے پھولوں کی بہت زبردست تیاری کی ہوئی تھی۔ وہ اس کام کو اپنی روح کی گہرائیوں کے ساتھ کرتا تھا اور وہ پھولوں سے ایسی محبت کرتا تھا جیسی کوئی ماں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے ضمن میں کرتی ہے۔

حالاں کہ وہ کوئی امیر شخص نہیں تھا، بس غریبوں جیسا ہی تھا لیکن اس نے اپنی گھر داری کے حوالے سے اور دوسرے خرچ کے سلسلے میں ایسا متوازن رویہ اپنا رکھا تھا کہ سوائے کسی شدید اور اہم ضرورت کے، شاید ہی اسے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آتی تھی اور پچھلے کچھ عرصے سے تو وقتی، اس کو کسی بھی پریشانی نے نہیں گھیرا تھا۔ میرا خیال تھا بوبی ان کو کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی یا پھر یہ کہ اس کا دادا اس سے کسی قسم کا کوئی مذاق کر رہا تھا۔

لیکن گھر کے پچھواڑے پہنچنے پر میری پریشانی اس وقت بڑھ گئی، جب میں نے اسے ایک اجنبی کے ساتھ گفتگو پایا۔ وہ اجنبی شخص پچاس سال کا ایک قصوں سے بھرے چہرے والا شخص تھا، جس کا منہ اور

رے کسی سورما جیسا تھا۔ اس نے ایک ریشمی کاؤن پہن رکھا تھا جو اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ یہ لباس اس کے جسم پر اتنا تنگ تھا کہ لگتا تھا ابھی اس کے بخیے ادھڑ جائیں گے۔ اس کی توند بڑھی ہوئی تھی اس کا چہرہ بھی خاصا چوڑا تھا اور آنکھوں کے نیچے تھیلے بھی خاصے بھاری تھے۔

"جناب اگر آپ نے انھیں پچھلی دفعہ میرے ساتھ بیچ دیا ہوتا تو بڑی اچھی بات ہوتی۔ آپ کو اچھے دام مل جاتے اور مجھے پھول۔ یعنی سودا پکا ہو جاتا۔ لیکن جناب ۔۔۔۔ اب تو سچی بات یہ ہے کہ میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں کہ اب میں آپ کو اس دن والی قیمت تو نہیں دے سکتا۔"

بوڑھا سوداگر بولا

"اچھا تو اب تم مجھے ان کی کیا قیمت ادا کر سکتے ہو؟"

"ہاں جناب ۔۔۔۔ ٹھیک ہے ۔۔۔۔ دیکھیں ناں اب تو خود آپ نے مجھے بلایا ہے اور اصل میں مجھے ان پھولوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ پچھلی دفعہ آپ نے انھیں بیچنے سے انکار کر دیا تھا ۔۔۔۔ اور مجھے کہیں اور سے خریدنے پڑے تھے ۔۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔۔"

اس نے اپنے سانس کو بحال کیا اور کہنے لگا۔

"تو اب جناب ۔۔۔۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ انھیں سستے میں بیچیں گے تو میں مجبوراً انھیں خرید لوں گا ۔۔۔۔ اور اگر آپ اسی پرانی قیمت پر اڑے رہیں گے تو پھر تو میں معذرت چاہوں گا۔"

یہ سب کچھ کہنے کے بعد اجنبی ہنسنے لگا اور یوں اس کے بے ترتیب دانت، جن پر سونے کے خول چڑھے تھے نظر آنے لگے۔ اس کے دیکھنے کا انداز اور جس طرح وہ گفتگو کر رہا تھا قابل نفرت تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب وہ "جی جناب" یا "جناب عالی" کے الفاظ ادا کرتا تھا تو وہ محض ڈرامہ کرتا تھا کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھا، جو اپنی مقصد براری کے لیے ہمیشہ چور دروازہ استعمال کرتے ہیں اور حقیقتاً اس کے دل میں ایک اس بوڑھے سوداگر کی کوئی عزت نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر میں نے اطمینان کی ایک لہر دیکھی، حالاں کہ میں نوجوان تھا اور زندگی کا مجھے کوئی خاص تجربہ نہ تھا لیکن پھر بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ جیسے وہ بوڑھے سوداگر کو ایسی تجاویز بھی پیش کر رہا تھا کہ جن کی بنا پر کل کلاں کو وہ اپنا مکان تک اس کے ہاتھ بیچنے کو تیار ہو جاتا۔ مجھے ڈر تھا کہ بوڑھا سوداگر اس کے ساتھ بہت بری طرح سے پیش آئے گا لیکن بوڑھے کو غصہ تک نہ آیا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پائے رکھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ

اپنی نچلی ہونٹ دانتوں تلے چبا رہا تھا۔ آہستہ سے بولا

"ٹھیک ہے تم قیمت لگاؤ۔۔۔ اگر میرے لیے ممکن ہوا تو میں انھیں تمھارے ہاتھ بیچ دوں گا۔"

اس آدمی نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور عجیب انداز سے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

دیکھئے جناب۔۔۔۔ جناب عالی بہتر یہ ہوگا کہ آپ خود ہی ان کی قیمت لگائیں۔ میرے لیے کچھ کہنا ذرا مشکل ہوگا۔"

بوڑھے سوداگر نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیریں اور آرکڈ کے پھولوں کے دونوں گملوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں پانچ پیاسٹر تک ان کی قیمت کم کر سکتا ہوں۔ اور یہ بہت زیادہ رعایت ہوگی۔ لیکن چونکہ میرے کام کی نوعیت بہت اہم ہے اور مجھے۔۔۔۔ ہاں البتہ۔۔۔۔"

خریدار ایک بار پھر دانت نکالتے ہوئے ہنس پڑا۔

"جی بالکل جناب۔۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔۔ آپ جیسے لوگ جو پھولوں سے اس قدر محبت کرتے ہیں وہ تو پھولوں کو بیچنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ دیکھیں جناب۔۔۔۔ میرے لیے تو یہ اچھی بات ہے کہ آپ کو کوئی شدید ضرورت آن پڑی ہے۔۔۔۔ اور جناب یہی تو وجہ ہے کہ آپ نے مجھے بلایا ہے۔۔۔۔ لیکن جناب۔۔۔۔ اصل میں بات یہ ہے کہ قیمت تو اب بھی بہت زیادہ ہے اور اگر میں آپ کے ساتھ سودا بازی کروں گا تو یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔۔۔۔ تو اس لیے جناب۔۔۔۔ بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے چار ہی دیں تو بہتر ہے۔"

بوڑھا سوداگر تیوری چڑھائے ششدر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ شرمندہ ہو گیا تھا اور زیادہ شدت سے چاہ رہا تھا کہ اب وہ اس شخص سے مزید کچھ نہیں کہے گا۔ لیکن جب اس شخص نے اس کے سامنے جھکتے ہوئے، جانے کی اجازت مانگی تو اس نے اپنی آواز کو واضح کرنے کے لیے خواہ مخواہ کھانستے ہوئے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں دس پیاسٹر تک قیمت کم کر دیتا ہوں۔"

وہ آدمی رک گیا اور اس نے جواب دیا "ٹھیک ہے جناب۔۔۔۔ اگر آپ رضامند ہیں تو میں ان کے تیس پیاسٹر دے دوں گا۔"

بوڑھے سکالر کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کی عینک کے شیشوں کے پیچھے میں نے اس کی آنکھوں میں بے توقیری کی جھلک دیکھی۔۔۔۔ ساتھ ہی میں نے اس کے بوڑھے دل میں تھوڑا سا لالچ اور رنج محسوس کیا۔ اس کے مخاطب کے نامہذب اور ناقابلِ برداشت رویے نے، اس کی عزتِ نفس کو بہت زیادہ ٹھیس پہنچائی تھی۔ جب اپنے قریب پڑی ماچس کو پکڑنے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ کانپ رہا تھا۔

ایک لمبی سانس لیتے ہوئے میں نے اسے کہتے سنا:

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ تم پھول لے جا سکتے ہو۔"

میرے نزدیک کھڑے ملازم نے بے صبری کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"کتنا علی قسم کا چور ہے یہ شخص۔۔۔۔ اسے ان پھولوں کی اب بھی شدید ضرورت ہے۔ پچھلی مرتبہ وہ ان کو حاصل کرنے کے لیے پاؤں تک کو ہاتھ لگانے کو تیار تھا۔ اب چوں کہ اس کا پلا بھاری تھا اس لیے وہ اکڑ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بوڑھا سکالر اسے اس سے کم قیمت پر پھول نہیں بیچے گا اس لیے اب اس نے قیمت اور کم کرنے پر اصرار نہیں کیا۔"

جب خریدار دونوں گملے لے کر چلا گیا تو بوڑھا سکالر ایک تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا ایک مجسمے کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس نے لکڑی کی ٹرے میں پڑے چند نوٹوں کی طرف دیکھا پھر اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا جسم دہرا ہوا جا رہا تھا۔

بوئی لان ایک طرف سے بوڑھے سکالر کی طرف دوڑی ہوئی آئی۔ اس نے، اس کی طرف دیکھا پھر نوٹوں کو دیکھا اور آخر میں ادھر نگاہ کی، جہاں آرکڈ کے پھولوں کے گملے ہوا کرتے تھے۔

"میت کا تہوار برباد ہو جائے گا۔۔۔۔ میت کے لیے اب آپ کے پاس کوئی آرکڈ نہیں ہوگا۔ لیکن کیوں۔۔۔۔ آپ نے انھیں کیوں بیچ دیا؟"

بوڑھے سکالر کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔ "آگ نے سارے گاؤں میں قیامت برپا کر دی ہے کیوں۔۔۔۔ کسی کا باپ نہیں رہا۔۔۔۔ اور کسی نے اپنا خاوند کھو دیا ہے۔"

مکان جل کر راکھ ہو گئے ہیں۔۔۔۔ اس صورتِ حال میں پھولوں سے لطف اندوز ہونے کی کسے فرصت ہوگی! ہمارے ہمسایوں پر جو یہ افتاد آن پڑی ہے۔۔۔۔ تو کوئی کس طرح پھولوں

میں ممکن رہ سکتا ہے؟''

جب اس نے مجھے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا تو یہ تم ہو مسٹر نجاک! ٹھیک ہے تم میرے ساتھ آؤ! بوئی لان۔ مجھے میری چھڑی دے دو۔۔۔۔ اور دیکھو رو ؤ مت!

بوڑھے سکالر نے نوٹوں کو ایک رومال میں باندھا اور چھڑی ہاتھ میں لیتے ہوئے گھر سے باہر نکل پڑا۔

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ یہ سردیوں کی ایک سہ پہر تھی۔ بارش تو نہیں ہو رہی تھی لیکن اس وقت بہت تند و تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے گاؤں کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ اس وقت میں سمجھا کیوں اس نے پھول بیچ دیے تھے۔ تین دن پہلے، آگ نے اس گاؤں کا کچھ حصہ تباہ کر دیا تھا۔ اس آگ میں دو آدمی جل مرے تھے اور چار یا پانچ خاندان اپنا گھر بار اور تمام اثاثہ کھو بیٹھے تھے۔

ادھر جاتے ہوئے مجھے بوڑھے سکالر نے بتایا۔

''بے چاری بوئی لان۔۔۔۔ اس کا رونا بجا ہے۔۔۔۔ لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔۔۔۔ پھول یقیناً خوشی دیتے ہیں، ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں، ان کی خوشبو روح کو سیراب کرتی ہے لیکن کسی کو اتنا خود غرض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ پھولوں کا مذہب رکھنے والے لوگ اپنے ہمسایوں سے بھی محبت کرنے پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھول کبھی خود غرض نہیں ہوئے۔ وہ مرجھانے سے پیشتر اپنا رنگ اور خوشبو اس دنیا کو دے جاتے ہیں۔ خالق نے زندگی کے اصل مفہوم کو ان پھولوں کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ بندوں سے محبت کیے بغیر پھولوں سے محبت کرنا بکواس ہے۔''

بوڑھا آدمی راستے میں پڑی کانٹوں بھری شاخ کو اٹھانے کے لیے جھکا۔ اس نے اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔

''آگ کا شکار ہونے والے ان بدنصیبوں کی وجہ سے، میں آج کل صحیح طرح سے سو نہیں سکا ہوں۔ ان پر ٹوٹنے والی قیامت نے مجھے دکھی کر دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو آج کل میرا ہاتھ تنگ تھا۔۔۔۔ اگر میں آرکڈ کے پھولوں کے یہ دو گملے نہ بیچتا تو پھر میں وقت پر رقم کا بندوبست کہاں سے کر سکتا تھا؟

پھولوں کو بیچنا ایک شرمناک بات ہے۔۔۔۔ اور وہ لوگ جو دوسروں کی ضرورت سے ناجائز

فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ اس سے بھی شرمناک بات ہے۔۔۔۔لیکن بعض اوقات ہمیں اپنی انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پھولوں کو بیچنا پڑ جاتا ہے۔ مصیبت میں مبتلا لوگوں سے پیسے بھی لینا بہت آسان کام ہے لیکن اس طرح ایک بیوہ اور ایک یتیم کا پیٹ تو خالی رہے گا۔ ان پھولوں کو بیچ دینے سے میرے دل کو بہت تکلیف پہنچی ہے، یوں لگتا ہے کہ میں نے اپنی کوئی بہت عزیز اور پیاری چیز کھو دی ہے۔ بوئی لان کا رونا بجا ہے۔۔۔۔لیکن جب ہمارے آل دوالے میں لوگ مصیبت میں گھرے ہوں تو ہم کس طرح پھولوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں؟''

دس سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ بوڑھا سکالر گوین دوسرے جہاں کو سدھار گیا۔ اور بوئی لان وہ بھی۔۔۔۔وہ اپنی بہار کے اٹھارویں سال میں تھی کہ اس کی زندگی کی خوشبو بھری ٹہنی ٹوٹ گئی۔ فوراً بعد ہی ان لوگوں کا ملازم بھی ان کے پیچھے چلا گیا۔

ایک لمبی غیر حاضری کے بعد میں نے جب ان پرانی جگہوں کو دوبارہ دیکھا تو ان پرانے دنوں کے ساتھیوں کا نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ وہ ایک دم سے غائب ہو گئے تھے اور یوں لگتا تھا کہ جیسے انھوں نے ایک ساتھ ہی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

گھاس پھونس کی بنی وہ پرانی کاٹیج اب ویسی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ باغ جو کہ اب ویرانے میں تبدیل ہو چکا تھا، پہچاننے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن ان تبدیلیوں کے بیچ ان چیزوں کے درمیان کھڑا ہوا میں، جو کہ اب ماضی کا حصہ بن چکی تھیں اور ہمیشہ کے لیے منظر سے ہٹ گئی تھیں، اپنے اندر کسی ایسی چیز کو ضرور محسوس کرتا ہوں جو ہمیشہ رہے گی اور جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اور یہی ہمیشہ موجود رہنے والی چیز جو میرے اندر دھڑکتی رہتی ہے، مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں دیکھتا رہوں۔۔۔۔ساری رات یہیں رکا رہوں اور ماضی کے باغ میں موجود آرکڈ کے پھولوں کے، ان دو گلوں کے بارے میں کہانی لکھتا رہوں۔۔۔۔!

☆☆☆☆

Selection From World Literature

Short Stories

Selected & translated by

Mehmood Ahmed Qazi

ISBN: 978-969-472-319-8

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269714
Website: www.pal.gov.pk email: ar.salesmgr@gmail.com